بہترین معاشرتی ناول

زندگی کے نشیب و فراز کا آئینہ، انسانوں کے ظاہر و باطن کی عکاسی

معاشرے کے جراح محی الدین نواب کے نشتر قلم سے ایک نوکیلی، کٹیلی آب دار کہانی

(حصہ دوم)

محی الدین نواب

یوں تو وہ کبھی تفریح کے لیے باہر نہیں نکلتی تھی لیکن کبھی کبھی ضرورت' باہر قدم نکالنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انسان اپنی ضرورتوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ یہی سوچ کر اس نے اپنی امی سے کہا۔ "اس برقعے کو بدل دیجیے۔ اب میں کالے رنگ کا برقع پہن کر جاؤں گی۔"

اس کی امی نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں بیٹا' بادامی برقعے میں وہ ہم دونوں کو ہی دیکھ چکا ہے۔ رنگ بدل لینا دانشمندی ہے مگر یہ تبدیلیاں آخر کب تک ہوتی رہیں گی۔ جانی کی وجہ سے ہم نے ناظم آباد والا مکان بدل دیا۔ اس کی وجہ سے تم فرزانہ واسطی کے بجائے ف واسطی بن گئیں۔ اس کے ڈر سے برقع بدل رہی ہو۔ تم خود کتنی بدلتی جا رہی ہو۔ پہلے شوخ اور چنچل تھیں۔ اب بوڑھوں جیسی سنجیدگی اختیار کر لی ہے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "سوچتی ہوں ملک بھی بدل جائے۔ یہ شہر' یہ ملک چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلی جاؤں۔"

پہلے تو اس کی امی نے اسے چونک کر دیکھا کچھ سوچا' پھر کہا۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہے جگہ بدلے گی تو تمہارا من مزاج بھی بدلے گا۔ سنا ہے باہر ڈاکٹروں کی اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے ابھی ابھی میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"کیوں نہ تم جمشید سے خط و کتابت کرو اسے لکھو کہ وہ لندن کے کسی اسپتال میں تمہارے لیے ملازمت کا بندوبست کرے۔"

"آپ کی تجویز مناسب ہے۔ ملک سے باہر ملازمت حاصل کرنے کے لیے کسی نہ

کسی کو ذریعہ بنانا پڑے گا لیکن جمشید کا پتا ہمارے پاس نہیں ہے۔"

اس لفافے پر جمشید کا پتا لکھا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے عقل نہیں آئی کہ وہ پتا نوٹ کر لیتی اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے میں رخسانہ کی امی سے مل کر کسی نہ کسی طرح اس کا پتا حاصل کر لوں گی۔"

فرزانہ نے کہا۔ "رخسانہ یا اس کی امی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شہلا سوسائٹی میں رہتی ہے۔ میں اس کے پاس جا کر جمشید کا پتا لے آؤں گی۔"

"اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی کسی وقت شہلا کے پاس چلی جاؤ میں تمہارے لیے بہت پریشان ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ملک چھوڑنے کے بعد تم اپنے متعلق سنجیدگی سے غور کرو گی۔ تمہارے دل سے جانی کا ڈر نکل جائے گا۔ میں کسی اچھے لڑکے سے تمہاری شادی کر دوں گی۔"

"امی شادی کی بات نہ کریں۔ میں ملک چھوڑ کر اس لیے جا رہی ہوں کہ جانی مجھے کبھی نہ پا سکے اور رخسانہ کے لیے جو میں نے قربانی دی ہے وہ ادھوری نہ رہے۔"

"ٹھیک ہے مگر شادی تو کرنی ہو گی۔ ساری زندگی یونہی تو نہیں گزارو گی۔"

"شادی خوشی کو کہتے ہیں۔ جب دل میں کوئی خوشی نہ ہو تو شادی کیسی؟"

"اگر کوئی خوشی دل میں پیدا ہو گئی تو؟"

"ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ اگر ہوا تو میں آپ کی آرزو پوری کر دوں گی۔"

○☆○
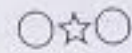
دوسرے دن رخسانہ کی امی ڈسپنسری میں داخل ہوئیں۔ کمپاؤنڈر نے انہیں دیکھ کر کہا۔ "بی بی جی، مریضوں کے دیکھنے کا ٹائم ختم ہو چکا ہے۔ آپ شام کو آئیں۔ ڈاکٹر صاحبہ آرام کر رہی ہیں۔"

انہوں نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "اے تمہاری آنکھیں نہیں ہیں۔ میں کوئی مریضہ لگتی ہوں؟ کیا خاک کمپاؤنڈری کرتے ہو؟"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے مکان کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئیں۔ وہاں فرزانہ اپنی امی کے ساتھ کھانے میں مصروف تھی۔ انہیں دیکھتے ہی دونوں ماں بیٹی اٹھ گئیں۔ رخسانہ کی امی نے کہا۔ "بیٹھو بہن، بیٹھو بیٹی، میں ادھر سے گزر رہی تھی سوچا خیریت

پوچھتی چلوں۔"

فرزانہ نے کہا۔ "خالہ جان ہم تو خیریت سے ہیں۔ آپ کی خیریت نظر نہیں آتی۔ اصل بات بتا دیجیے؟"

"اے بٹی! تم تو اپنے دماغ سے ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں سمجھ لیتی ہو۔ میرے دل میں تم لوگوں کے لیے کوئی محبت، کوئی جذبہ نہیں ہے کیا؟"

فرزانہ کی امی نے کہا۔ "بہن یقیناً آپ کے دل میں جذبہ ہے۔ آیئے کھانا کھایئے۔"

"میں ابھی کھا کر آ رہی ہوں۔ بس ایک گلاس پانی پیوں گی۔"

انہوں نے پانی سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر پینا شروع کیا۔ گلاس جیسے ایک ہی سانس میں خالی ہونے لگا۔ جب وہ گلاس کو میز پر رکھنے لگیں تو فرزانہ نے کہا۔ "ہاں تو شروع ہو جایئے۔"

انہوں نے ذرا ناراضگی سے اسے دیکھا پھر جلدی سے مسکرا کر بولیں۔ "بیٹی وہ جو جمشید کا خط آیا ہے۔ وہ تم کسی سہیلی کے پاس سے لے کر آئی ہو؟"

جمشید کی ایک کزن شہلا سوسائٹی میں رہتی ہے۔ وہیں سے وہ خط لائی تھی۔

"اچھا کیا، بیٹی، تم میری رخسانہ کے بہت کام آتی ہو۔ ہاں میں یہ پوچھ رہی تھی کہ کیا تم نے شہلا کو یہ بتا دیا ہے کہ رخسانہ کی شادی ہو گئی ہے۔"

فرزانہ نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "جہاں تک یاد پڑتا ہے، میں نے رخسانہ کا ذکر زیادہ نہیں کیا۔ شہلا یہاں اپنے میاں کے ساتھ آئی تھی۔ بڑی جلدی میں تھی۔ اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی جب میں وہاں گئی تو مہمانوں کا ہجوم تھا۔ وہ اتنی مصروف تھی کہ میں اس سے زیادہ باتیں نہ کر سکی۔ وہ خط لے کر آ گئی۔ بات کیا ہے؟"

"کوئی بات نہیں ہے۔ بس یونہی، میں سوچ رہی تھی کہ دوسروں کو رخسانہ کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بتانے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ آئندہ جمشید کا کوئی خط تمہارے ذریعے آئے یا شہلا سے ملاقات ہو تو اس سے رخسانہ کی شادی کا ذکر نہ کرنا۔"

فرزانہ اور اس کی امی نے حیرانی سے انہیں دیکھا پھر فرزانہ نے پوچھا۔ "تعجب ہے آپ رخسانہ کی شادی کی بات چھپانا چاہتی ہیں؟ بھلا کیوں کیا اس لیے کہ آپ کے داماد

ٹیکسی ڈرائیور ہیں یا طبقاتی لحاظ سے آپ انہیں کمتر سمجھتی ہیں۔"

"نہیں بھلا ہمارا داماد کسی سے کمتر کیوں ہو گا۔ تم تو وہ باتیں بھی سوچ لیتی ہو جو ہم کبھی نہیں سوچتے۔ سچ پوچھو تو میں اپنے گھر کی باتیں دوسروں کو بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔ اب کبھی شہلا سے یا کسی سے بھی ملاقات ہو تو تم رخسانہ کے متعلق انجان بن جایا کرو' ان سے یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ رخسانہ نے اپنا مکان بدل دیا ہے' پتا نہیں وہ کہاں رہتی ہے اس سے ملاقات نہیں ہوتی اور نہ ہی تم اس کے ذاتی معاملات کے متعلق کچھ جانتی ہو۔"

ماں بیٹی نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ رخسانہ کے متعلق اتنی ساری باتیں چھپانے خصوصاً اس کے سہاگن ہونے کی بات کو چھپانے کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آ رہا تھا فرزانہ نے کہا۔ "شہلا مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جمشید نے رخسانہ کی پلاسٹک سرجری کے لئے کہیں معاملات طے کئے ہیں وہ رخسانہ کو بلا رہا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟"

"ہاں بیٹی یہ جمشید کی مہربانی ہے۔ اس نے ڈاکٹر سے معاملات طے کیے ہیں لیکن وہاں جانے' آنے' علاج کرانے کے سارے اخراجات تو ہمیں ہی برداشت کرنے ہوں گے۔ میں نے ڈیڑھ لاکھ روپے کا بندوبست کر لیا ہے۔ بس پاسپورٹ بننے کی دیر ہے۔ میں رخسانہ کو بھیج دوں گی۔"

فرزانہ نے پوچھا۔ "رخسانہ جب لندن جائے گی اور جمشید سے علاج کے سلسلے میں ملاقات ہوتی رہے گی تو وہ یقیناً اپنے شوہر اور بچے کا ذکر کرے گی؟"

پہلے تو وہ ذرا ہچکچائیں۔ کوئی جواب سمجھ میں نہیں آیا پھر وہ بولیں۔ "نہیں وہ غیر ضروری باتیں وہاں نہیں کرے گی۔ بس یہاں سے جائے گی اپنے چہرے کی سرجری کرائے گی اور واپس آ جائے گی۔ جمشید کون سا اپنا ہے کہ اسے گھر کے حالات بتائے جائیں۔"

"کوئی اپنا ہو یا نہ ہو لیکن عورت کے لئے اس کا سہاگ' اس کا شوہر اور اس کا بچہ یہ سب اتنے اہم ہوتے ہیں کہ وہ اپنے پرائے سب کے سامنے ان کا ذکر کرتی ہے اور رخسانہ تو جانی کو بہت زیادہ چاہتی ہے۔ وہ اس کا ذکر ضرور کرے گی۔"

"بیٹی یہ باتیں ہم پر چھوڑ دو۔ میں تم ماں بیٹی سے اتنا چاہتی ہوں کہ تم کسی سے اس کی شادی اور اس کے بچے کا ذکر نہ کرو۔"

فرزانہ کی امی نے ایک گہری سانس لے کر بیٹی سے کہا۔ "تم کیوں اس بحث میں الجھ رہی ہو۔ بہن اطمینان رکھو کہ اس سلسلے میں ہماری زبان بند رہے گی۔"

وہ خوش ہو کر بولیں۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ' تم ماں بیٹی ہم سے بڑا تعاون کرتی ہو۔ بس اب میں چلوں۔"

"اے بہن ابھی آئی ہو اور بھاگی جا رہی ہو۔ ذرا بیٹھو۔ ایک کپ چائے تو پیتی جاؤ۔ مجھے بھی کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

وہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "چائے کی خواہش نہیں چلو تمہاری کوئی ضروری بات ہے تو سن لوں گی۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور تمہارے کام آؤں گی۔ بولو کیا بات ہے؟"

"بہن! تم تو سمجھتی ہو کہ جوان بیٹی کی فکر مجھے کھائے جاتی ہے اور یہ ہے کہ شادی سے انکار کرتی رہتی ہے۔ اب میں تھک ہار کر اسے ملک سے باہر لے جانا چاہتی ہوں۔"

رخسانہ کی امی یہ سنتے ہی خوشی سے کھل گئیں۔ ایک کانٹا ان کی بیٹی کی ازدواجی زندگی سے خود ہی دور ہونا چاہتا تھا۔ "یہ تو تمہارا بہت ہی دانشمندانہ فیصلہ ہے۔ فرزانہ باہر جائے گی۔ ماحول بدلے گا تو اس کے ارادے بھی بدل جائیں گے۔ یہ یقیناً شادی کے لئے راضی ہو جائے گی۔"

"خالہ جان' میں شادی کے لئے باہر نہیں جانا چاہتی۔ ملازمت کے لئے باہر جانا چاہتی ہوں۔ اگر آپ جمشید کا پتا دینا پسند کریں تو میں خط و کتابت کے ذریعے ملازمت کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

رخسانہ کی امی بجھ گئیں۔ وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ جہاں رخسانہ پلاسٹک سرجری کے لئے جا رہی ہے وہیں فرزانہ بھی جائے اور بھانڈا پھوٹ جائے۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹی! غیر لڑکوں سے خط و کتابت نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ وہ بھی یہاں سے ہزاروں میل دور رہ کر' میری رخسانہ جب وہاں جا رہی ہے تو وہ خود ہی تمہاری ملازمت کا بندوبست کر دے گی۔ وہ خود جمشید سے کہے گی۔ خط لکھنے کی

بات اور ہے اور جمشید کے پاس پہنچ کر کہنے والی بات کچھ اور ہو گی۔ زیادہ اثر ہو گا۔ آخر یہ دونوں بہنیں ہیں۔ دیکھنا فوراً ہی اس کی ملازمت کا بندوبست ہو جائے گا۔"

فرزانہ چائے تیار کرنے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی تھوڑی دیر بعد وہ تین پیالیاں لے کر آئی پھر وہ باتیں کرتی رہیں اور چائے پیتی رہیں۔ چائے کی پیالی خالی کرنے کے بعد رخسانہ کی امی نے کہا۔ "اب میں چلتی ہوں۔ میری تسلی کے لئے ایک بار اور وعدہ کرلو کہ رخسانہ کے متعلق کسی سے کچھ نہیں کہو گی۔"

"خالہ جان! ہم نے تو کہہ دیا ہے۔ آپ کہیں تو پکے کاغذ پر لکھ دیں۔"

"شریر کہیں کی۔ بس مجھے یقین آگیا ہے۔"

فرزانہ کی امی نے کہا۔ "تم ماضی میں دیکھ چکی ہو۔ ہم نے جو زبان دی اس پر قائم رہے۔ آئندہ بھی تمہارے کام آتے رہیں گے۔ یہاں سے مطمئن ہو کر جاؤ۔"

وہ چلی گئیں۔ فرزانہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "امی خالہ جان کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ رخسانہ بھی اپنی شادی کی بات چھپانا چاہتی ہے۔ وہ جمشید کے سامنے جانی اور بچے کا ذکر نہیں کرے گی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ماں بیٹی کیا کر رہی ہیں۔ آخر اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ مطلب سوچو تو شرم آنے والی بات ہے مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ رخسانہ چھچھوری نہیں ہے۔ بے شک وہ حسد کرنے اور جلنے کڑھنے والی لڑکی ہے۔ اس کی یہ خرابی اپنی جگہ ہے۔ جہاں تک کردار اور چال چلن کی بات آتی ہے تو وہ بہت ہی ٹھوس کردار کی مالک ہے۔ میں اس کے پیٹھ پیچھے بھی تعریفیں کرتی ہوں۔"

اس کی امی سنتی رہیں پھر انہوں نے کہا۔ "رخسانہ اور اس کے والدین نے جانی کے ساتھ دھوکا کر کے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی لیکن وہ غلطی کسی طرح نبھ گئی۔ خدا انہیں عقل دے کہ آئندہ یہ دنیا والوں کے سامنے دوسرا جھوٹ بول کر دوسری طرح دھوکے دے کر پھر کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہوں۔"

○☆○
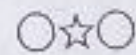
ٹھیک ہے' انسان پر مصیبتیں آتی رہتی ہیں اکثر حالات میں انسان خود مصیبتوں کو دعوت دیتا ہے۔ رخسانہ نے کئی بار اس موضوع پر غور کیا کہ جانی سے بات چھپانا کیا ضروری ہے اور خود کو بن بیاہی ظاہر کرنا مناسب ہے یا نہیں لیکن اس کی امی رہ رہ کر

سمجھاتی تھیں۔ "دیکھو بیٹی! جمشید کاروباری ذہنیت رکھنے والا جوان ہے۔ وہ تم پر یونہی لاکھ' ڈیڑھ لاکھ روپے برباد نہیں کرے گا۔ اس کے اپنے خواب ہوں گے اس نے تمہارے متعلق بہت کچھ سوچ رکھا ہو گا۔ تمہیں اس وقت تک اسے خواب دکھاتے رہنا چاہئے جب تک تمہارا چہرہ مکمل نہ ہو جائے۔ اگر تم نے اس سے پہلے اپنے متعلق سچ سچ بتا دیا تو ہمیشہ کے لئے ادھوری رہ جاؤ گی۔ اتنے اخراجات نہ تو جانی برداشت کر سکے گا نہ ہی تم سالہا سال کی محنت سے اتنی رقم کما سکو گی۔ اپنا اچھا برا خود ہی سوچنے کی کوشش کیا کرو۔ میں کب تک تمہیں سمجھاتی رہوں گی' لندن میں تمہاری کون سی ماں سمجھانے آیا کرے گی۔ ابھی سے ایک مصمم ارادہ کرلو۔ اسی ارادے کے ساتھ یہاں سے جاؤ اور کامیاب واپس آؤ۔"

ماں سمجھاتی رہی۔ بیٹی کش مکش میں مبتلا رہ کر ماں کی ہدایات پر عمل کرتی رہی۔ اس نے جمشید کو خط لکھا اور ناظم آباد کے مکان کا پتا دیا۔ اب جمشید کے پاس سے جو خط آتا تھا' رخسانہ کی امی اس لفافے کو بڑی مہارت سے کھولتی رہتی تھیں پھر اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا خط اس لفافے میں بند کر دیتی تھیں۔ وہ خط ایک فرضی چچا کی طرف سے ہوتا تھا اور اس چچا کا نام انکل جمشید علی تھا کیونکہ لندن سے جمشید جو لفافہ روانہ کرتا تھا۔ اس کے گوشے میں اس کا نام و پتا ہوا کرتا تھا بڑی کامیابی سے جانی کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ لندن سے انکل سے خط و کتابت جاری ہے۔

جانی نے پہلا خط پڑھ کر کہا۔ "رخسانہ تمہارے یہ انکل کبھی پاکستان آئیں گے تو میں ان کا شکریہ ادا کروں گا۔ فی الحال میری طرف سے انہیں یہ لکھ دو کہ وہ جو رقم خرچ کر رہے ہیں۔ اسے ہم قسطوں میں ادا کر دیں گے پہلے ہم ایک گاڑی فروخت کر دیں گے تم یہاں سے پچاس ہزار روپے لے کر جاؤ گی اور انہیں پہلی قسط ادا کر دو گی پھر ہم جیسے جیسے قدم جماتے رہیں گے۔ ان کی رقم ادا کرتے رہیں گے۔"

رخسانہ نے اس کے سامنے بیٹھ کر ایسا ہی ایک خط لکھا جانی نے کہا۔ "تم لفافے پر ایڈریس لکھ کر مجھے دے دو۔ میں لے جا کر پوسٹ کر دوں گا۔"

رخسانہ کی امی نے کہا۔ "نہیں بیٹے' میں بھی اپنے دیور کو' یعنی رخسانہ کے چچا کو کچھ لکھوں گی پھر خود ہی جا کر پوسٹ کر دوں گی۔ ابھی مجھے لکھنے کی فرصت نہیں ہے۔"

اس طرح بات بنتی گئی۔ جمشید کے نام اسی طرح خط پوسٹ ہوتا رہا کہ رخسانہ جانی کی غیر موجودگی میں جمشید کو دوسرا خط لکھتی تھی پھر وہی خط پوسٹ کیا جاتا تھا۔ اس نے خط و کتابت کے دوران اپنی شادی کا ذکر نہیں چھیڑا تھا۔ جب شادی کا ذکر نہ ہو تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے جمشید نے پھر اس کے متعلق ذاتی قسم کے سوالات نہیں کئے۔ ان خطوط میں آنے جانے، وہاں رہنے اور علاج کرنے کے سلسلے میں باتیں ہوا کرتیں تھیں۔ وہ جانی سے چھپ چھپ کر ڈرتے ڈرتے ایسا کر رہی تھی اور نماز کے دوران دعائیں مانگتی تھی کہ اس کی بات بن جائے۔ ایک بار چہرہ مکمل ہو جائے اس کے بعد پھر کیسی بھی آزمائش کی گھڑی آئے وہ مر جائے گی مگر کبھی جانی کو دھوکا نہیں دے گی۔ جھوٹ نہیں بولے گی۔

اکثر لوگ اپنی بگڑی بنانے کے لیے ایک بار جھوٹ کی کوئی گنجائش پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ سے بھی توقع کرتے ہیں کہ وہ ایک بار ان کے جھوٹ اور دھوکے کو جائز کر دے۔ اس کے بعد وہ ناجائز حرکتیں کبھی نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ ایسوں کی رسی دراز کرتا ہے۔ بندوں کے لیے راستوں کا تعین ہو چکا ہے کہ کس راستے کے آخر میں انعامی منزل ہے اور کس راستے کے آخر میں گڑھا ہے پھر ایک عقل دے دی ہے کہ آگے بڑھتے بڑھتے، قدم اٹھاتے ہوئے سمجھو کہ کدھر جا رہے ہو جب راستہ بھی معلوم ہو راستے کا انجام بھی معلوم ہو اور عقل بھی ساتھ ہو تو پھر دعا مانگنے، التجا کرنے اور مزاروں پر منتیں ماننے سے ایک غلط راستے کو صحیح کر دینے کی گنجائش کیسے نکلے گی؟

رخسانہ اور اس کی امی کے لئے ایک پریشانی یہ بڑھ گئی تھی کہ فرزانہ لندن میں ملازمت کرنا چاہتی تھی۔ یہ نیا مسئلہ آن پڑا تھا۔ اب لندن میں رہ کر جب تک پلاسٹک سرجری کا کام مکمل نہ ہو جاتا اس وقت تک فرزانہ کو جھوٹے بہلاوے دینے تھے۔ وہاں سے خط و کتابت کے ذریعے اسے خوش فہمی میں مبتلا رکھنا تھا کہ اس کے لیے ملازمت کا انتظام ہو رہا ہے۔ ایک سچ کو چھپانے کے لیے کتنے ہی جھوٹ کا سہارا لینا ہوتا ہے، کتنوں کو بہلانا ہوتا ہے اور کتنوں کی خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں۔ رخسانہ کبھی کبھی فرزانہ کی خوشامد کرنے کے لئے اس کے پاس پہنچ جایا کرتی تھی۔

آخری بار وہ فرزانہ سے ملنے گئی۔ بڑی محبت سے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا۔ "فری

میں کل کی فلائٹ سے لندن جا رہی ہوں۔ ساری تیاریاں ہو چکی ہیں، جانے سے پہلے میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔"

فرزانہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کس بات کی معافی؟"

"یہی کہ تم نے میرے ساتھ بہت کیا ہے میں کبھی کبھی تم پر شبہ کرتی رہی کہ تم میری ازدواجی زندگی برباد کرنا چاہتی ہو۔ میں غلطی پر تھی۔ جانے سے پہلے معافی مانگتی ہوں بہت لمبا سفر ہے کیا پتا جو راستہ مجھے لندن کی طرف لے جا رہا ہے وہ واپس لائے گا یا نہیں۔"

فرزانہ نے محبت سے اس کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔ "ہم سب کا اگلا پل موت کا ہوتا ہے۔ تم اتنی دور لندن جانے کی بات کر رہی ہو۔ ہو سکتا ہے میں یہاں بیٹھے بیٹھے ہی اگلے پل مر جاؤں زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں دعا کروں گی کہ تم اپنے شوہر کے لیے اور اپنے بچے کے لیے بخیریت واپس آؤ اور ہاں تمہارا بیٹا چھ مہینے کا ہو گیا اور تم نے اب تک اس کا نام نہیں بتایا؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "کامران! ہم پیار سے کامی کہتے ہیں۔"

"بہت ہی پیارا نام ہے ویسے انسان ذرا خود غرض ہوتا ہے نا میں اپنے لیے بھی تمہاری سلامتی کی دعا مانگوں گی کہ تم وہاں بخیریت رہو اور میرے لیے ملازمت کا انتظام کرو۔"

رخسانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں بھی انسان ہوں نا۔ اس لیے میں بھی خود غرض ہوں۔ جانتی ہو میں تمہاری ملازمت کا انتظام کیوں کروں گی، اس لیے کہ تم پاکستان چھوڑ کر دور چلی جاؤ۔ ماحول بدلنے سے تمہارا شادی کا موڈ ہو گا۔ جب شادی ہو جائے گی تو میرے دل میں جو ایک شبہ پیدا ہوتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔"

فرزانہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں اپنے مطلب کے لئے تمہاری سلامتی کی دعا مانگوں گی۔ تم اپنے مطلب کے لئے مجھے ملازمت کے بہانے اس ملک سے بھگا دینا۔ ہم سب مطلب پرست ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اپنا کام نکالنے کے لئے دوسروں کے کام آ جاتے ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب نیکی برائے نیکی کی جاتی تھی اب نیکی صرف باہمی مفاد کے لئے کی جاتی ہے۔"

رخسانہ نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم باتیں کرتے کرتے زہر میں بجھنے لگتی

ہو۔"

"میں ابھی زہریلی لگتی ہوں مگر تم یہاں سے جانے کے بعد زہر اگلنے لگو گی۔ ہم سب اندر سے زہریلے ہیں۔ کسی ایک کو الزام نہ دو۔ بائی دے وے، تم بتانا چاہو تو میں ایک بات ضرور پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور پوچھو۔"

"سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم جمشید کو کالج کے زمانے سے چاہتی ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ میں نے کبھی اس کے متعلق سوچا تک نہیں۔ تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا؟"

"اس لیے کہ تم اپنی شادی کی بات چھپا رہی ہو۔ لندن میں ایک جمشید ہی تو ہے جس سے یہ بات چھپا سکو مگر کیوں چھپا رہی ہو؟"

"بس یونہی۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ جمشید کو معلوم ہو گا کہ میں شادی شدہ ہوں تو وہ جانی کے متعلق طرح طرح کے سوالات کرے گا۔ پوچھے گا کہ میں اس کے ساتھ کیوں نہیں آئی بچے کو کہاں چھوڑ دیا ہے۔ کون اتنے سارے سوالوں کے جواب دے اس سے اچھا ہے کہ اپنے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔"

"عورتیں تو اپنے شوہر اور بچوں پر فخر کرتی ہیں۔ جہاں بیٹھتی ہیں اپنے مرد کے گن گاتی ہیں۔ اپنے بچوں کی شرارتیں بیان کرتی ہیں۔ کیا تمہارے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تعلیم یافتہ ہوں اور یہ سمجھتی ہوں کہ کس موقع پر کس کا ذکر ہونا چاہئے۔ میں بحیثیت ڈاکٹر مریضوں کو اٹینڈ کرتی رہوں اور ان کے سامنے اپنے شوہر اور بچے کا ذکر کرتی رہوں تو یہ بات بے موقع بھی ہو گی اور مضحکہ خیز بھی میں لندن میں رہ کر ہسپتال اور ڈاکٹروں کے ماحول میں رہوں گی جہاں میرے چہرے کی سرجری ہوتی رہے گی۔ ایسی جگہ اپنے شوہر اور بچوں کا ذکر کرنا بالکل غیر ضروری ہے۔ کیا اس بات کو تم سمجھ نہیں سکتیں تم بھی تو تعلیم یافتہ ہو۔"

"ہوں۔ مگر دل کے رشتوں کو چھپانے کی تعلیم نہیں پائی ہے۔"

"فری یہی مناسب ہے کہ میں تمہارے مطلب کی بات کروں۔ تم میرے مطلب کی

بات کرو۔ میں تمہاری ملازمت کے لئے پوری کوشش کروں گی۔ تم یہاں کسی کے سامنے میرا ذکر نہ کرنا یہ ہمارے درمیان زبانی معاہدہ ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

وہ جانے کے لئے اٹھ گئی۔ فرزانہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے کمرے سے نکل کر ڈسپنسری میں آئی پھر ڈسپنسری کا بیرونی دروازہ کھول کر ایک طرف آڑ میں کھڑی ہو گئی اور اسے خدا حافظ کہا۔ رخسانہ نے اس کی اس حرکت کو توجہ سے دیکھا پھر چونک کر بولی۔

"ارے میں تو بھول ہی گئی تھی۔ آج کل تم برقع پہننے لگی ہو۔ اسی لیے ادھر آڑ میں کھڑی ہو گئی ہو۔"

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "جانی کو میں نے بھی دھوکا دیا تم نے بھی دھوکا دیا مگر تم اس سے آنکھیں ملا کر زندگی گزارتی ہو اور میں منہ چھپاتی پھرتی ہوں۔ جانے کب تک مجرموں کی طرح زندگی گزارتی رہوں گی۔"

رخسانہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں جانتی ہوں۔ میری وجہ سے تم ایسی زندگی گزار رہی ہو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں جلد ہی وہاں بلا لوں گی۔ بس ایک آخری التجا اور کرنا چاہتی ہوں۔ برقع پہنتی رہنا۔"

"میں اسے برقع سمجھ کر نہیں، ڈھال سمجھ کر پہنتی ہوں اس لیے پہنتی رہوں گی۔"

رخسانہ نے بڑے محبت سے اسے دیکھا پھر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

"فری! میں ہزاروں میل دور جا رہی ہوں۔ اتنی دور جاتے وقت احساس ہو رہا ہے اگر مجھے کچھ ہو گیا۔ میں واپس نہ آ سکی تو ہماری خود غرضی، ہماری کمینگی، ایک دوسرے کی جانے والی مکاریاں سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ اس وقت پچھتاوا ہو گا کہ ہم نے ایک ذرا سی دیر کے لئے ایک دوسرے سے محبت کیوں نہیں کی۔ ایک دوسرے سے مصافحہ کیوں نہیں کیا ایک دوسرے کے گلے کیوں نہیں لگ گئیں۔"

وہ قریب آئی۔ فرزانہ نے اسے ایک دم سے چمٹا لیا پھر دونوں گلے لگ کر رونے لگیں۔ "فری! تم بہت اچھی ہو۔ تم نے مجھ پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ اب بھی کر رہی ہو۔"

"رخسانہ! آدمی جب اچھی بات کرتا ہے تو کیا ان اچھی باتوں پر عمل بھی کرتا ہے؟"

"اچھی بات ہو تو میں ضرور عمل کرتی ہوں۔"

"تمہارا یہ دعویٰ سلامت رہے۔ بقول تمہارے تم خدانخواستہ واپس نہ آسکو تو یہ پچھتاوا ہم سب کو ہو گا کہ ہم نے اپنی زندگی میں اپنی قربت میں ایک دوسرے سے محبت کیوں نہیں کی، ایک دوسرے کو دھوکا کیوں دیا۔ رخسانہ! جب یہ اچھی بات ہے تو اس پر عمل کرو اور جانی کو دھوکا نہ دو۔ اسے بتا دو کہ تم ملک سے باہر جا کر کنواری کہلاؤ گی۔"

رخسانہ ایک دم سے ساکت ہو گئی۔ اس کے دماغ میں یک بیک آندھی سی چلنے لگی۔ فرزانہ نے بڑے صحیح وقت پر اچھی باتوں کا حوالہ دے کر اسے عمل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ خود جانی کو دھوکا دینے کے دوران اندر سے سہمی ہوئی تھی اور چھپ چھپ کر پچھتاتی تھی۔ پچھتانے کے باوجود ایسا کرتی جا رہی تھی۔ اس کی ای اے سہارا دیتی جا رہی تھیں۔ اب فرزانہ نے ایک بات کہہ دی تو وہ بات اس کے دماغ میں بیٹھ گئی۔

"فری تم جانتی ہو کہ میں دنیا کے کسی مرد کو جانی پر ترجیح نہیں دے سکتی۔ انہیں دھوکا دینے کی بات سوچتی ہوں تو اندر سے کانپنے لگتی ہوں اللہ! کہیں کسی شبہ کی بنا پر ان کی محبت مجھ سے چھن نہ جائے۔ تم نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔ میں اس پر عمل کروں گی۔"

دونوں سہیلیوں نے خوش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا ایک دوسرے کو پیار کیا۔ پھر رخسانہ اس سے رخصت ہو کر باہر آ گئی۔ فرزانہ نے دروازے کو بند کر لیا۔ جب وہ رکشہ میں بیٹھ کر ناگن چورنگی کی طرف جا رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

محبت کے جذبے سر اٹھا رہے تھے اسے سمجھا رہے تھے کہ فرزانہ ٹھیک کہتی ہے۔ جانی کو دھوکا نہیں دینا چاہیے۔ ایسا اعتماد کرنے والا شوہر خوش نصیب عورتوں کو ملتا ہے۔ اس لیے اپنے نصیب کو نہیں بگاڑنا چاہیے۔ فرزانہ ٹھیک کہتی ہے۔

اچانک اس کے اندر سے ایک چڑیل بولنے لگی۔ چڑیل کی آواز ٹھیک اس کی ای جیسی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "فرزانہ کیا خاک ٹھیک کہتی ہے؟ دشمن نے کبھی کوئی صحیح مشورہ دیا ہے؟ بیوقوف نہیں بننا چاہیے جانے کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ کل کی فلائٹ سے روانگی ہے اب جانی کو صحیح بات بتا دی گئی تو جانا منسوخ ہو جائے گا اور آدھا جہد اس اطرح موجود رہے گا۔

اگر چہرے میں تھوڑی سی خرابی ہو جائے تو آئینہ عورت کو سمجھاتا ہے کہ بی بی خرابی نہیں ہے، عورت نہ مانے تو پھر سمجھا جاتا ہے کہ یہ چاند کا داغ ہے جو حسن بڑھاتا ہے۔

آئینہ عورت کا سب سے بڑا دوست ہوتا ہے جو سامنے آتی ہے اسے ناراض نہیں کرتا۔ اسے مایوس نہیں کرتا۔ دیکھنے والی آنکھوں میں روپ رنگ کے اتنے جلوے بھر دیتا ہے کہ وہ اندھی ہو جاتی ہیں۔ صرف اپنے آپ کو دیکھ سکتی ہیں اور دیکھنے والی دنیا کو بھول جاتی ہیں۔

لیکن رخسانہ کا چہرہ اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ وہ آئینے کے سامنے خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دس بیس برس تک اپنی کمائی کے بھروسے پر صبر نہیں کر سکتی تھی پھر بڑھاپے میں چہرہ بنتا تو کیا بنتا؟ کس کے لئے بنتا؟ وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے مکمل چہرے کو دیکھتی یا سفید بالوں کو گنتی؟

رخسانہ کو جیسے عقل آ گئی۔ "میں بھی کتنی نادان ہوں۔ فری کی باتوں میں آ رہی تھی اور جانی کو سچ سچ بتانے والی تھی۔ بتا دیتی تو وہ مجھے کبھی لندن نہ جانے دیتے میں ایسی ہی رہ جاتی اور وہ فری کے پیچھے بھاگتے پھرتے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ فری کی چال کیا تھی۔ وہ مجھے ادھوری رکھنا چاہتی ہے تاکہ جانی اسی کے پیچھے لگا رہے۔ برقع پہننے سے کیا ہوتا ہے یہ تو شوق کو اور بڑھانے والی بات ہوتی ہے کہ آؤ ڈھونڈ لو اور مرد تو ایسوں کے پیچھے ہی بھاگتا ہے جو ہاتھ نہیں آتیں۔

رکشہ شور مچاتا ہوا ایک شاہراہ سے گزر رہا تھا اب رخسانہ کے اندر بھی آندھی تھم گئی تھی۔ اس نے جیسے فرزانہ کا اصلی چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اب نفرت سے سوچ رہی تھی۔ توبہ توبہ کیسی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ جسے سہیلی بنائیں میٹھی چھری سے اسی کا گلا کاٹتی ہیں۔ ابھی رخصتی کے وقت گلے لگ رہی تھی اور چپ چاپ مجھے گڑھے میں گرا رہی تھی وہ کون ہوتی ہے میرے شوہر کا نام لینے والی۔ میں اپنے شوہر کی وفادار ہوں یا نہیں یہ میرا خدا جانتا ہے۔ اس کے دل میں تو چور ہے۔ کسی نہ کسی بہانے جانی کا ذکر ضرور کرے گی، بڑی ہمدردی جتا رہی تھی کہ میں اس سے دھوکا نہ کروں۔ اس سے جھوٹ نہ بولوں۔ اری میں کچھ بھی کروں تیرے دل میں درد کیوں اٹھتا ہے؟ ابھی تک تیری نیت کیوں

خراب ہے۔" ملک سے باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی ہے مگر شادی کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ شادی کے بعد دوسرے کی ہو جائے گی تو جانی کا چانس ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بے حیا' بے غیرت....."

دوسروں کی بے غیرتی اور بے حسی کا حساب کرتے رہنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اپنا محاسبہ کرنے کی باری کبھی نہیں آتی۔

○☆○
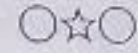
جانی بستر پر پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں کامران ننھے ننھے ہاتھ پاؤں جھٹک کر کھیل رہا تھا۔ ایک بار کامران نے منہ بنایا۔ رونے کی دھمکی دی۔ جانی نے پچکارتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! یہ رونے والی بات اچھی نہیں لگتی۔ اب ماں کی گود تلاش نہ کرو۔ وہ پرائی ہو رہی ہے۔"

رخسانہ نے استری کا پلگ نکال کر پتلون کو تہہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "ایسا کیوں کہتے ہو؟ کیا ہزاروں میل دور جانے سے میں تمہارے اور کامی کے لئے پرائی ہو جاؤں گی۔"

جانی نے اسے پیار بھری اداسی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کل تم سمندر پار چلی جاؤ گی۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی تمہیں چھین کرلے جا رہا ہو۔"

رخسانہ نے چونک کر سر اٹھایا' جانی کی نظریں تیز نہیں تھیں' لیکن اس کے دل میں ترازو ہو رہی تھی۔ دل کے چور نے پوچھا۔ "کیا جمشید اسے جانی سے چھین رہا ہے؟"

"کبھی نہیں۔" اس نے عزم سے سوچا۔ "جمشید جیسے خوبرو اور دولت مند جوانوں کی بھیڑ میں بھی میں اپنے جانی کا ہاتھ نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جانی کا ہاتھ پکڑنے کے لئے تیزی سے جانے لگی لیکن ضمیر کی رفتار اس سے تیز تھی' وہ اندر سے بول رہا تھا۔ رخسانہ تیرا جھوٹ تجھے جانی سے چھین رہا ہے جو تجھ پر اعتماد کر رہا ہے' اس سے صاف کہہ دے کہ جمشید کے تعاون سے' مہربانی یا محبت سے باقی آدھا چہرہ ملنے والا ہے۔

وہ اپنے کانوں میں مصلحت کی انگلیاں ٹھونس کر جانی کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ کو تھام کر بولی۔ "ایسا کیوں سوچتے ہو؟ میں کمزور نہیں ہوں البتہ مجھے تم سے نسم .

ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جانی نے کہا۔ "دیکھو پھر رونے لگی ہو۔ شام سے اب تک کتنی بار آنسو پونچھ چکا ہوں۔ کل ایئرپورٹ پر رونے کے لئے کچھ بچا کر رکھو۔"

اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے رخصت کرتے وقت تم بھی روؤ گے نا؟"

اسی وقت اس کی امی کمرے میں داخل ہوئیں' جانی سے نگاہیں چار ہوئیں وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "تم اپنے پیچھے رونے کا سامان چھوڑ کر جا رہی ہو۔ روتا ہی رہوں گا۔"

"میں اپنے پیچھے اپنی یادیں چھوڑ کر جاؤں گی۔ تم یادوں کو رونے کا سامان کہہ رہے ہو' ہائے کتنا خوبصورت استعارہ ہے۔ بھلا کون تمہیں ٹیکسی ڈرائیور کہے گا؟"

اس کی امی نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "اے بیٹی! ذرا سمجھا کرو۔ یہ لڑکا مجھے دیکھ کر کہہ رہا ہے۔ یہ مجھے دیکھ دیکھ کر روتا رہے گا۔"

رخسانہ نے پلٹ کر ماں کو دیکھا' پھر وہاں سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا' آپ جانی کی باتوں کو اپنے اوپر کیوں لے لیتی ہیں۔ ابھی ہم اپنی باتیں کر رہے تھے اور بیچ میں آپ ٹپک پڑیں۔"

جانی نے کہا۔ "تم مجھے سمجھاتی ہو کہ تمہارے جانے کے بعد امی کا خیال رکھوں؟ تمہارے جہیز میں آنے والی چیزوں میں یہی ایک ایسی چیز ہیں جو میرے خیال سے نہیں ملتیں۔"

وہ جانی کی طرف انگلی اٹھا کر بولیں۔ "سنو بیٹی! یہ کیا کہہ رہا ہے' کیا میں تمہارے جہیز میں آئی ہوں؟"

"امی! یہ غصے سے کہہ رہے ہیں اور غصہ آپ نے دلایا ہے۔"

وہ جھنجلا کر جانی کے پاس آئیں اس کی گود سے بچے کو چھیننے کے انداز میں لیتے ہوئے بولیں۔ "یہ تو میں خوب جانتی ہوں کہ تم اپنے شوہر کا قصور کبھی نہیں مانوگی۔ میں تمہاری کوئی نہیں لگتی۔ میں تو دشمن ہوں۔ کیا کروں نواسے کی محبت کھینچ لاتی ہے نہیں تو کبھی جھانکنے بھی نہ آؤں۔"

وہ بچے کو لے کر بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے چلی گئیں۔ جانی نے کہا۔ "کامو میرا بیٹا

ہے مگر دیکھو کس طرح مجھ سے چھین کرلے گئی ہیں۔"

"مجھے تو چھوڑ دیا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ "پھر تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ وہ ہنسنے لگا۔ ان کی ہنسی کی آواز بند کمرے میں پرواز کرتی ہوئی باورچی خانے میں پہنچ رہی تھی۔ فرید احمد فرشی بستر پر لیٹے ہوئے تھے رخسانہ کی امی نے نواسے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں اس لڑکی کو جانی میں کیا مل گیا ہے۔ کتنی خوش رہتی ہے۔ اس کے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ مجھے تو لفنگا لگتا ہے۔"

فرید احمد نے کہا۔ "میں تو شریف آدمی ہوں کیا تم مجھ سے کبھی خوش رہی ہو؟"

"اے اپنی بات نہ کرو۔ کبھی تم نے مجھے دل کھول کر ہنسایا ہے؟"

"چھوڑو بیگم! اب میں اس بڑھاپے میں لفنگا نہیں بن سکتا۔"

بچہ رونے لگا۔ وہ فرید احمد کے پاس اسے لٹا کر بولیں۔ "ذرا چپ کراؤ میں دودھ تیار کرتی ہوں میرا لال بھوکا ہے۔"

فرید احمد نے اسے گود میں لیا پھر اسے پچکارتے ہوئے بولے۔ "یہ ماں کے بغیر کیسے رہے گا؟ بہت پریشان کرے گا۔"

وہ ناگواری سے بولیں۔ "جتنا تم نے پریشان کیا ہے اتنا نہیں کرے گا۔"

بند کمرے کی نیم تاریکی میں رخسانہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ بیٹا اس کی ممتا کو پکار رہا تھا۔ جانی اسے شوہر کی محبت سے زنجیر کر رہا تھا۔ ایک ماں کے لئے ایک بیوی کے لیے آج آخری رات تھی پھر سال چھ مہینے کی بات تھی۔ جانے ایسی رات پھر کب نصیب ہوتی۔ وہ چاہتی تھی اس کے ایک طرف کامی ہو' دوسری طرف جانی ہو۔ سمندر پار جانے سے پہلے وہ سمندر بن کر دونوں کو اپنے اندر ڈبو لینا چاہتی تھی۔ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ سیپیاں چننے کے لئے فرزانہ ساحل پر کھڑی ہوئی تھی۔

وہ ڈوبتے ہوئے دل سے بولی۔ "میرے جانی! مجھے یاد کرتے رہو گے نا؟"

وہ ڈوب کر بولا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

"اس کے پیچھے نہیں جاؤ گے نا؟"

وہ جیسے تلاش کے صحرا میں تھک کر گر پڑا۔ "رخسانہ! تم بہت دور جا رہی ہو۔ میں اتنی دور تمہیں تسلیاں دینے نہیں آسکوں گا۔ اپنے دل سے اندیشے کو نکال کر جاؤ۔"

"تم ایک بار کامی کی قسم کھا کر یقین دلاؤ مجھے اطمینان ہو جائے گا۔"

وہ ذرا ہچکچایا پھر اس نے بات بنائی۔ "کتنے مہینے ہو گئے۔ ایک بار وہ صدر میں نظر آئی تھی۔ میں اس کا پتا ٹھکانا نہیں جانتا۔ اس کے پیچھے کیسے بھاگ سکتا ہوں' جو موجود نہ ہو۔"

آدمی سائے کے پیچھے بھاگتا ہے' بیٹے کی قسم کھا کر کہو۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "میں اپنے بیٹے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ فرزانہ سے نہیں ملوں گا۔" پھر اس نے اپنے دل میں کہا۔ "وہ ملے تو دوسری بات ہے۔"

وہ خوش ہو گئی۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگی' اس کا جانی اسے کبھی مایوس نہیں کرتا تھا۔ اس کی ہر بات مان لیتا تھا۔ باہر ٹھوکر کھاتا تھا مگر گھر میں آکر سنبھل جاتا تھا۔ اللہ تعالٰی نے ایک خوبصورت بیٹا دیا تھا۔ گھر اپنا تھا۔ ٹیکسی کی آمدنی اپنی تھی۔ کسی کی محتاجی نہیں تھی۔ ایسی آسودہ ازدواجی اور گھریلو زندگی بہت کم عورتوں کو نصیب ہوتی تھی۔

رات کے پچھلے پہر جانی سو گیا۔ اپنی عورت پر اعتماد ہو تو بڑی گہری نیند آتی ہے۔ ایک تکیے پر اس کا سر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے تکیے پر رخسانہ سر رکھے اسے دیکھ رہی تھی۔ ندامت سے خود کو سمجھا رہی تھی۔ بے شک میں جانی سے بات چھپا رہی ہوں مگر بے وفا نہیں ہوں۔ جاتے ہی جمشید سے کہہ دوں گی کہ پلاسٹک ۔ ؟ ی کے اخراجات کا باقاعدہ تحریری حساب ہو گا جو بھی رقم بنے گی میں اس کا ایک ایک ۔ : یا ایک ایک پنس ادا کروں گی۔ کسی کا احسان نہیر ںوں گی۔ کبھی کسی کے آگے جانی کا سر جھکنے نہیں دوں گی۔ بے شک میں بات چھپا رہی ہوں مگر میری نیت کو میرا خدا ہی جانتا ہے۔

وہ آگے سرک کر اپنے مجازی خدا کی پناہ میں سو گئی۔

○☆○
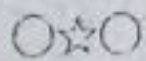
جدائی کی گھڑیاں آگئیں۔ اپنے گھر پر تالا لگاتے وقت رونا آرہا تھا کہ پتا نہیں پھر اس

دروازے پر کب آتا ہو۔ اس نے بچے کو امی کی گود سے لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر جانی کے برابر بیٹھ گئی۔ پچھلی سیٹ پر اس کی امی اور ابو بیٹھ گئے۔ سفر کا تمام سامان چھت کے کیریئر پر باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے ابو نے کہا۔ "بیٹے! اچھی طرح گن لینا چاہیے کہ کوئی سامان چھوٹ نہ گیا ہو۔"

وہ پھر رونے لگی۔ "میں تو اپنا سب ہی کچھ چھوڑ کر جا رہی ہوں۔"

جانی نے ٹیکسی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "رخسانہ! بری بات ہے۔ ہنستے بولتے چلو۔"

اس نے ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھالا۔ دوسرے ہاتھ سے جانی کے بازو کو پکڑ کر کہا۔ "اپنی صحت کا خیال رکھنا' دن رات ٹیکسی نہ چلانا۔"

"ایک ٹائم چلاؤں گا۔ دوسرے ٹائم کسی ڈرائیور کو دے دوں گا۔"

"امی! جانی تینوں ٹائم آپ کے ہاں کھانا کھانے آئیں گے۔ جس دن نہ آئیں تو مجھے خط لکھیے گا' میں خوب رووں گی۔"

جانی نے بڑے پیار سے کہا۔ "میں تمہیں نہیں رلاؤں گا جب تینوں وقت بیٹے کو پیار کرنے جایا کروں گا تو کھانا بھی کھایا کروں گا۔"

"میں نے تمہارے کپڑے استری کر دیے ہیں۔ کپڑے میلے ہوں تو دھوبی کو نہ دینا۔ امی دھو کر استری کر دیا کریں گی۔"

"تم یہ ساری باتیں کل سے سمجھا رہی ہو۔"

"تم بے پروا ہو' بھول جاتے ہو۔ میں خط لکھ کر یاد دلایا کروں گی۔"

وہ ہنس پڑا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "میں بہت خوش نصیب ہوں کہ تم نے مجھے اتنی محبت دی ہے' اتنی توجہ دی ہے کہ اب تمہارے بغیر رہنا مشکل ہو جائے گا۔ وہاں پہنچتے ہی خط لکھنا۔ دیر کرو گی یا نہیں لکھو گی تو مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"ایں؟" وہ ذرا گھبرا گئی۔ اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسی [illegible] بات ہو گی تو جانی بھرا ہے' اسے ڈھونڈنے لندن تک جا سکتا ہے' اگر ایسا ہوا تو صورت بن ہی جائے گی مگر تقدیر بگڑ جائے گی۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ "دیکھو جانی! میں ہر ہفتے خط لکھا کروں گی مگر

ڈاک کے نظام میں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ میرا کوئی خط غلط پتے پر پہنچ سکتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے میری کوئی خبر نہ ملے تو صبر سے کام لینا۔ وہاں بھاگے آؤ گے تو بے تحاشا اخراجات بڑھیں گے پھر میرا چہرہ نہیں بن سکے گا۔"

وہ تمام راستے اسے سمجھاتی رہی۔ ایئرپورٹ پر پہنچتے ہی آنسوؤں کا سیلاب آ گیا۔ جانی کے سوا سب رو رہے تھے۔ رخسانہ خود تو رو رہی تھی مگر بچے کو چپ کرا رہی تھی۔ کبھی اسے چوم رہی تھی' کبھی سینے سے لگا کر آہیں بھر رہی تھی۔ جانی نے بے بسی سے کہا۔ "مجھے رونا نہیں آ رہا تم میرے دل کی حالت سمجھ سکتی ہو۔ بچپن میں ماں کی گود سے بچھڑا تھا آج سے تمہاری محبت نہیں ملے گی۔"

"ملے گی جانی! میں جلد آؤں گی۔ جس دن میرا چہرہ مجھے واپس ملے گا۔ اسی دن وہاں سے چل پڑوں گی۔"

اس نے متعلقہ کاؤنٹر کے پاس پہنچ کر پاسپورٹ اور ضروری کاغذات پیش کیے' ان پر روانگی کی مہر لگوائی۔ ٹی وی سے اعلان کیا جا رہا تھا کہ مسافر طیارے میں پہنچ جائیں۔ اس کی امی نے اسے گلے لگا کر خوب دعائیں دیں۔ اس کے ابو نے پیشانی چوم کر کہا۔ "میری بیٹی خوبصورت گڑیا بن کر آئے گی' جاؤ بیٹی تمہیں خدا کے حوالے کیا۔ خود کو کبھی اکیلے نہ سمجھنا ہماری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

رخسانہ نے بچے کو خوب چوم کر ماں کے حوالے کیا پھر سفری بیگ شانے سے لٹکا کر جانی کے ساتھ اس ریلنگ تک آئی' جہاں سے جانی کا ساتھ بھی چھوٹنے والا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ کو تھام کر کچھ بولنا چاہتی تھی مگر اس کی آواز آنسوؤں میں بہہ گئی۔ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ جانی نے مسکرا کر کہا "مسکراؤ' جب زبان سے بولا نہ جائے تو حوصلے سے مسکرانا چاہیے۔"

وہ جبراً مسکرانے کی کوشش کرنے لگی پھر بولی "جب سے لندن جانے کی بات چلی ہے' میں تمہارے آگے دن رات بولتی جا رہی ہوں مگر لگتا ہے وہ بات کہیں گم ہو گئی ہے جو میں کہنا چاہتی ہوں۔"

"وہ بات گم نہیں ہوئی۔ میرے دل پر لکھی ہوئی ہے۔ ایک بار تم نے کہا تھا۔ جانی! وعدہ کرو' اگر کبھی ایسی منحوس گھڑی آئی کہ ہمیں مجبوراً الگ ہونا پڑے تو الگ ہونے کے

بعد میں کم از کم پانچ برس تک شادی نہیں کروں گا۔"

"ہاں جانی! تمہیں وہ وعدہ یاد ہے؟"

"یاد ہے۔ میں نے اس روز بھی کہا تھا۔ آج بھی کہتا ہوں۔ مجھے عورتیں بہت ملیں گی' شاید فرزانہ بھی ملے مگر میرے مزاج کو' میری رگ رگ کو سمجھنے والی تمہاری جیسی بیوی نہیں ملے گی۔"

"مشکل تو یہی ہے جانی! میری جیسی بیوی بھی نہیں ملے گی اور فرزانہ جیسی آنکھ مچولی کھیلنے والی بھی نہیں ملے گی۔"

"رخسانہ! تمہارے رخصت ہونے سے پہلے میں تمہارے دل میں سے فرزانہ کا کانٹا نکال دینا چاہتا ہوں۔ تم نے پانچ برس کا وعدہ لیا ہے' میں تمہاری آخری سانس تک کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ جب تک تم میری شریک حیات رہوگی' کوئی دوسری عورت تمہاری جگہ نہیں لے گی۔"

وہ یک بہ یک خوشی سے کانپنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سورج اتر آیا۔ آنسو کرن کرن چمکنے لگے۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی "اور ایک بار میری قسم کھا کر بولو۔"

"جب مرد اپنی زبان دیتا ہے تو وہ زبان کسی قسم کی محتاج نہیں رہتی۔ میری جان! ہنستے ہوئے جاؤ' ہنستے ہوئے آؤ۔ میں تمہارے انتظار میں اکیلا رہوں گا۔"

وہ دونوں تھوڑی دیر تک ہاتھوں میں ہاتھ تھامے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبتے رہے پھر وقت نے منادی کی۔ یہ ملاقات مسافرانہ ہے۔ کسی کو رہنا ہے کسی کو جانا ہے۔ ہاتھوں سے ہاتھ چھوڑ دو نگاہوں کے رشتے توڑ دو۔ رخسانہ کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ وہ دور ہونے لگی۔ جاتے جاتے پلٹ کر کبھی نگاہوں کے رشتے جوڑنے اور کبھی توڑنے لگی۔ زمین کو چھوڑ کر آسمان پر چلنے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ پھر دیو قامت طیارے نے اسے اپنے اندر چھپالیا۔

اب وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ جانی نے بیٹے کو گود میں لے لیا۔ کبھی طیارے کی طرف دیکھنے لگا' کبھی بیٹے کو چومنے لگا' اسے یقین تھا کہ رخسانہ دیکھ رہی ہوگی اور جو پیار بیٹے کو مل رہا تھا' اسے اپنے لیے سمجھ رہی ہوگی۔ زندگی کی مسافت میں ہم ایک دوسرے کے لیے جو کچھ کرتے ہیں' وہ محض یادوں کی مار مارنے کے لیے کرتے ہیں۔ جب طیارے نے

پرواز کی اور نظروں سے اوجھل ہوا تو اُدھر رخسانہ کو ادھر جانی کو یادوں کی مار پڑ رہی تھی۔

○☆○
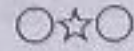
فرزانہ اپنے ہاتھ میں پھول لیے سیاہ برقعے میں چھپی یوں کھڑی تھی جیسے انار کلی کو چار دیواری میں چن دیا گیا ہو۔ شہزادہ سلیم اسے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن فرزانہ اسے دیکھنے ائرپورٹ تک چلی آئی تھی۔

جب چھپنا لازم ہو گیا تھا تو پھر چھپ کر دیکھنے کیوں آئی تھی؟ کیا سہیلی پر الوداعی نظر ڈالنے آئی تھی؟ یا دل میں چور تھا کہ رخسانہ کے جاتے ہی جانی کسی طرح اس کی راہ پر لگ جائے۔ اگر رخسانہ اور اس کی امی اسے برقعے میں پہچان لیتیں تو ذہن میں ایسے ہی سوالات کلبلانے لگتے۔ ادھر فرزانہ یہ طے کرکے آئی تھی کہ پہچان لی گئی تو دو ٹوک باتیں کرے گی۔ ان کے سوال کے جواب میں سوال کرے گی "بتاؤ جانی کو پھر ایک بار دھوکا کیوں دے رہی ہو؟ سہاگن ہوتے ہوئے کنواری بن کر کیوں جا رہی ہو؟"

بے شک یہ رخسانہ اور جانی کے ذاتی معاملات تھے۔ فرزانہ کو ان کے بیچ میں بولنے کا حق نہیں تھا لیکن یہ کہنے کا تو حق تھا کہ جب وہ تمہارے ذاتی معاملات ہیں تو برقعہ پہننا میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم ہاتھ جوڑ کر مجھے جانی سے چھپنے کے لیے کیوں کہتی ہو؟

رخسانہ کی حرکتوں نے یہ تجسس پیدا کر دیا تھا کہ آخر وہ جانی اور جمشید کے درمیان کون سا کھیل کھیل رہی ہے؟ اگر وہ یہاں سے کنواری بن کر جا رہی ہے تو پاسپورٹ میں رخسانہ بیگم بنت فرید احمد لکھا ہوگا۔ کیا جانی نے پاسپورٹ نہیں دیکھا ہوگا؟ وہ اس حد تک تو انگریزی جانتا ہے کہ اپنا اور رخسانہ کا نام پڑھ سکے۔ وہ پوچھ سکتا ہے کہ رخسانہ بیگم زوجہ جانی کیوں نہیں لکھا گیا؟

اور اگر پاسپورٹ میں بادشاہ جانی کی شریک حیات کی حیثیت سے نام درج ہے تو ادھر جمشید پر بھید کھلے گا کہ وہ کنواری نہیں ہے۔ فرزانہ اس پاسپورٹ کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی لیکن رخسانہ نے اسے اپنے کسی راز کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔

جب ایک عورت دوسری عورت کے سامنے ذرا پراسرار بن جائے تو دوسری عورت کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔ وہ پہلی عورت کے اسرار جاننے کے لیے کھانا پینا اور سونا چھوڑ دیتی ہے۔ یہی فرزانہ کے ساتھ ہو رہا تھا۔ سوتے جاگتے یہ بات دماغ میں پکتی

رہتی تھی کہ جب ایک سہاگن کسی غیر مرد کے سامنے اپنے مرد کو چھپائے' اپنے طرز عمل سے بن بیاہی بنی رہے تو اپنے آپ کو اچھوتی' بے داغ اور تر و تازہ بنا کر پیش کرنے والی نیت ظاہر ہوتی ہے۔ رخسانہ ایسی ہی نیت لے کر گئی تھی تو اسے جانی کے سلسلے میں فرزانہ کی نیت پر شبہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے شوہر کو کھوٹے سکے کی طرح پھینک کر گئی تھی اور کہیں پڑے ہوئے سکے کو کوئی بھی اٹھا سکتا ہے۔

فرزانہ کا دعویٰ تھا کہ جانی میری دریافت ہے۔ پہلے میں نے اسے دیکھا' پہلے میں نے اسے چاہا۔ یہ میرا حوصلہ ہے کہ میں نے اپنی محبت رخسانہ کے حوالے کر دی۔ اپنے دل کو پتھر کر لیا۔ رخسانہ کی ازدواجی زندگی کو قائم اور خوش حال رکھنے کے لیے جانی کی نظروں سے دور چلی گئی' سات پردوں میں چھپ گئی۔ محلہ چھوڑ دیا' ملک بھی چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ آخر یہ سب کس لیے؟ اور کس کے لیے۔

پہلا سوال ہے کس لیے؟ تو جواب ہے' اس کے لیے کہ رخسانہ کے حالات نے جانی کو اس کا شوہر بنا دیا تھا اس لیے میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ سوچا کہ وہ جانی کو ایک عورت کا اعتماد دے گی۔ اس کی قدر کرے گی مگر وہ اپنے آدھے بے مروت چہرے پر کنوارے پن کا لیبل لگا کر اس کی توہین کر رہی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ میں نے اتنی ساری قربانیاں کس لیے دی ہیں؟ اب اس کا جواب میری سمجھ میں آتا ہے کہ میں نے یہ سب کچھ رخسانہ کے لیے نہیں' جانی۔ کے لیے کیا ہے اور اب رخسانہ جانی کی قدر نہیں کر رہی ہے۔ اسے شوہر کا صحیح مقام نہیں دے رہی ہے تو میں اپنی محبت واپس لے لوں گی۔

یہ دستور ہے' کسی سے کوئی چیز لیتے ہو تو اسے سنبھال کر رکھو نہیں رکھ سکتے تو واپس کر دو۔ تم جس کی قدر نہیں کرتے' دوسرے کو اس کی قدر کرنے دو۔ ایسا نہیں کرو گے تو دینے والا جھلا کر اپنی چیز چھین لے گا۔

اور وہ جھلا کر ائرپورٹ پر آئی تھی۔ اس کی امی کو معلوم ہوتا تو وہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنے دیتیں لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس کی امی موجود نہیں تھیں' دو دن کے لیے سکھر گئی ہوئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اب وہ بے لگام ہو گئی ہے' اپنی من مانی کر سکتی ہے' اپنے طور پر معلوم کر سکتی ہے کہ جانی کو اپنی بے قدری کا علم

ہوا ہے یا نہیں؟

وہاں کتنے مرد' عورتیں اور بچے اپنے اپنے عزیز و اقارب کو الوداع کہنے آئے تھے۔ فرزانہ نے اس بھیڑ میں ایک طرف کھڑے ہو کر جانی اور رخسانہ کو دیکھا۔ وہ ریلنگ کے پاس ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوب رہے تھے۔ انہیں آس پاس کا ہوش نہیں تھا۔ خصوصاً جانی سحرزدہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ رخسانہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

فرزانہ مان گئی کہ وہ مرد کو اُلّو بنانا جانتی ہے۔ ادھر لندن والے کو بھی بنائے گی۔ جب وہ طیارے کے اندر چلی گئی۔ تب بھی جانی بیٹے کو گود میں لیے محبت سے طیارے کی طرف دیکھتا رہا۔ طیارے نے پرواز کی' نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ اسی طرح کچھ دیر تک بچے کو سینے سے لگائے کھڑا رہا۔ ایک بیوی کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ رخسانہ کے بدن کے ایک ٹکڑے کو دل کی دھڑکنوں سے لگائے ہوئے تھا۔ فرزانہ کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ کھلونا دے کر بہلایا گیا تھا۔

الوداع کہنے والوں کی بھیڑ چھٹ رہی تھی۔ وہ برقع میں لپٹی ہوئی عمارت کے اس حصے میں آ گئی جہاں سے سب لوگ گزر کر پارکنگ ایریا اور ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جا رہے تھے۔ اب بچہ اپنی نانی کی گود میں تھا۔ نانا بھی ساتھ چلے آ رہے تھے۔ جانی سب سے پیچھے تھا۔ سر جھکائے سوچ میں گم' بوجھل قدموں سے آ رہا تھا۔ جیسے سب کچھ لٹا کر آ رہا ہو جیسے اپنے لٹنے کی خبر نہ ہو لیکن کسی اطلاع نے اسے چور چور کر دیا ہو۔

وہ تڑپ گئی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کے لیے' وہ اپنا دل' اپنی دنیا نچھاور کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس لمحے خوف نے اسے جکڑ لیا۔ خبردار! وہ دیوانہ ہے۔ سرعام رسوا کر کے رکھ دے گا۔ اس کی فطرت وحشیانہ ہے' دیکھتے ہی پٹائی شروع کر دے گا۔ وہ محبت کے جنون میں بولے گا تو دنیا سنے گی۔ نفرت سے پیٹے گا تو پھر ایک بار حوالات میں پہنچ جائے گا۔

وہ سہم کر کھڑی رہی۔ اس کے سامنے سے رخسانہ کی امی ابو گزر رہے تھے۔ فرید احمد ٹھوڑی کے نیچے کھجا رہے تھے اس لیے سر اٹھائے گزر گئے۔ رخسانہ کی امی بچے کو سنبھالتے ہوئے گزر گئیں۔ کسی نے برقعے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اب جانی آ رہا تھا۔

اب جان جارہی تھی۔ اب وہ گھڑی آرہی تھی۔ جب سوہنی کچا گھڑا بن جاتی ہے۔ وہ فیصلے کا وقت تھا کہ عورت کی حیا برقعے میں ہوتی ہے یا زبان میں۔

برقعے میں ہوتی تو وہ اس کے سامنے نہ آتی جس کے لیے پہنا تھا۔

حیا کے مارے زبان نہیں کھلتی' اس لیے نہیں کھلی۔

جانی دھڑکتے ہوئے لمحوں میں ایک ایک قدم چلتا ہوا بالکل قریب آگیا۔ وہ دو گز کے فاصلے پر تھا۔ پھر ایک قدم آگے بڑھا تو برقعے کے نقاب کے عین سامنے تھا۔ اب اگلا قدم اسے سامنے سے گزار دیتا مگر وہ خلاف توقع ٹھہر گیا۔

ادھر اس کے قدم رکے' ادھر اس کی سانس رکی۔

وہ کیسے رک گیا۔ محبت نے پکارا تو نہیں تھا۔ اگر وہ ٹریفک سگنل ہوتی تو آگے بڑھنے والا بادامی برقعے کو دیکھ کر رک جاتا۔ اگر وہ کالے برقعے میں تھی۔ پھر جانے والے کے پیروں میں زنجیر کیسے پڑ گئی۔

پردے کا بھرم تھا' وہ برقعے سے باہر نہیں آئی۔ حیا کا پاس تھا۔ اس نے زبان نہیں کھولی۔ ویسے ٹریفک سگنل کی زبان نہیں ہوتی۔ سگنل کا اشارہ بڑھنے والوں کو روکتا ہے اور جانی نظریں جھکائے برقعے والی کے قدموں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فرزانہ کے ہاتھ سے پھول چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ کوئی اور پھول ہوتا تو جانی گزر جاتا مگر وہ گلاب کا پھول تھا۔ جس کی مخملی پتیاں ہمیشہ اس کے دماغ کی پچھلی سیٹ پر خوشبو لٹاتی رہتی تھیں۔

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ اس نے چور نظروں سے برقعے والی کو دیکھا' وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ جانی کے اندر ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ اسے مخاطب کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایک غیر عورت کو کسی بہانے سے کیا کہے؟ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس کا دماغ سمجھا رہا تھا۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جہاں گلاب ہو وہاں اس کی گلابوں والی بھی ہو۔ کسی عزت دار عورت سے بولو گے یا اسے بولنے پر مجبور کرو گے تو چاروں طرف سے جوتے پڑیں گے۔

اسے اسپتال کے اندر کتنے ہی جوتے' لاتیں اور گھونسے یاد آئے۔ حوالات کی آہنی سلاخیں نگاہوں کے سامنے آئیں۔ اس وقت اس نے سیاہ برقعے کے پیچھے ذرا دور

دیکھا۔ وہاں ایک پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ ویسے محبت کا جنون تھانے تو کیا تختہ دار تک بھی پہنچا دیتا ہے۔ وہ بولے بغیر نہ رہ سکا "آ... آپ برا نہ مانیں ... یہ پھول.. پھول آپ کا ہے؟"

وہ انگلی سے فرش پر پڑے ہوئے پھول کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ایک طویل مدت کے بعد وہ جانی کو مخاطب ہوتے دیکھ کر' اس کی آواز سن کر کتنے ہی جذبوں میں گرفتار ہو گئی۔ دل میں خوشی تھی' لبوں پر تبسم تھا۔ اور فطرت میں حیا تھی۔ وہ شرماتے لجاتے ہوئے دوسری طرف گھوم گئی۔

دوسری طرف کئی قدم کے فاصلے پر پولیس انسپکٹر تھا۔ جانی اس خوشی کو' لبوں کے تبسم کو اور شرمیلی محبوبہ کو برقعے کے اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ قانون کے محافظوں کو دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ برقعے والی پولیس والوں کو بلانا چاہتی ہو۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ تیزی سے چلتا ہوا ٹیکسی کی طرف جانے لگا۔ فرزانہ نے گھوم کر حیرانی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ نہ سمجھ سکی کہ جانی نے بات چھیڑی مگر پھر چھیڑ کر کیوں چلا گیا؟

بعض باتیں آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں مگر دکھائی نہیں دیتیں۔ جانی اس کی شرمیلی اداؤں کو نہ دیکھ سکا' نہ سمجھ سکا اور فرزانہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھ کر کیا غلطی کی تھی' وہ تعجب سے سوچتی ہی رہ گئی۔

وہ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھنے لگا۔ اس کی ساس نے کہا "بیٹا کہاں رہ گئے تھے؟ ہم کب سے انتظار کر رہے ہیں؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے گاڑی کو اسٹارٹ کیا پھر اسے آگے بڑھانے سے پہلے عقب نما آئینے کو درست کرتے ہوئے ایک طرف ذرا گھمایا۔ اسی وقت آئینے میں برقعے والی کا عکس اتر آیا۔ اب وہ پارکنگ ایریے کے قریب کھڑی ہوئی جانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کا ہاتھ آئینے پر سختی سے جم گیا۔ دل نے دھڑک دھڑک کر کہا "وہ فرزانہ ہے' مجھے دیکھ رہی ہے' مجھے اس کے پاس جانا چاہیے۔"

پچھلی سیٹ کی طرف سے عقب نما آئینے کا زاویہ کچھ اور تھا۔ وہاں سے برقع نظر نہیں آرہا تھا۔ ساس نے بڑے پیار سے پوچھا "بیٹا' آئینے میں کب تک دیکھتے رہو گے؟

گاڑی چلاؤ۔"

وہ ناگواری سے بولا "کیا بیٹی کے جاتے ہی آپ نے جاسوسی شروع کردی۔ میں آئینے میں کسی کو بھی دیکھوں، آپ پوچھنے والی کون ہوتی ہیں؟"

فرید احمد نے کہا "بیگم! جب تم دونوں کی بنتی نہیں ہے تو اپنی زبان بند رکھا کرو۔" پھر اس نے داماد کو پچکارتے ہوئے کہا "بیٹے آئینہ دیکھ رہے ہو تو کنگھی بھی کرلو۔"

جانی انجن بند کرکے گاڑی سے باہر آگیا۔ برقعے والی کے پاس جانے کا ارادہ تھا۔ اتنی دیر میں وہ پولیس انسپکٹر پھر دیوار بن گیا۔ وہ برقعے والی سے باتیں کررہا تھا۔ جانی بے بسی سے ادھر دیکھنے لگا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ انسپکٹر کے ساتھ جانے لگی۔

انسپکٹر نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "آپ درست کہتی ہیں۔ یہ رکشے ٹیکسی والے ائرپورٹ میں تگڑی سواریوں کے لیے آتے ہیں۔ غیر ملکیوں کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ان سے منہ مانگا کرایہ ملتا ہے۔"

فرزانہ نے کہا "میں اسی لیے اتنی دیر سے کھڑی ہوں۔ میٹر سے کچھ [illegible] دینے کو تیار ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ رکشے والے کا تو باپ بھی جائے گا۔ اے ادھر آؤ۔"

اس نے ایک رکشے والے کو آواز دی۔ آٹو رکشا فوراً قریب آگیا۔ انسپکٹر نے حکم دیا "خاتون کو لے جاؤ اور میٹر آن کرو۔ ایک پیسہ زیادہ نہ لینا۔"

فرزانہ انسپکٹر کی نظروں میں مشکوک بننا نہیں چاہتی تھی۔ مجبوراً اسے رکشے میں بیٹھنا پڑا۔ ادھر جانی نے فوراً بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ گیئر بدل کر اسے آگے بڑھایا۔ آٹو رکشا اس کے آگے چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے جانے کے لیے ٹیکسی کو انسپکٹر کے پاس سے گزرنا پڑا اس نے ہاتھ اٹھا کر گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ جانی نے دانت پیس کر سوچا کم بخت ایسے وقت کیوں روک رہا ہے؟ کیوں نہ اس کی پروا کیے بغیر گاڑی کو بھگانا شروع کردوں۔

لیکن برسوں سے گاڑی چلانے کا یہ تجربہ تھا کہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے طوعاً و کرہاً گاڑی روک دی۔ انسپکٹر نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے پوچھا "کیا تم لوگ یہاں مسافروں کو لوٹنے آتے ہو؟"

جانی نے حیرانی سے پوچھا "جناب! میرا کیا قصور ہے؟"

"قصور کے بچے! میٹر آن کیوں نہیں کیا؟ کیا سواری سے ڈبل کرایہ لوگے؟"

فرید احمد نے جلدی سے کہا "انسپکٹر! یہ ہماری اپنی گاڑی ہے۔ میٹر آن کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اوہ اچھا جائیے۔"

جانی نے کہا "سوچے سمجھے بغیر قصور کا بچہ کہنے کے بعد پھر سوچنے کہ بچہ کون ہے؟"

اس سے پہلے کہ انسپکٹر کچھ سمجھتا، کچھ بولتا جانی نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی پھر رفتار تیز کرتا چلا گیا۔ اسٹار گیٹ کے دوراہے پر رک کر دیکھنے لگا۔ ایک راستہ لانڈھی کی طرف اور دوسرا سوسائٹی اور صدر کی طرف جاتا ہے۔ دونوں طرف دور تک کئی آٹو رکشا نظر آئے۔ وہ ڈرگ روڈ پر چل پڑا۔ ٹیکسی کی رفتار بڑھاتا گیا۔ کتنے ہی رکشوں کو اوورٹیک کرتے وقت پچھلی سیٹ کی طرف دیکھتا گیا۔ وہ برقعے والی کسی رکشے میں نظر نہیں آرہی تھی۔

وہ جھلا کر بڑبڑایا "کمبخت چلی گئی۔ لعنت ہے۔"

ساس نے کہا "اے وہ گئی ہے تو جلدی واپس آئے گی۔ خود ہی رخصت کرکے آرہے ہو۔ خود ہی لعنت بھیج رہے ہو۔"

وہ چیخ کر بولا "بکواس مت کرو۔"

گاڑی سڑک کے کنارے رک گئی۔ اس نے پیچھے گھوم کر کہا "چلو گاڑی سے اترو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے تمہاری جیسی عورت کو تمہارا میاں ہی برداشت کرسکتا ہے۔"

فرید احمد نے کہا "میں برداشت کرہی رہا ہوں مگر ہمیں گاڑی سے نہ اتارو۔ ذرا اپنے بیٹے کو دیکھو ہم اس ننھے کو لے کر کب تک کسی دوسری گاڑی کے انتظار میں کھڑے رہیں گے۔"

جانی نے اپنے بیٹے کو دیکھا کچھ سوچا پھر انجن کو بند کردیا۔ فرید احمد نے پوچھا "گاڑی کیوں بند کردی؟"

"خراب ہوگئی ہے دھکا لگانا ہوگا۔"

دھکا لگاؤ۔"

ساس نے کہا "میں خوب سمجھتی ہوں۔ اس رات کی طرح تم ہمیں چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔"

"تم سے شیطان بھی نہیں بھاگ سکتا۔ میں کہاں بھاگ کر جاؤں گا۔ چلو اترو۔"

"جانی، ہمیں گھر پہنچا دو۔ نہیں تو میں بچے کو لے کر اتر جاؤں گی۔"

فرید احمد خوشامدیں کرنے لگا۔ اسی وقت بچے نے رونا شروع کر دیا۔ محترمہ کو ایک تدبیر سوجھی، انہوں نے کہا "کیا مصیبت ہے۔ فیڈر کا سارا دودھ ختم ہو گیا ہے۔ گھر جلدی نہ پہنچے تو یہ بھوک سے بلکتا ہی رہے گا۔"

جانی نے بے بسی سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ شکست خوردہ انداز سے ایک گہری سانس لی پھر انجن کو اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ دل سے آہ نکل رہی تھی۔ آہ! بجلی بھی بادلوں میں یوں نہ چھپتی ہو گی۔ جیسے تم جھلک دکھا کر چھپ جاتی ہو۔ فرزانہ نہ چھپو میری ہائے تم پر پڑے گی آ جاؤ۔

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے کھڑکی کے باہر گزرنے والے کسی رکشے کو دیکھ لیتا تھا۔ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ بے چینی سے سیٹ پر پہلو بدلنے لگا۔

"دراصل میں اُلّو کا پٹھا ہوں۔ مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ وہی ہے۔ برقع بدل گیا ہے۔ ٹھیک ہے اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا، مجھ سے منہ پھیر لیا۔ شاید ناراض ہو گی۔ شاید ادا ہو گی مگر میرے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ میں سچ مچ ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ راستے کو پہچانتا ہوں مسافروں کو پہچاننا نہیں آتا۔"

اس کے اندر بے چینی تھی۔ اسے چھپنے والی سے شکایت تھی۔ اپنی بد قسمتی اور محرومی پر غصہ آ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کسی رکشے سے ٹیکسی کو ٹکرا دے۔ دنیا والوں کو کیا معلوم کہ یہ ڈرائیور لوگ محرومیوں کے کچے راستوں سے گزرتے ہیں۔ جھنجلاہٹوں کے پکے راستوں پر چلے جاتے ہیں۔ وہ گیئر بدل کر احساس برتری کے اونچے راستے پر آتے ہیں پھر وہ راستہ انہیں احساس کمتری کے نشیب میں اتار دیتا ہے۔ یہ لوگ انسان کی حیثیت سے پہچانے نہیں جاتے۔ ہر اسٹاپ، ہر راستے اور ہر گلی کے لوگ انہیں گاڑی کھینچنے والی کوئی مخلوق سمجھتے ہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہ ڈرائیور کہیں باہر

سے نہیں آتے۔ ہمارے ہی درمیان ہمارے معاشرے اور ماحول میں رہ کر نفسیاتی مریض بنتے ہیں اور اپنے پرائے کو حادثوں تک پہنچاتے ہیں۔

وہ انتقاماً کسی رکشے سے ٹیکسی کو ٹکرا دینا چاہتا تھا۔ اپنے نقصان کی پروا نہیں تھی۔ پیچھے بیٹھا ہوا سسر مر جائے، وہ عورت بھی مر جائے جو کبھی ماں نہ بن سکی۔ ہمیشہ ساس کی طرح سازشی رہی۔ بچہ بھوک سے رونے لگا۔ وہ پچھلی سیٹ پر نانی کی گود میں رو رہا تھا لیکن اس کی آواز جانی کے اندر سے اٹھ رہی تھی۔ وہ پھر بے چین ہو گیا کیونکہ وہ باہر سے کسی حادثے کا ملزم ہو سکتا تھا۔ اندر اپنی محبت کو کسی سے ٹکرا نہیں سکتا تھا۔

انتقامی جذبہ دھواں بن کر اڑ گیا۔ بچے کو جلد سے جلد گھر پہنچانا تھا۔ بچہ ہو یا بوڑھا زندگی کو دودھ پلانا تھا۔ ہر آدمی اپنے اندر ایک ضدی بچہ رکھتا ہے۔ کامران کی آنسو بھری آواز نے محبت کا جھنجھنا بجایا تو جانی ایک بچے کی طرح ضد بھول کر بہل گیا۔

ویسے یہ اندر کی تبدیلی تھی۔ ایک نفسیاتی مریض کو صرف اپنے اندر سے اور اپنے گھر سے ہی نہیں بلکہ باہر سے بھی محبت ملنی چاہیے۔ ابھی جانی کی بے چینی نہیں گئی تھی۔ باہر سے انسپکٹر اسے قصور کا بچہ کہہ رہا تھا۔ ساس اس پر بھونک رہی تھی۔ بیوی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ محبوبہ چرکے لگا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت اسے رخسانہ کی ایک بات یاد آ گئی۔

ایک بار رخسانہ نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا تھا "جانی! جانی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھنجلایا نہ کرو۔ یہ سوچو کہ تم راستوں کی چھوٹی چھوٹی سی ٹوٹ پھوٹ سے کس طرح کترا کر اپنی گاڑی کو حفاظت سے نکال لے جاتے ہو۔ اسے اچھے راستے پر چلاتے ہو۔ اسی طرح الجھانے والی باتوں سے کترا جایا کرو۔ اپنے دماغ کو سوچنے کے لیے کسی اچھے راستے پر لگا دو۔"

جانی! انسان ہو، کسی انسان کو معاف کرنے کا حوصلہ پیدا کرو۔ یہ سب سے بڑی انسانی دلیری ہے۔

ڈرائیور ہو سواری کو حادثے سے بچا کر منزل تک پہنچاؤ۔ سمجھو کہ سواری محترم ہوتی ہے۔

تم صاحب بصیرت ہو گے تو جھنجلاہٹ کبھی قریب نہیں آئے گی اور اگر صاحب

بصارت ہو تو اپنی آنکھ کے سامنے کسی بھی معمولی پھیکے سے نظارے میں حُسن تلاش کرو۔ پتا چلے گا کہ حُسن ہر جگہ ہے صرف حُسنِ نظر چاہیے۔

اپنی جھنجلاہٹ کو ختم کرنے کی ایک اور تدبیر ہے۔ تم کسی بھی خوب صورت چیز کا تصور کرو اور اس خوب صورتی سے خود کو منسوب کرتے رہو' ہاں کرو۔ کسی خوب صورتی کا تصور کرو اور خود کو اس سے وابستہ کرو جانی!

رخسانہ کی باتیں یاد آتے ہی جانی نے اس کا تصور کیا مگر آدھا چہرہ تھا۔ خوب صورتی کے ٹکڑے ہو گئے تھے۔

پھر ایک تصور میں فرزانہ کو دیکھا مگر اس کی صورت ذرا دھندلا گئی تھی۔ اسے دیکھے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ رخسانہ کے ٹوٹے ہوئے آئینے میں جھانکتے رہنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ اب کوئی عکس مکمل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ فرزانہ کا تصور ٹوٹتا نہیں تھا۔ دھندلا جاتا تھا۔

تب اسے گلاب کا پھول یاد آیا۔ دور تک دماغ کی سیج پر پنکھڑیاں بکھر گئیں۔ پھول کی خوب صورتی سے جیسے اس کا ازلی رشتہ تھا۔ اس کی بے چینی اور جھنجلاہٹ ختم ہونے لگی۔ گلاب کی پتیاں معطر یادوں کو ڈھونڈ کر لانے لگیں۔ وہ بے اختیار مسکراتا اور گنگناتا ہوا ناظم آباد والے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔

ساس اور سسر گاڑی سے اتر گئے۔ اس نے باہر آکر بیٹے کو گود میں لیا' اسے پیار کیا۔ فرید احمد نے کہا "اندر چلو' اب رات کا کھانا کھا کر جانا۔"

وہ نرمی سے بولا "آج نہیں' کل سے تینوں وقت کھایا کروں گا۔"

پھر اس نے بچے کو چوم کر ساس کی گود میں دیتے ہوئے کہا "امی میں بہت نالائق ہوں۔ میں نے راستے میں بدتمیزی کی ہے' مجھے معاف کر دیجیے۔"

وہ حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے پھر جبراً مسکراتے ہوئے بولیں "میں نے معاف کیا' میرے خدا نے معاف کیا۔ تم بہت اچھے ہو۔"

وہ پھر بچے کو چومنے کے لیے جھکا تو ساس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں اور پھر دعائیں دیتی چلی گئیں۔ جانی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ پھر بھی وہ کچھ پڑھ پڑھ کر ادھر پھونکتی رہیں۔ فرید احمد نے کہا "بس کرو' محلے والے جمع ہو جائیں گے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں "یہ لڑکا سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک منٹ میں گاڑی سے اتار رہا تھا' ایک منٹ میں مسکراتے گنگناتے ہوئے یہاں پہنچا دیا۔ کبھی آنکھیں دکھاتا ہے' کبھی سر جھکا کر دعائیں لیتا ہے۔ کبھی تم کہتا ہے' کبھی آپ کہتا ہے' ضرور اس پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔"

"ضرور۔" فرید احمد نے اپنی بیگم کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا "میرا تجربہ بھی یہی کہتا ہے' اندر چلو۔"

وہ پلٹ کر مکان کے احاطے میں داخل ہو گئے۔

جانی نے ایک سواری کو کریم آباد پہنچایا۔ دوسری سواری کو صدر لے گیا۔ آج وہ گاڑی نہیں چلانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف فرزانہ پر غصہ آرہا تھا۔ اس نے سوچا' کوئی سواری نئی حسن کی طرف جانے والی ہوگی تو اسی بہانے گھر پہنچ کر گاڑی بند کر دے گا لیکن صدر میں نثار ڈرائیور مل گیا۔ اس نے پوچھا "کیا اپنی گھر والی کو رخصت کر دیا؟"

"ہاں یار! اس کے جانے کے بعد کچھ خالی خالی سا لگ رہا ہوں۔"

"چلو میرے ساتھ' آج ہم تنہائی کا غم غلط کریں گے۔"

وہ گرومندر کے شراب خانے میں آکر بیٹھ گئے۔ نثار نے دو گلاس اور ایک اَدھا لانے کو کہا۔ جانی نے پوچھا "سنا ہے تیری بیوی چلی گئی ہے؟"

نثار نے پوچھا "تم یہ بتاؤ عورت کو کیا سمجھتے ہو؟"

جانی نے کچھ سوچ کر کہا "عورت مل جائے تو اسے اپنے پیچھے بھگاتے ہیں۔ نہ ملے تو ہم اس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔"

"یہ تو ہم مردوں کی بات ہوئی' میں عورت کی بات پوچھ رہا ہوں۔"

"میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے' دو ہی عورتوں کو دیکھا ہے۔ ایک وہ جسے اب تک نہ پا سکا اور دوسری وہ جسے پا چکا ہوں۔"

گلاس آگئے' بوتلیں کھل گئیں۔ شراب اور سوڈے کی آمیزش سے گلاس بھر گئے۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی' وہ اپنی اپنی جگہ سوچتے ہوئے پیتے رہے۔ پھر نثار نے کہا "میں سیدھی سی بات پوچھتا ہوں' کیا اپنی گھر والی پر بھروسا کرنا چاہیے؟"

جانی نے گلاس خالی کیا پھر دوبارہ اسے بھرتے ہوئے کہا "بے شک! میری بیوی اتنی

سمجھ دار، اتنی وفادار ہے کہ میں آنکھ بند کر کے اس پر بھروسا کرتا ہوں۔"

"یہی تو ہماری حماقت ہے۔ ہم آنکھ بند کر کے بھروسا کرتے ہیں۔ آخر میں ہماری آنکھ کھل جاتی ہے۔"

جانی کو یوں لگا جیسے یہ بات رخسانہ کے خلاف بولی جا رہی ہو۔ اس نے ناگواری سے پوچھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

وہ سر جھکا کر بڑے دکھ سے بولا "جانی! تم نے ٹھیک سنا ہے، میری بیوی کہیں چلی گئی ہے۔"

"تمہارا قصور ہوگا۔"

"نہیں، میں اسے اچھا کھلاتا تھا، اچھا پہناتا تھا۔ اس کا ہر شوق پورا کرتا تھا مگر عورت ذات حسین ہو تو اپنے مرد سے تعریفیں سن کر مطمئن نہیں ہوتی۔ چاہتی ہے کہ دوسرے بھی تعریفیں کریں۔ کوئی اس کی تعریف کرتا کرتا اسے اپنے ساتھ لے گیا۔"

"خدا کا شکر ہے، میری رخسانہ ایسی نہیں ہے۔"

اس نے گلاس کو منہ سے لگایا۔ نثار نے کہا "میں ایسی بیویوں کی بات کر رہا ہوں جو حسین ہوتی ہیں۔"

جانی نے ایک جھٹکے سے گلاس کو میز پر رکھتے ہوئے پوچھا "کیا میری رخسانہ حسین نہیں ہے؟ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔"

"چھوڑو یار، ہمیں لڑائی جھگڑے والی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

"تم میری بیوی کی بے عزتی کر کے بولتے ہو کہ چھوڑو۔ کیوں چھوڑوں کیا اس لیے کہ تم مجھے پلا رہے ہو؟"

اس نے جیب سے ایک دس اور پانچ کا نوٹ نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا "یہ تمہارے ادھے کی قیمت ہے۔ اب میری رخسانہ کے خلاف بول کر دکھاؤ۔"

اس کے دانت پر دانت جمے ہوئے تھے۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ جیسے گھونسا مارنے کے لیے تیار بیٹھا ہو۔ نثار نے اپنی پیشانی پر ہاتھ لے جا کر سلام کرتے ہوئے کہا "مجھے معاف کرو میرے باپ! میں کہنا کچھ چاہتا تھا کہہ کچھ اور گیا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے تھے؟"

"وہ..... یہ..... یہ..... کہ ہماری بھابی صاحبہ بے شک حسین ہیں مگر ابھی تو آدھی ہیں پوری بننے گئی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے، وہ مکمل حسین بن کر تیری حسین بیوی کی طرح بے وفائی کرے گی۔ کیا دنیا کی تمام حسین عورتیں بے وفا ہوتی ہیں؟"

"خدایا میں کہاں پھنس گیا؟ جانی! تجھے تیری بیوی سے سچا پیار ہے۔ تجھے تیری بیوی کی، تیرے پیار کی قسم مجھے معاف کر دے۔ جھگڑا ختم کر دے۔ ہم دوسری بات کریں گے۔"

جانی نے دوسرا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا "کوئی دوسری بات نہیں ہوگی۔ رخسانہ مجھے چھوڑ کر گئی ہے اور تم مجھے بہکا رہے ہو۔"

وہ تیسری بار گلاس بھرنے لگا۔ نثار نے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک دم سے چونک کر کہا "ارے میں تو تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ آج میں نے ایک لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا تھا اس کی ایک ساتھی اسے فرزانہ کہہ رہی تھی۔"

"فرزانہ؟" وہ گھور کر بولا "اس کا نام مت لو میرے سامنے۔"

وہ غٹاغٹ پینے لگا۔ نثار نے پریشان ہو کر پوچھا "مگر تم تو اس کے پیچھے بھاگتے ہو؟"

"آج سے بھاگنا بند۔ اے موٹو ایک ادھا اور لاؤ۔" وہ مکرانی سے بولا "اور وہ مسالے دار جھینگے بھی لاؤ۔ ہاں تم کیا کہہ رہے تھے؟"

نثار نے کہا "میں کہہ رہا تھا آج میں نے فرزانہ کو.....

"دیکھا ہے۔" جانی نے بات پوری کی "میں نے بھی دیکھا ہے۔ میں جب بھی دیکھتا ہوں، وہ دن میں تارے دکھا کر چلی جاتی ہے۔ میں اس کو بہت تگڑی سی گالی دینا چاہتا ہوں مگر دیکھو گالی دینا بری بات ہے۔ ہم اس زبان سے اللہ اللہ کرتے ہیں۔ شراب بھی نہیں پینا چاہیے۔ میں گھر جا کر کلی کر لوں گا۔"

ایک ادھا اور آگیا۔ نثار نے بل ادا کرتے ہوئے کہا "جانی بس کر تجھے نشہ ہو رہا ہے۔"

جانی نے ہنستے ہوئے کہا "نشہ شراب میں ہوتا تو ناچتی بوتل۔ جب بوتل نہیں ناچتی

ہے تو کیا میں تجھے ناچتا ہوا نظر آرہا ہوں؟"

اس نے بوتل کھولی پھر میز پر جھک کر گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے نثار کو اشارہ کیا۔ اپنی طرف بلایا۔ نثار میز پر اس کی طرف جھک گیا۔ جانی نے کہا "مجھے فرزانہ سے نفرت ہے۔ میں نہیں پوچھوں گا کہ تم نے اسے کہاں دیکھا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" نثار سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ جانی نے کئی گھونٹ پینے کے بعد آستین سے منہ پونچھا پھر میز پر جھک کر "شش شش" کہتے ہوئے اشارے سے نثار کو قریب بلایا۔ نثار نے اس کی طرف جھک کر کہا "ہاں بولو۔"

"میں نہیں بولوں گا۔" جانی نے رازدارانہ انداز میں دھیرے سے کہا "تم بولتے جاؤ' اسے کہاں دیکھا تھا۔ میں بالکل نہیں سنوں گا' مجھے اس سے نفرت ہے مگر تم کو تو نفرت نہیں ہے' تم بول سکتے ہو۔ قسم سے میں نہیں سنوں گا۔"

"یار بس کرو۔ بوتل رکھ لو۔ گھر جا کے پی لینا۔"

اس نے چوتھا گلاس خالی کر دیا۔ نثار نے گھبرا کر کہا "باپ رے' تم آدمی ہو یا کنستر؟ بھرتے چلے جا رہے ہو۔"

"میں نے کہا نا کہ اس کی بات کرو جو ستاتی ہے بھگاتی ہے تم بولو' میں کان بند کرلوں گا۔"

اس نے ایک ہاتھ سے ایک کان کو بند کرلیا۔ دوسرا ہاتھ بوتل کی طرف بڑھایا۔ نثار نے جھپٹ کر بوتل کو اٹھالیا پھر اسے بند کرتے ہوئے کہا "یہاں سے چلو میں ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کی بات کروں گا۔"

"چلو۔" وہ جھومتے ہوئے اٹھ گیا۔ نثار کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ڈگمگاتے ہوئے باہر آیا۔ مکرانی جھینگے لے کر آرہا تھا۔ جانی نے بہکتے ہوئے ہاتھ سے پانچ کا نوٹ نکال کر مکرانی کے سر پر نچھاور کرتے ہوئے کہا "یہ پیسے لو اور جھینگے اپنے باپ کو کھلا دو۔"

نثار اسے کھینچتے ہوئے ٹیکسی کے دروازے تک لایا۔ "یار تھوڑا لیموچوس لے نشہ اتر جائے گا۔"

جانی نے اس کے ہاتھ سے بوتل چھین کر اسے دھکا دیا۔ پھر دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نثار نے کہا "تم اس حالت میں گاڑی چلاؤ گے اور میں بیٹھوں گا۔ ابھی

مجھے مرنا نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ میرے پیچھے بیٹھ کر اس کی بات کرو۔ میں نہیں سنوں گا گاڑی چلاتا رہوں گا۔"

نثار نے پہلے اگلے دروازے کو بند کیا۔ کچھ سوچتا ہوا پچھلے دروازے کے پاس آیا۔ اسے اپنی جان پیاری تھی۔ اس نے پچھلے دروازے کو کھولا پھر زوردار آواز کے ساتھ بند کردیا۔ جانی نے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی پھر دھیرے دھیرے رفتار بڑھانے لگا۔

ٹیکسی کے اندر خاموشی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ اس کے کان نثار کی زبان سے فرزانہ کا ذکر سننے کے منتظر تھے مگر ٹیکسی میں خاموشی طاری تھی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ بولا "تم اس قدر دھیمی آواز میں کیوں بول رہے ہو۔ زور سے بولو۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں نہیں سنوں گا۔"

گاڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ اور اسے ونڈ اسکرین کے پار فرزانہ کا دھندلا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تصور سے بہلنے لگا تھا۔ نثار کو بھولنے لگا۔ جسے بھولنا چاہا تھا' اسے یاد کرنے لگا۔ محبت کبھی چڑیل بن جاتی ہے' یادوں کے تیز ناخنوں سے نوچنے کھسوٹنے لگتی ہے۔

وہ بڑبڑانے لگا "دیکھ فرزانہ! آج بہت ہو گیا۔ موت ایک بار آتی ہے۔ تو بار بار آ کے مارتی ہے۔ کیا دشمنی ہے مجھ سے؟ زندگی ایک بار ملتی ہے تو ایک بار بھی نہیں ملتی کیسی دوستی ہے مجھ سے؟"

اس کے کانوں میں فرزانہ کی ہنسی گنگنائی۔ پہلی بار جب وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ تب جانی نے وہ ہنسی سنی تھی۔ آج جیسے وہ صدیوں کے بعد پھر اپنی ہنسی کا ترنم سنا رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی گاڑی کو سڑک کے کنارے روک کے پیچھے دیکھا۔

پچھلی سیٹ انتظار بھری آنکھوں کی طرح اس کے جلوے سے خالی تھی۔ نہ پھولوں کی پتیاں تھیں' نہ ہنسی نہ خوشبو۔ بس ایک ستانے والا خیال تھا۔ اس نے بوتل کھول کر منہ کو لگالی۔

کتنا ہی وقت گزر گیا جب وہ اپنے گھر کے احاطے میں پہنچا تو ہوش میں نہیں تھا۔

شرابی خواہ کتنا ہی مدہوش ہو' وہ اپنے گھر تک ضرور پہنچتا ہے۔ دوسری صبح نشہ اترنے کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہاں کہاں سے گزرتا ہوا کیسے اپنے بستر تک پہنچ گیا تھا۔ جب وہ ٹیکسی سے باہر آیا تو زمین پر پاؤں جما کر کھڑے رہنے کے قابل نہیں تھا۔ تھوڑی دیر تک کھلے ہوئے دروازے کا سہارا لیے کھڑا رہا۔

مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھا۔ کئی بار گرتے گرتے سنبھلتا ہوا برآمدے کے زینے تک پہنچا۔ آگے راہداری کے ایک طرف کمرا تھا۔ دوسری طرف باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ وہیں ایک دیوار کے ساتھ ایک پرچھائیں تھی اور جیسے اس پرچھائیں کے بدن سے گلاب کی خوشبو پھوٹ کر جانی کی طرف آرہی تھی۔

وہ برآمدے میں پہنچ گیا۔ شراب کی بدبو اتنی تیز تھی کہ وہ خوشبو کو سونگھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ دیوار کے سہارے آگے بڑھتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ اس کی زبان چپ نہیں تھی۔ وہ بول رہا تھا اور خود نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس نے چابی کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا' ذرا ڈگمگایا' ذرا بڑبڑایا پھر چابی نکال لی۔ تالا نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک ہاتھ سے ٹٹول کر کسی طرح تالے کو بھی پکڑ لیا مگر چابی والا ہاتھ بہکنے لگا۔

اس نے کئی بار کوشش کی' چابی تالے میں نہیں جارہی تھی۔ اس نے اندھیرے میں چابی کو گھورتے ہوئے کہا "الو کی پٹھی! نشہ ہورہا ہے' بہک رہی ہے۔"

اچانک ہی دو ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ وہ نرم نرم گرم گرم ہاتھ تھے' دست گل کی طرح ملائم تھے۔ وہ بڑبڑایا "کون ہے؟ ایں؟"

ان ہاتھوں نے چابی لے لی۔ تاریکی میں اسے سہارا دے کر دیوار سے لگا کر کھڑا کردیا۔ تالا کھل گیا پھر دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ ہاتھ نچاتے ہوئے تاریکی کو دیکھتے ہوئے بولا "ارے تم بھی آگئی ہو اب میں الو نہیں بنوں گا۔ بھاگنے سے پہلے پکڑلوں گا۔"

وہ پکڑنے سے پہلے دونوں ہاتھ بڑھا کر آگے آیا اور لڑکھڑاتا ہوا کھلے ہوئے دروازے سے اندر پہنچ گیا۔ ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ کمرا روشن ہوگیا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اس نے پہلے آنکھیں بند کیں پھر پلٹ کر آدھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ فریب دینے والی نظر آرہی تھی اور وہ فریب نظر بھی ہوسکتا تھا۔

اس نے سر کو جھٹکا۔ جیسے خیالوں میں آنے والی کو دماغ سے نکال رہا ہو۔ اس نے آنکھیں مل مل کر خواب اور حقیقت کو سمجھنا چاہا۔ نشے میں سمجھنے والی عقل کہاں ہوتی ہے؟ وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا "اے بچی بتاؤ' تم میرے سامنے ہو؟"

اس نے جواباً ہاں کے انداز میں سر کو ہلایا۔

وہ گھونسا دکھا کر بولا "جھوٹ بولتی ہو۔ اگر تم ہو تو برقع کہاں ہے؟"

"چاند بادل میں' خوشبو پھول میں اور محبت برقعے میں چھپ کر نہیں رہ سکتی۔"

وہ ڈگمگاتے ہوئے دروازے کے پاس آیا۔ ایک دھڑاکے سے اس کے دونوں پٹ بند کیے۔ بہکتے ہوئے ہاتھ سے چٹخنی چڑھائی پھر پلٹ کر دروازے سے لگ کر بولا "میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گا۔"

وہ آگے بڑھ کر لڑکھڑایا "میں تمہیں چھو کر دیکھوں گا۔"

گورا گورا گلابی ہاتھ سوئچ بورڈ کی طرف گیا۔ یک بیک کمرے میں گہری تاریکی چھاگئی۔ وہ ہڑبڑا کر بولا "اے بھاگ رہی ہے خبردار' جانے نہ پائے۔"

وہ پلٹ کر دروازے کی طرف گیا۔ کچھ زیادہ ہی پلٹ گیا۔ اندھیرے میں دروازہ نہیں ملا' وہ مل گئی۔ جیسے چور کو پکڑتے ہیں' ویسے ہی جانی نے اسے جکڑ لیا۔ اسے دونوں ہاتھوں سے پاکر دونوں ہاتھوں سے ڈھونڈنے لگا۔ وہ بار بار اس کے ہاتھوں کو پکڑنے لگی۔ جو فراق نصیبی کا صور پھونکتی رہی تھی وہ سرگوشی کے سر پھونکنے لگی۔ "جانی! میں نہیں جاؤں گی۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر تمہیں اندھیروں سے نکالنے آئی ہوں۔"

"اندھیرا کر کے بولتی ہو نکالنے آئی ہو۔ میں تم کو نکلنے نہیں دوں گا۔ تمہارا منہ کدھر ہے' ہاں یہ ادھر ہے۔ اس کو برقعے میں چھپاتی تھیں' اب بھی چھپا رہی ہو۔ یہ برقع کتنا کالا ہے۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اے منہ کھولو......"

وہ منہ کھولنا چاہتی تھی' کچھ بولنا چاہتی تھی۔ بول نہ سکی شراب کی بو اتنی تیز' اتنی سنگدل تھی کہ بولنے کی سکت مجروح ہورہی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے کانپتے ہوئے بڑی مشکلوں سے سانسوں کو درست کرتے ہوئے بولی "میں تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اندھیرا بھی مصیبت بن گیا ہے۔"

"میں مصیبت نہیں ہوں' تم مصیبت ہو۔ مل کے بھی نظر نہیں آتی ہو۔ ابھی ہوتی

ہو' ابھی نہیں ہوتی ہو۔ کہاں ہو؟ پھر کہاں چلی گئیں؟"

وہ پھر گم ہو گئی۔ وہ تلاش میں بھٹکنے لگا۔ تاریکی میں در و دیوار ٹکرانے لگا۔ کیا وہ چھلاوا تھی؟ چھل دے گئی۔ کیا شعبدہ باز تھی۔ اندھی قربت کے شعبدے دکھا گئی یا چٹکی بھر وصال تھی اندھیرے میں جگنو کی طرح جل بجھی تھی۔

پھر کلک کی آواز ہوئی اور کمرا روشن ہو گیا۔ جانی نے آنکھیں میچ کر ذرا سا کھولیں' وہ سوئچ بورڈ کے پاس نظر آئی۔ نظارہ بے ہوش و حواس تھا' یہ مدہوشی اسے جگہ جگہ دکھا رہی تھی۔ جانی کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ جھومتے ہوئے بولا "تم سمجھتی ہو' میں نشے میں ہوں' نہیں' ہرگز نہیں میں ہوش میں ہوں۔ سب سمجھتا ہوں۔ تم نہیں ہو۔ بجلی جاتی ہے تو اندھیرا' بجلی آتی ہے تو اجالا۔ تم اندھیرا بھی نہیں ہو' اجالا بھی نہیں ہو۔ آنکھ کا دھوکا بن کر آتی ہو۔ بھاگ جاؤ میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا....."

وہ اس کی طرف سے پلٹ کر بری طرح لڑکھڑاتے ہوئے گر پڑا۔ یوں گرا کہ آدھا بستر پر پہنچ گیا۔ اس کے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ کبھی وہ کراہ رہا تھا' کبھی کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ قریب آ گئی۔ بستر کے سرے پر جھک کر بولی "شراب تمہیں بہکا رہی ہے' بیوی تمہیں بھٹکا رہی ہے۔ تم کب ہوش میں آؤ گے۔ مجھے بتاؤ' یہ نشہ کتنی دیر میں اترے گا۔ میں صبح ہوتے ہی چلی جاؤں گی۔ جانے سے پہلے تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں کہ تمہارے ساتھ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ میں نے تمہارے اس گھر کو رخسانہ کے ساتھ بسایا تھا۔ میں نے دھوکا دے کر بسایا۔ پھر بھی نیکی کی۔ مگر بسے ہوئے گھر کو گھر والی اجاڑ رہی ہے۔ اور میری نیکی برباد کر رہی ہے۔"

وہ پاس بیٹھ کر اسے جھنجوڑنے لگی "کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟ خدا کے لیے ہوش میں آؤ۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ مجھے ایسا چھلنی کر رہا ہے کہ میں لڑکی ہو کر تن تنہا اتنی رات کو آ گئی ہوں۔ بلا سے میں بے حیا' بد چلن کہلاؤں۔ وہ تمہیں دھوکا دے کر جانی والی تم سے صرف رشتے کا بھرم رکھتی ہے۔ میں اپنے ضمیر کی شرم رکھنے آئی ہوں' میری بات سنو' ہوش میں آؤ۔"

اس کے جسم میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تیز روشنی میں دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ آنکھیں خمار سے بوجھل تھیں' بند ہونے لگیں۔ اس کے کانوں

میں آواز آئی "جانی! میں یہاں ہوں۔ ادھر دیکھو۔"

وہ کہنیوں کے بل ذرا سا اٹھا' سر کو اوپر اٹھایا۔ جیسے آنے والی آواز کو آسمان سے اترتے سن رہا ہو۔ "اللہ! میرے اللہ وہ ملتی نہیں ہے تو اس کی آواز کیوں سنائی دیتی ہے؟ تو مجھے مار دے' اس کی آواز مر جائے گی۔"

اس کے لہجے میں ایسا کرب تھا' ایسی تڑپ تھی کہ وہ سن کر تڑپ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں نے تم پر ظلم کیا ہے' مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ رخسانہ سے نیکی کروں گی تو تم سے برائی ہو گی' اٹھو جانی' مجھے سزا دو۔"

وہ کہنیوں کے بل اٹھا ہوا' رونے کی آواز سن رہا تھا۔ پھر رینگتے ہوئے بستر پر اوندھا ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک روتی رہی انتظار کرتی رہی کہ شاید وہ اٹھے گا پھر وہ آنسو پونچھتے ہوئے خود اٹھ گئی۔ اس کے پاؤں سے جوتے اتارنے لگی۔ تب اس نے سوچا "میں بھی عجیب ہوں۔ جانی کے سامنے بدحواس ہو گئی۔ ایک ڈاکٹر ہو کر یہ نہ سمجھ سکی کہ کھٹائی کھلانے یا پلانے سے نشہ اتر جاتا ہے۔"

اس نے فوراً ہی اٹھ کر جانی کی جیبیں ٹٹولیں' چابیوں کا گچھا نکالا پھر تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر آئی۔ راہداری کا سوئچ آن کیا۔ پہلے ایک چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ اسٹور روم ہے۔ دوسرا دروازہ کھولا تو وہ باورچی خانہ تھا۔ رخسانہ بڑی نفاست پسند تھی۔ رہائشی کمرے کی طرح باورچی خانہ بھی صاف ستھرا تھا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ وہ وہاں رکھے ڈبے' شیشی اور بوتلوں کو کھول کر کوئی کھٹی چیز تلاش کرنے لگی۔ ذرا سی دیر میں باورچی خانے کا تمام سامان الٹ پلٹ ہو کر رہ گیا مگر اچار' املی' لیمو یا سرکہ وغیرہ نہیں ملا۔ وہ تھک ہار کر ایک دیوار سے لگ کر سوچنے لگی۔

سوچنے سے کیا ہوتا ہے' آدھی رات گزر چکی ہے۔ شہر کی دکانیں بند ہو چکی تھیں' کھلی ہوتیں تب بھی وہ اتنی رات کو اکیلی نہیں جا سکتی تھی۔ تہذیب تمام ارتقا اور ارتقاع کے باوجود اتنی معتبر نہیں ہے کہ جوان لڑکی رات گئے گھر سے نکل سکے۔ اسی لیے وہ سرِشام ایئرپورٹ سے سیدھی وہاں آ گئی تھی اور راہداری کے دور افتادہ حصے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ جانی نے بڑا انتظار کرایا تھا۔ آدھی رات کو آیا تھا اور نہ آنے کے برابر تھا۔

اس نے دروازے پر تالا لگا دیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے کی طرف آئی۔ رات کے سناٹے میں جانی کے خراٹے گونج رہے تھے' ہائے وہ تو سو گیا۔ وہ دہلیز پر پہنچ کر دروازے کے ایک پٹ سے لپٹ گئی۔ میری حسرتو! آؤ تم سے ہی لپٹ جاؤں اس مسافر کا نصیب کیا ہوگا جو آبلہ پا ہو کر پہنچے تو منزل مقصود کی آنکھ لگ چکی ہو۔

تو نہ ملے تو ترا آستاں ملے۔ وہ آستان سے لپٹی کھڑی رہی پھر خیال آیا کہ کھلے ہوئے دروازے سے روشنی باہر جا رہی ہے۔ اس کا سایہ بھی دور تک ہے۔ نائٹ چوکیدار نے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟

اس نے دروازے کو بند کر دیا۔ وہ قید ہو گئی تھی۔ صبح سے پہلے واپس نہیں جا سکتی تھی۔ ایک امید تھی۔ شاید جانی کی آنکھ کھل جائے لیکن اسے معلوم تھا کہ نیند کبھی بے وقت ٹوٹ جاتی ہے' نشہ وقت سے پہلے نہیں ٹوٹتا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ وہاں صبح تک وقت گزارنا تھا۔ کچھ سوچنا تھا' کچھ سہم سہم کر رہنا تھا۔ وہ ڈرنے لگی کہ وہ اٹھ کر آئے گا' وہ دعا کرنے لگی کہ آ جائے۔

تب اس تاریکی اور خاموشی میں جانی کی آواز سنائی دی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟ وہ تجسس کے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھی' اندازے سے وہاں تک پہنچی۔ خراٹے بند ہو گئے تھے کچھ اور طرح کی کراہتی ہوئی بڑبڑاہٹ تھی۔ وہ آواز کے قریب جھک گئی۔ اندھیرا بول رہا تھا "فر.... زا... آں.... ہوں.... اوں...."

وہ خوش ہو کر اسے جھنجوڑتے ہوئے بولی "ہاں... میں ہوں۔ پھر مجھے پکارو۔ آنکھیں کھولو۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ میری آواز سنو۔"

وہ بول رہا تھا۔ سن رہا تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ لی۔ وہ کروٹ تلے آ گئی۔ چراغ تلے اندھیرا ہو تا گیا مگر روشنی تھی' چراغ کو نیند آ گئی تھی۔ عجیب نیند اور رت جگے کی ملاقات تھی وہ۔

آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی کے راستے کمرے میں دھوپ آ رہی تھی۔ وہ اوندھے منہ پڑا رہا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے آواز دی "رخسانہ!"

جواب نہیں ملا۔ اچانک یاد آیا کہ بیوی میں ہے۔ بچہ بھی نہیں ہے۔ سر پر رہنے والی ساس بھی نہیں ہے۔ کمرے میں دھوپ کو دیکھ کر سوال پیدا ہوا کھڑکی کس نے کھولی ہے؟

اس نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا' وہ بند تھا مگر اندر سے چٹخنی نہیں لگی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ "میں رات کو کب آیا؟ میں نے دروازہ کیسے کھولا؟ کوئی رات کو میرے ساتھ تھا۔ تھا نہیں تھی۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خالی کمرے کو دیکھنے لگا' اسے کچھ یاد آ رہا تھا' جوان لڑکی رات کو نہیں آ سکتی۔ مگر کان ابھی تک اس کی آواز سے بج رہے تھے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے آنکھ کھل جاتی ہے مگر خوابوں کی گونج رہ جاتی ہے۔ اس کا ذہن نیند اور نشے کی کارفرمائی کو سمجھنا چاہتا تھا مگر وہ نیند میں تھا تو فرزانہ خواب میں آئی تھی اور نشے میں تھا تو وہ نگاہوں کے سامنے آئی تھی۔

میں نشے میں تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پلنگ کے پاس جوتے نظر آئے۔ شادی سے پہلے وہ جوتوں سمیت سو جاتا تھا۔ شادی کے بعد رخسانہ اس کے جوتے اتارا کرتی تھی مگر پچھلی رات کس نے اتارے؟

اس کا سر دکھنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی پھر کمرے کی ایک ایک چیز کو توجہ سے دیکھنے لگا۔ شاید کوئی چیز شبہ کی تصدیق کر دے۔ بلب روشن نہیں تھا۔ اس نے سوچا' کیا میں اندھیرے میں دروازہ کھول کر بستر تک پہنچ گیا تھا؟

وہ دروازہ کھول کر راہداری میں آیا۔ اسٹور روم اور باورچی خانے کے دروازوں پر تالے تھے۔ رخسانہ کے جانے سے بھید کھلا کہ عورت کے بغیر گھر میں کیسی ویرانی ہوتی ہے۔ وہ ہوتی تو اس کے دھیمے لہجے سے گھر بھر جاتا۔ وہ نہیں تھی مگر لہجے کی شناسائی سے دل کا سناٹا گونج رہا تھا۔

باہر والی وادی بھٹکاتی ہے۔ گھر والی بھرے گھر سے پکارتی ہے۔ وہ رہے نہ رہے' سارا گھر اس کی آواز میں بولتا ہے۔ "جانی اٹھ گئے؟ چائے لاؤں؟ آنکھ سے چیپڑ نکالو۔ غلیظ کہیں کے...."

وہ بے اختیار قمیص کا دامن اٹھا کر آنکھیں صاف کرنے لگا۔

○ "ہزار بار منع کیا ہے' منہ پیار کرو۔ توبہ کیسی بو آرہی ہے۔ چلو برش کرو۔ خوب کلیاں اور غرارے کرو۔ حلق میں انگلیاں ڈال کر منہ صاف کرو' یہ کیا؟ چھوڑو۔ جی نہیں جب تک شراب تمہارے اندر رہے گی۔ میں باہر رہوں گی۔ اپنے بازوؤں کے پٹ نہ کھولو۔ چوپٹ لگ رہے ہو۔"

وہ باورچی خانے کی موری کے پاس بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا کرتا تھا۔ وہاں کا دروازہ کھولنے کے لیے اس نے جیبوں کو ٹٹولا۔ چابیوں کا گچھا نہیں تھا۔ اس نے کمرے میں آکر دیکھا۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے' وہ گھر کی چابیاں تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی ہیں۔ جانی کو تکیے کے نیچے وہ گچھا مل گیا۔ اس نے پھر حیرانی سے سوچا۔ رخسانہ نہیں ہے پھر یہ چابیاں میری جیب سے نکل کر تکیے کے نیچے کیسے پہنچ گئیں؟

اسے جواب نہیں مل رہا تھا۔ کسی دوسرے کے آنے اور آکر جانے کا گمان غالب تھا مگر ثبوت نہیں مل رہا تھا۔ اس نے باورچی خانے کا دروازہ کھولا۔ تب ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہاں تمام سامان الٹ پلٹ نظر آیا۔ رخسانہ ہر چیز کو سلیقے سے رکھ کر گئی تھی لیکن جیسے کوئی چور آیا ہو۔ ہزار تلاش کے باوجود اسے روٹی نہیں ملی ہوگی مگر کمرے کی الماری سے کچھ روپے مل سکتے تھے۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ ایک چابی سے الماری کو کھولا۔ وہاں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آئی۔ رخسانہ جس طرح کپڑے سیٹ کر گئی تھی سب اسی طرح رکھے ہوئے تھے۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا۔ مگر کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ سونے کی ایک انگوٹھی اور پانچ سو روپے موجود تھے اس نے رخسانہ کی ڈائری اٹھا کر دیکھی' وہ بڑے اچھے انداز میں اپنے گھر' اپنے شوہر اور بچے کے متعلق دلی جذبات رقم کرتی تھی۔ جانی نے ایک بار چند صفحات پڑھے تھے۔ پھر کبھی پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ ملتا تو اسے پڑھنے سے دلچسپی نہیں تھی۔

وہ الماری بند کر کے باورچی خانے میں آیا۔ پیسٹ اور برش کے ذریعے اس نے خوب اچھی طرح دانت مانجھے۔ موری کے پاس بیٹھ کر کلیاں اور غرارے کیے۔ اس دوران میں رخسانہ اس کے دماغ میں بولتی رہی تھی اور وہ اس کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ وہ تولیے سے منہ پونچھتا ہوا آئینے کے سامنے پہنچ گیا۔ ارادہ تھا کہ کنگھی کرنے کے بعد رخسانہ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق ساس کے ہاں جا کر ناشتا کرے گا۔

لیکن بالوں میں کنگھی کرتے کرتے وہ ایک دم سے ساکت ہوگیا۔ آئینے میں اس دوسری کا سراغ مل رہا تھا۔ اس کا دل بے اختیار دھڑک رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اس کی قمیص کے بٹن سے دو چار بال الجھے ہوئے تھے۔ وہ بال مہین تھے' ریشمی تھے' کالے تھے' کالی گھٹا سے ٹوٹ کر برسے تھے۔

جانی نے سر جھکا کر دیکھا۔ وہ بال جانے انجانے پھانس کی طرح کلیجے میں گڑے تھے۔

ہائے' وہ بال کٹی ہوئی پتنگ کی طرح تلاش کے گلے سے الجھ گئے تھے۔

واہ ثبوت مل گیا تھا۔ وہ بال چھاتی پر چڑھ کر اپنا پرچم لہرا رہے تھے۔

○☆○
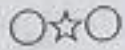
اس نے غسل کر کے دوسرا لباس پہنا' پھر آئینے کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ گیلے بالوں کو کنگھی سے سلجھانے لگی۔ چہرے کے آس پاس سیاہ زلفوں کا ہجوم تھا۔ جیسے حسن ابھی تک کالے برقعے کے فریم میں ہو یا مقدر میں ابھی تک وہی کالی رات ہو جب تقدیر جگانے والا سو جاتا ہے۔ غسل کرنے کے باوجود اس کا گورا گلابی مکھڑا کچھ پھیکا سا تھا۔ ایک ایسے دیے کی لو کی طرح روشن مگر اداس ہو جو ساری رات قبر کے سرہانے جلتا رہا ہو۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ ایک دم سے چونک کر پلٹ گئی۔ کیا وہ خوشبو کے پیچھے پیچھے چلا آیا ہے۔ دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ وہ سوچنے کے انداز میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈسپنسری کے حصے میں پہنچی۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہو رہی تھی اس نے قریب پہنچ کر پوچھا "کون؟"

دوسری طرف سے امی کی آواز سنائی دی "میں ہوں' دروازہ کھولو۔"

اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "امی السلام علیکم۔"

انہوں نے جواب نہیں دیا۔ ان کی نگاہیں بیٹی پر جمی تھیں۔ بیٹی نے صاف دیکھا کہ ماں کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے پریشانی اور وحشت صاف عیاں تھیں۔ ان کے قریب زمین پر ایک سفری بیگ رکھا ہوا تھا۔ فرزانہ نے آگے بڑھ کر بیگ اٹھاتے ہوئے پوچھا "آپ اس طرح کیوں کھڑی ہیں' اندر آیئے نا۔"

وہ اندر آگئیں۔ فرزانہ نے دروازے کو بند کرتے ہوئے پوچھا "اس وقت کوئی ٹرین

نہیں آتی 'کیا آپ بس میں آئی ہیں؟"

وہ خاموشی سے کمرے میں آکر بیٹھ گئیں۔ فرزانہ نے محسوس کیا۔ اس کی امی زبان سے نہیں بول رہی ہیں' اسے آنکھوں سے پڑھ رہی ہیں اور وہ آنکھیں پڑھنے کے دوران میں بہت کچھ بول رہی ہیں' انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا "تم کہاں تھیں؟"

ماں کے سوال میں حکم نہیں تھا' آنسو تھے۔ یوں لگتا تھا' بیٹی سے سچی بات معلوم ہو گئی تو وہ رو پڑیں گی۔ فرزانہ انہیں رلانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں یہیں تھی۔ گھر میں تھی۔"

"اور باہر تالا لگا تھا؟"

"معلوم تو ہو کہ آپ کب آئی ہیں؟"

"کیا اسی حساب سے جھوٹ بولو گی؟ بولو میں کل رات آٹھ بجے آئی۔ یہاں سے مریض عورتیں واپس جا رہی تھیں۔ رات کے گیارہ بجے آئی۔ ایک بجے آئی۔ صبح چار بجے آئی' چھ بجے آئی اور اب نو بجے آئی ہوں۔"

فرزانہ گونگی مورت بن گئی۔ اس کی امی اب رو رہی تھیں۔ روتے روتے بول رہی تھیں "تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ کل سے میری کیا حالت ہوئی ہے۔ میں جان پہچان والوں کے ہاں گئی۔ تمہارے بارے میں پوچھ نہ سکی۔ دنیا پوچھتی تو میں جواب نہ دے سکتی۔ ، سے اب تک ہر لمحہ میری آنکھوں نے تمہاری عزت کا جنازہ نکلتے دیکھا ہے مگر میں انتظار میں تھی کہ تم سے پوچھ لوں پھر ماتم کروں گی۔"

"امی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ ماں کے سامنے دوزانو ہو گئی۔ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی "میں گناہ گار نہیں ہوں۔ آپ سے آنکھیں ملا کر بات کر رہی ہوں۔"

"پھر تم کہاں تھیں؟ کتنی بار جانی کا خیال آیا کہ شاید وہ ادھر آگیا ہو۔ شاید راستے میں پکڑ لیا ہو۔ کہیں اٹھا کر لے گیا ہو۔ آخر ٹیکسی ڈرائیور ہے بدمعاشیوں سے باز نہیں آئے گا۔ بولو کہاں گئی تھیں؟"

"جوان بیٹی کسی بھی شریف انسان کے پاس رہ کر آئے وہ ماں کی نظروں میں بدمعاش ہی ہو گا۔" پھر وہ سرد آہ بھر کر بولی "میں اسی بدمعاش کے گھر میں تھی۔"

انہوں نے چونک کر حیرانی اور بے یقینی سے بیٹی کو دیکھا۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔ کچھ

لوگ جو زبان سے اعتراف نہیں کرتے' ان کے ضمیر کے اعتراف سے خود بہ خود گردن جھک جاتی ہے۔

یکبارگی ماں کے حلق سے کراہ نکلی اور وہ دل تھام کر آگے کو جھک گئیں۔ فرزانہ سامنے نہ ہوتی وہ جھکتے ہوئے فرش پر لڑھک جاتیں۔ فرزانہ نے انہیں سنبھال کر اسی صوفے پر لٹاتے ہوئے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا امی؟ کیا مجھ سے صدمہ پہنچ رہا ہے' خدا کے لیے آپ میرے بارے میں غلط رائے قائم نہ کریں۔"

وہ اپنی امی کا معائنہ کرنے لگی۔ اسٹیتھ اسکوپ لا کر دل کی دھڑکنوں کو ڈھونڈنے لگی۔ دھڑکنیں تو مل جاتی ہیں لیکن اس درد دل سے آگاہی نہیں ملتی جسے صاحب درد اپنے دل میں چھپا کر رکھ لے۔

بیٹی نے ایک زود اثر دوائی پلائی ذرا آرام ہو گیا۔ بیماری کوئی بھی ہو علاج ہو جاتا ہے لیکن صدمے کا علاج دواؤں سے کبھی نہیں ہوتا' اس نے ماں کو سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں اپنی پارسائی کا یقین کیسے دلائے؟

کسی طرح بھی یقین کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ساری دنیا تو ایک طرف رہی' وہ پیدا کرنے والی ماں بھی اس پر اعتماد نہیں کر رہی تھی۔ ایک جوان لڑکی غنڈے' بدمعاش شرابی ٹیکسی ڈرائیور کے پاس رات بھر رہے اور توبہ' توبہ۔ ماں نے شرم سے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ سمجھی' امی کو نیند آگئی ہے۔ وہاں سے چپ چاپ چلتے ہوئے ڈسپنسری میں آگئی۔ کمپاؤنڈر آگیا تھا' مریض عورتیں اور بچے بھی آ رہے تھے' وہ خود رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ سونا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر کے فرض نے اسے وہاں بٹھائے رکھا۔ اس دوران میں وہ ایک بار کمرے میں آگئی۔ اس کی امی بستر پر نیم دراز تھیں۔ آنکھیں کھولے سامنے دیوار کو تک رہی تھیں۔ فرزانہ ان پر ایک نظر ڈال کر یہ کہتے ہوئے چلی آئی "آپ سونے کی کوشش کریں' میں ابھی آتی ہوں۔"

ڈسپنسری میں ایک پرانی مریضہ کو دیکھ کر اس نے کہا "تم ہر دوسرے تیسرے روز کسی نئی بیماری کے ساتھ آجاتی ہو۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے' تم شکی ہو اور شک کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔"

کہنے کو وہ کہہ گئی لیکن دھیان اپنی امی کی طرف چلا گیا۔ وہ شبہ میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ انہیں کسی طرح بھی سمجھایا جاتا تو ایک سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا۔ اور وہ یہ کہ ایک شریف زادی اپنی شرم کو بالائے طاق رکھ کر پرائے مرد کے پاس کیوں گئی تھی؟ شرافت کے طور سے ہٹ کر کوئی بھی لڑکی شرم کی حدود سے باہر قدم رکھے تو ہزار شرم رکھنے کے باوجود دنیا والوں کو پارسائی کے آئینے میں بال نظر آتے ہے۔

بارہ بجے ڈسپنسری بند ہو گئی۔ وہ کمرے میں آ گئی۔ اس کی امی اسی طرح بستر پر نیم دراز تھیں۔ سامنے دیوار کو تک رہی تھیں۔ وہ ماں کی طرف نہ دیکھ سکی۔ دوسری طرف منہ پھیر کر بولی "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں شرمندہ ہوں جب تک آپ معاف نہیں کریں گی میں آپ سے نظریں نہیں ملاؤں گی۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہی پھر بولی "آپ یقین نہیں کریں گی۔ لیکن میں بتاؤں گی کہ کل رات کیا ہوا؟ میرے پاس وہاں جانے کا جواز ہے' جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے جانی کو صرف آدھا چہرہ نہیں بیوی بھی آدھی دی ہے اور وہ آدھی اپنے مرد سے بہت کچھ چھپا کر اسے چھوڑ کر جا رہی ہے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں جانی کو تباہی کے دہانے تک لے گئی۔ میں ہی انہیں مزید تباہی اور فریب خوردگی سے بچا سکتی تھی۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے شوکیس کے پاس آئی۔ شیشے کے پیچھے کانچ کے برتن رکھے تھے۔ وہ شوکیس سے ٹیک لگا کر بولی "مگر میں جانی کو رخسانہ کی چالوں سے آگاہ نہیں کر سکی۔ وہ اس قدر نشے میں تھے کہ نہ مجھے پہچان سکے نہ میری باتیں سمجھ سکے۔ وہ سو گئے' میں جاگتی رہی۔ رات کو اکیلی واپس نہیں آ سکتی تھی۔ تب میں نے سوچا' الماری کی تلاشی لینا چاہیے شاید رخسانہ کے کسی سامان سے اس کی چالبازی کا پتا چلے۔ میں نے الماری کھولی تو اس کی ڈائری ہاتھ لگی۔ میں نے ادھر ادھر سے اسے پڑھا۔ پھر ۴ ستمبر کے صفحے پر میری نظریں ٹھہر گئیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ شوکیس کے آئینے کے روبرو ہوئی۔ اس آئینے میں اس کی امی اپنے پلنگ پر نیم دراز نظر آئیں۔ فرزانہ نے نظریں جھکا کر کہا "رخسانہ نے لکھا تھا۔ میرے جانی! میں تمہیں جان سے بڑھ کر چاہتی ہوں۔ جو عورت جان سے چاہے' وہ تھوڑا جھوٹ بولنے کا بھی حق رکھتی ہے کیونکہ اپنے مرد پر بڑا مان ہوتا ہے۔ وہ مارے گا' ظلم کرے گا

پھر اپنی ملکیت سمجھ کر معاف کر دے گا۔ جانی میں پرسوں بہت دور چلی جاؤں گی۔ اگر کبھی تمہیں یہ بات معلوم ہو کہ میں نے تم سے کوئی بات چھپائی ہے تو میری رازداری کو فریب نہ سمجھنا۔ میرا انتظار کرنا۔ میں واپس آ کر تمہیں سمجھاؤں گی۔ بعض حالات میں مصلحت اندیشی لازمی ہو جاتی ہے۔ میں ایسے فریب کو وقتی طور پر جائز سمجھتی ہوں جس سے شوہر کو' بچوں کو اور گھر کو نقصان نہ پہنچے۔ میں قسم کھا کر جا رہی ہوں کہ کبھی کسی مرحلے پر بھی تمہاری خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچنے دوں گی۔ میرا ہاتھ صرف تمہارے ہاتھ میں رہنے کے لیے ہے یہ کسی اور ہاتھ میں کبھی نہیں جائے گا۔ جائے گا تو میں مر جاؤں گی۔"

فرزانہ پھر تھوڑی دیر کے لیے چپ رہی سر جھکائے سوچتی رہی پھر بولی "رخسانہ نے اور بہت کچھ لکھا تھا۔ لیکن یہ نہیں لکھا کہ جانی سے کیا بات چھپا رہی ہے؟ یہاں سے کنواری لڑکی بن کر کیوں گئی ہے؟ لیکن امی! میں ایک بات مان گئی۔ رخسانہ جیسی بھی ہے' بے حیا اور بے وفا نہیں ہے۔ یقیناً وہ مر جائے گی مگر جانی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر کسی مرد کے سائے میں نہیں جائے گی۔

امی! اس لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں جانی کے سامنے کبھی نہیں جاؤں گی۔ اگر رخسانہ نے اپنے شوہر کو اپنا رازدار نہیں بنایا ہے اور اس سے بات چھپائی ہے تو وہ اپنے غلط طرز عمل کی سزا پائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ سزا نہ بھی پائے۔ ان میاں بیوی کے حالات ان کے ساتھ ہیں۔ میں ان سے دور رہوں گی۔ آپ بھی دعا کریں کہ جانی کبھی مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔"

اس نے نظریں اٹھا کر آئینے میں اپنی امی کو دیکھا۔ اس بار اسے کچھ عجیب سا لگا۔ کتنی دیر ہو گئی تھی اور اس کی امی اسی طرح ساکت بیٹھی سامنے دیوار کو تک رہی تھیں۔ اس نے آواز دی "امی۔"

اس نے آئینے کی طرف سے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ "آپ چپ کیوں ہیں؟ بولتی کیوں نہیں ہیں امی؟"

کوئی جواب نہیں ملا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ آگے بڑھی جھجک گئی پھر آگے بڑھی اور قریب پہنچ گئی۔ جھک کر ماں کی کھلی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ڈاکٹر تھی۔ دور ہی سے سمجھ سکتی تھی مگر

اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے نبض ٹٹولنے کے لیے ان کے ایک ہاتھ کو پکڑ کر ذرا اٹھایا تو وہ ایک طرف ڈھلک گئیں۔

"امی۔ نہیں امی... نہیں... نہیں.... نہیں.... نہیں...."

کمرا اس کی دلدوز چیخوں سے گونجنے لگا۔

○☆○

لندن کی فضا میں دھند پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں کی خنکی میں رخسانہ نے بڑی شدت سے دھوپ کی کمی محسوس کی۔ ائرپورٹ کی عمارت میں مختلف نسل اور مختلف ممالک کے مسافر نظر آرہے تھے۔ انگریز عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ خوش لباس، خوش شکل اور اسمارٹ تھیں۔ رخسانہ نے اپنا آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ جلد از جلد چہرہ مکمل ہو جائے اور وہ فخر سے دنیا والوں کے سامنے منہ دکھا سکے۔

وہ بڑا ہی اجنبی ماحول تھا۔ اگر جمشید نہ ہوتا تو ایسے ماحول میں وہ گھبرا جاتی۔ جمشید نے ایک کیریئر میں اس کا تمام سامان لاد کر چلتے ہوئے کہا "کم آن" یہ لندن ہے۔ یہاں قلی نہیں ملتے۔ اپنا سامان خود لے جانا پڑتا ہے۔"

وہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے کہا "اور کوئی ضروری بھی نہیں ہے کہ ایک ساتھ اتنا سامان لے جایا جائے۔ تم چاہو تو یہاں کے لاکر میں اپنا سامان رکھ سکتی ہو۔"

رخسانہ نے کہا "پہلے یہ تو معلوم ہو کہ مجھے کہاں رہنا ہے اور وہاں کتنے سامان کی گنجائش ہے۔"

وہ مسکرا کر بولا "گنجائش تو دل میں ہوتی ہے۔ بائی دی وے نیدر چیلسی میں ہم نے ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا ہے۔ بہت ہی کشادہ فلیٹ ہے۔ سامان کی بڑی گنجائش ہے۔ ہم وہیں رہیں گے۔"

"تم بھی اسی فلیٹ میں رہو گے؟"

"آف کورس۔"

"لیکن میں نے خط میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ....."

"کہ تم تنہا کہیں رہنا چاہتی ہو مگر کیسے رہو گی۔ یہ بڑا مہنگا شہر ہے۔"

"مہنگائی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ میرے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی

میرے لیے ملازمت کا بندوبست کرو گے۔"

"کروں گا۔ ضرور کروں گا۔ آئی ہیو ٹو کیری آن۔ وہاٹ ایور یو لائیک۔"

"مگر جمشید میرا مزاج کچھ اور ہے۔ میں کسی کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتی۔"

"بھئی تم تو یہاں پہنچتے ہی لڑنے لگیں۔ پہلے میرے ساتھ فلیٹ تک چلو اور وہاں پاپا سے ملو۔"

"پاپا؟ کون پاپا؟"

"مائی فادر۔ میرے باپ، میرے والد، میرے ابا۔ میرے دادا کے صاحب زادے اور یہ سب ایک ہی صاحب ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کار میں جمشید کے برابر بیٹھی لندن کی شاہراہوں سے گزر رہی تھی۔ وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ رخسانہ نے پوچھا "ہم ڈاکٹر سے کب ملاقات کریں گے؟"

"کل صبح دس بجے کا اپوائنٹ منٹ ہے۔ کام کی باتیں بعد میں کر لینا ابھی اس شہر کو دیکھو جسے کتابوں میں پڑھتی آئی ہو۔"

"مجھے لندن سے نہیں صرف اپنے چہرے سے دلچسپی ہے۔"

"ٹو بی ویری فرینک۔ اپنی ذات کی دلچسپیاں قائم رکھنے کے لیے دوسروں کی ذات سے تھوڑی بہت دلچسپی رکھنی پڑتی ہے۔"

"میں ذرا کم سمجھتی ہوں۔ اپنی بات کی وضاحت کرو۔"

"میرا مطلب ہے۔ آئی مین ٹو سے۔ یہاں میں تمہاری خوشیوں اور ضرورتوں کو اپنی تمام تر مصروفیات پر ترجیح دوں گا۔ تمہارا بھی فرض ہو گا کہ تم میری خوشیوں میں خوش رہو۔"

"تمہاری خوشیاں کیا ہیں؟"

"یہ کہ تمہاری جیسی ایک حسین ساتھی ہو۔"

وہ بات کاٹ کر بولی "تمہاری پہلی ہی خوشی غلط ہے۔ میں حسین نہیں ہوں۔"

"ہو۔ میں نے کالج میں تمہارے حسن کی چکا چوند دیکھی ہے۔ دیکھ لینا وہ حسن

تمہیں واپس ملے گا۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ جمشید! ایک شریف اور مہذب انسان کے دل میں جتنی خوشیاں ہوتی ہیں' میں وہ سب پوری کروں گی۔ بشرطیکہ کوئی مجبوری آڑے نہ آئے۔"

"واہ۔ تم نے مجھے خوش کردیا۔"

تقریباً پینتالیس منٹ تک فاصلے طے ہوتے رہے پھر جمشید نے کہا "اب ہم چیلسی کے علاقے میں ہیں۔ وہ دیکھو' وہ عمارت جو دور دور پھیلی ہوئی ہے۔ وہ چیلسی رائل اسپتال ہے۔ تمہارے چہرے کے فوٹوگرافس اور ایکسرے رپورٹ وغیرہ اسی اسپتال میں ہیں۔ یہاں سے دس منٹ کے واکنگ ڈسٹنس پر ہمارا فلیٹ ہے کہو کیسی رہی۔ تمہیں ڈاکٹر سے ملنے کے لیے گاڑی کی ضرورت نہیں پڑے گی ٹہلتے ہوئے چلی آؤ گی۔"

"شکریہ تم بڑی سہولتیں فراہم کررہے ہو۔"

"ہاں اب شکریہ کہہ رہی ہو۔ ائرپورٹ پر لڑائی کررہی تھیں۔ ویسے تمہاری وہ کھلکھلاتی ہوئی ہنسی بڑی میوزیکل تھی۔ میں نے بہت عرصے سے سات سروں کی انگڑائی نہیں سنی' ذرا اپنی ہنسی تو سنادو۔"

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ دراصل اسپتال کی وہ عمارت دیکھتے ہی اس کے دل میں خوشیاں بھرگئی تھیں۔ جمشید نے ایک بات چھیڑی تو ہنسنے کا بہانہ مل گیا۔ "اللہ! مجھے یہاں ایک نیا حسن' نئی زندگی ملے گی۔ ہائے کب ملے گی۔ مجھے کچھ بتاؤ۔ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں! سرجری کب سے شروع ہوگی۔"

"یہ کوئی معمولی آپریشن نہیں ہے کہ تمہاری صورت دیکھتے ہی شروع کردیا جائے گا۔ کافی وقت لگے گا۔"

کار فلیٹ کے سامنے رک گئی۔ رخسانہ نے مایوس ہوکر کہا "کیوں دل توڑنے والی بات کرتے ہو؟ کیا مجھے ہنستے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے؟"

وہ ڈگی کھول کر سامان نکالتے ہوئے بولا "جو تمہیں ہنستا نہ دیکھ سکے وہ کافر لیکن تھنک اے ڈاکٹر تمہیں سرجری کے پروسیس کو سمجھنا چاہیے۔ ابھی تو پتا نہیں کتنے دنوں تک تمہارے چہرے کی گرافٹنگ ہوتی رہے گی۔ ہاؤ ایور' بعد میں یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔

میں سامان سے لدا ہوا ہوں۔ تم آگے بڑھو' سامنے پانچ نمبر والے دروازے کے کال بیل کے بٹن کو پش کرو۔ اللہ مشکل آسان کرے گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازہ کھل گیا۔ ایک صحت مند بوڑھا منہ میں پائپ دبائے' تمباکو کا دھواں چھوڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے رخسانہ کو سر سے پاؤں تک بڑی گہری نظروں سے دیکھا پھر ہونٹوں کو بھینچ کر "ہوں" کے انداز میں سرہلاتے ہوئے پوچھا "تم بس رخسانہ فرید ہو؟"

"جی... جی ہاں۔ آداب...." اس نے خالص مشرقی انداز میں سر جھکا کر ذرا ہاتھ اٹھاکر آداب کیا تو چوڑیاں کھنک گئیں۔

بوڑھے نے جمشید سے کہا "کتنا اچھا لگ رہا ہے' بہت عرصے کے بعد سلام اور احترام کا مشرقی انداز نظر آیا ہے۔ ہاں' وہ آداب کے جواب میں مجھے کیا کہنا چاہیے؟"

جمشید نے ذرا سوچ کر کہا "بس یہی کہ جیتی رہو' خوش رہو' دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔"

بوڑھے نے کہا "تم گدھے ہو۔ پوتوں پھلنے کی دعا بیٹے کو دیتے ہیں کیونکہ پوتا بیٹے کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہم تو رخسانہ کو سہاگن بننے کی دعائیں دیں گے۔"

رخسانہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ مرگئی۔ وہ جانی کے نام پر سہاگن تھی۔ کسی کی دعاؤں کی محتاج نہیں تھی۔ جمشید سامان اٹھائے فلیٹ کے دروازے سے اندر جاتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے بولا "پاپا! یہ شادی والی دعاؤں میں میرا نام بھی شامل کرلیجیے تھینک یو۔"

پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا "بیٹی! مجھے سید باقر علی کہتے ہیں۔ میں دلی مسرتوں کے ساتھ تمہیں ویلکم کہتا ہوں' آؤ اندر چلیں۔"

وہ باقر علی کے ساتھ فلیٹ کے اندر آگئی۔ پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہوگیا کہ دونوں باپ بیٹا اسے مہمان نہیں' اپنی ہونے والی رشتے دار سمجھ رہے ہیں۔ جمشید پہلے ہی اپنے خطوں میں کھل کر اظہارِ محبت کرچکا تھا۔ رخسانہ کو اس کی ای نے خوب زمانہ شناسی اور معاملہ فہمی سکھادی تھی۔ اگر وہ بن بیاہی بن کر نہ آتی تو شاید دلی گرمجوشی سے اس کا استقبال نہ کیا جاتا۔ شاید اس کی پلاسٹک سرجری کے لیے بھی اتنی بھاگ دوڑ نہ کی جاتی۔

کوئی مطلب کے بغیر کسی کو ہزاروں میل کی دوری سے بلا کر خوش آمدید نہیں کہتا۔

وہ فلیٹ دو بیڈ روم ایک سٹنگ روم 'باتھ اور کچن پر مشتمل تھا۔ جمشید نے اس کے ساتھ گھوم پھر کر پورا فلیٹ دکھایا پھر کچن میں جاتے ہوئے بولا "تم پاپا سے باتیں کرو میں کافی تیار کر کے لاتا ہوں۔ یہاں ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرنا ہوتا ہے ملازم بڑے مہنگے ہیں 'اب تم گھر سنبھالو گی 'میں بزنس کی طرف دھیان دوں گا۔"

وہ بالکل گھر والے کی طرح جیسے گھر والی کو کہہ رہا تھا۔ رخسانہ کو برا لگ رہا تھا۔ وہ بڑے تحمل سے کام لے رہی تھی۔ سٹنگ روم میں باقر علی نے کہا "آؤ بیٹے! بیٹھو اور اپنے گھر والوں کے متعلق کچھ بتاؤ۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی "کیا میں آپ کو پاپا کہہ کر مخاطب کروں؟"

"ضرور' مجھے اپنا باپ سمجھو۔ ویسے تمہارے فادر کیا کرتے ہیں؟"

"وہ ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔ بہر حال وہاں کی باتیں پھر ہوتی رہیں گی' یہاں میری رہائش کا کیا ہوگا؟"

انہوں نے مسکرا کر کہا "تم نے اپنے ہر خط میں دو باتوں پر زور دیا۔ ایک تو یہ کہ تم علیحدہ رہو گی۔ دوسرے یہ کہ ملازمت کرو گی۔"

"ایک اور بات آپ بھول گئے۔ میں نے اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ اپنی رہائش' اپنی خوراک اور سرجری کے تمام اخراجات میں خود پورے کروں گی۔"

باقر علی نے کہا "سچ پوچھو تو تمہاری خوددارانہ ضد نے مجھے جیت لیا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا پھر صورت کو دیکھنا وہ تو یہاں ہمارے سامنے بنے گی۔ تمہارا کردار بڑی حد تک واضح ہو گیا ہے۔ ہاں ایک بات اور پوچھوں گا۔ جمشید کے خطوط کے جواب میں تمہارے خطوط بڑے سنجیدہ ہوتے تھے۔ وہ محبت اور شادی کی باتیں لکھتا تھا اور تم ان باتوں کو نظر انداز کر دیتی تھیں۔ دیکھو بیٹے! یہاں کا ماحول مختلف ہے۔ یہاں بچوں کو دوست سمجھ کر دلی معاملات پر گفتگو کرنے کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ میں اوپن مائنڈڈ ہوں۔ تم بھی صاف گوئی سے کام لو۔ مجھے بتاؤ میرے بیٹے سے کس حد تک دوستی ہے۔ رومانس کی حد تک یا معاملات کی حد تک؟"

وہ سر جھکائے چند لمحوں تک سوچتی رہی پھر ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگی "آپ دوستی کی حد معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں جس معاشرے سے آئی ہوں وہاں لڑکی اور لڑکے کی دوستی کا تصور ہی نہیں ہے۔ یہ سوچنا ہی مضحکہ خیز ہے کہ پاکستانی والدین نے اپنی بیٹی کو رومانس کے لیے یہاں بھیجا ہے۔"

"یہ تو میں سمجھتا ہوں۔ والدین محبت کو نہیں معاملات کو اہمیت دیتے ہیں مگر انہوں نے یہ تو سمجھا ہے کہ تم تنہا ایک نوجوان کے پاس آئی ہو۔"

"یقیناً اسی لیے تو یہاں آنے سے پہلے ضد کرتی رہی کہ میری رہائش الگ ہو اور میں یہاں ملازمت کے ذریعے اپنے اخراجات پورے کروں۔ اس کے لیے میں نے آپ کے صاحب زادے کی پیش کش قبول کی۔ وہ میرے کام آنا چاہتے ہیں۔ میرے چہرے کے بگڑنے میں ان کا ہاتھ ہے لیکن اس کی تلافی ایسے نہ ہو کہ ان کی جیب پر بوجھ پڑے' جیب میری ہو اور کوشش ان کی رہے۔"

"یعنی تم ہم سے اتنی دست گیری چاہتی ہو جتنی سوسائٹی میں ایک دوسرے کے لیے لازمی ہوتی ہے۔ تم محض اخلاقی امداد چاہتی ہو۔"

"جی ہاں' صرف اخلاقی امداد۔"

جمشید ایک ٹرے میں کافی اور سینڈوچز لے آیا۔ اس نے ٹرے کو سینٹرل ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا "رخسانہ! تم یہاں فلیٹ میں رہ کر' رہنے اور کھانے پینے کے سلسلے میں کافی رقم بچا سکتی ہو۔"

باقر علی نے سینڈوچ اٹھا کر کہا "نہیں بیٹے! رخسانہ سے ضد نہ کرو۔ میں چاہتا ہوں میری بیٹی کی خودداری قائم رہے۔" انہوں نے سینڈوچ بڑھاتے ہوئے کہا "لو بیٹی کھاؤ۔"

"شکریہ۔" اس نے ایک پیس لے کر کہا "آپ معاملہ فہم بھی ہیں اور مہربان بھی۔ میرا یقین مستحکم ہو رہا ہے کہ آپ کی سرپرستی میں میرا چہرہ مکمل ہو جائے گا۔"

"میری کوشش یہی ہوگی لیکن دوپہر کی فلائٹ سے میں فرینکفرٹ جا رہا ہوں۔ تین دن بعد آجاؤں گا۔ میرے آنے تک تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ تم جمشید کے ساتھ جا کر ڈاکٹر سے ملتی رہو۔ تمہارے پچپن ہزار روپے کی ہنڈی مجھے مل چکی ہے۔ یہاں کی کرنسی کے حساب سے تمہیں تین ہزار پاؤنڈ مل جائیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی "لیکن میری رہائش کا کیا ہو گا؟"
باقر علی نے کافی کی چسکی لی اور کہا "تم لڑکی ہو' ہوسٹل یا ہوٹل میں نہیں رہو گی۔ جمشید اپنا ضروری سامان لے کر کسی ہوسٹل میں رہے گا۔"

وہ حیرانی سے بولی "یہ کیا بات ہوئی؟ جمشید اپنا فلیٹ چھوڑ کر ہوسٹل کے اخراجات برداشت کرے گا۔"

"بیٹی! جمشید کے ہوسٹل کا کرایہ تم ادا کرو گی۔ رقم کی صورت میں نہیں ملازمت کی صورت میں۔ یعنی تم اس فلیٹ کی دیکھ بھال اور صفائی کرو گی۔ ہمارے لیے تین وقت کا کھانا تیار کرو گی۔ جمشید صرف کھانے کے لیے آئے گا۔ رہ گئی میری بات تو میں ایک بیٹی کے پیار کا بھوکا ہوں اور تمہیں ایک بوڑھے سرپرست کی ضرورت ہے۔"

وہ بولی "پاپا' مجھے آپ کے ساتھ رہنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر آپ عجیب ہیں۔ آپ گریٹ ہیں۔ اپنی بیٹی کو ہوسٹل سے دور رکھنے اور ملازمانہ مصروفیات سے بچانے کے لیے مجھ پر گھریلو ذمے داریاں عائد کر دی ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے رخسانہ بیٹی! اسے یوں سمجھو کہ تمہارا اس گھر سے گھر سنبھالنے والا رشتہ نہیں ہے۔ تمہاری حیثیت ایک گورنس کی ہے۔ ایک گورنس کی جو تنخواہ ہوتی ہے' وہی تمہاری ہو گی۔ تم اس تنخواہ سے یہاں کے کھانے کا بل اور رہنے کا کرایہ ادا کرو گی۔ یوں کہہ لو کہ تمہارے یہاں کے کرائے سے جمشید کے ہوسٹل کا کرایہ ادا کیا جائے گا۔"

"مگر میری وجہ سے جمشید کو تکلیف ہو گی۔"

جمشید نے کہا "میری فکر نہ کرو۔ میں مرد ہوں کہیں بھی گزارہ کر سکتا ہوں۔ تم لڑکی ہو' یہاں اجنبی ہو' تمہیں پاپا کے سائے میں رہنا چاہیے۔"

"لیکن....."

"لیکن ویکن بھول جاؤ۔ بحث نہ کرو۔ تم مجھ سے الگ رہنا چاہتی تھیں یہ ہو گیا تمہیں ملازمت کی ضرورت تھی۔ تم گورنس بن گئی ہو اب زیادہ بولو گی تو مجھے غصہ آ جائے گا۔"

رخسانہ نے ہنستے ہوئے پوچھا "تم غصے میں کیا کیا کرتے ہو؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا "غصہ اتارنے کے لیے گھر والی کا انتظار کرتا ہوں' جانے وہ کب آئے گی۔"

رخسانہ اور باقر علی ہنسنے لگے۔ لنچ کے بعد جمشید نے ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے اور ضروری سامان رکھا۔ اپنے پاپا کا سفری سامان کار کی ڈگی میں رکھا پھر رخسانہ بھی پاپا کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ جمشید نے پہلے انہیں ائرپورٹ پر پہنچایا۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد اس نے رخسانہ سے کہا "اگر تھک گئی ہو' آرام کرنا چاہتی ہو تو میں تمہیں فلیٹ میں چھوڑ دوں اور اگر تفریح کا موڈ ہے تو چلو لندن کی سیر کرا دوں۔"

"میرا موڈ نہ پوچھو کیونکہ ملازمت کا معاملہ ہے۔ ابھی فلیٹ میں پہنچ کر وہاں کی صفائی کرنی ہے۔ تمہارے لیے رات کا کھانا تیار کرنا ہے۔ آخر تمہارے ہاں کی گورنس جو ٹھہری۔"

"گویا تم ہماری ملازمہ ہو۔ ویل اینڈ گڈ۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ مجھے لندن کی سیر کراؤ۔ میرے ساتھ رات کا کھانا کسی ہوٹل میں کھاؤ' اگر تم نے انکار کیا تو تمہیں ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گا۔"

رخسانہ ہنستے ہوئے اس کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گئی "جمشید! تم بہت زندہ دل ہو۔ میرا وقت بہت اچھا گزرے گا۔"

"نہ.... نہ یوں کہو زندگی اچھی گزرے گی۔"

رخسانہ کے لبوں سے تبسم کی تتلی اڑ گئی۔ جانی یاد آیا۔ یوں تو سفر کے آغاز سے یہاں تک وہ اور کامران یاد آتے رہے مگر اس وقت جانی ایک سوال بن کر دماغ میں آیا۔ کیا وہ ہوتا تو اسے جمشید کے ساتھ یوں گھومنے کی اجازت دیتا؟

وہ بے چینی سے پہلو بدل کر سوچنے لگی۔ "جمشید کے ساتھ تفریح سے انکار کر دے لیکن کب تک؟ یہاں جانے کتنے مہینوں تک رہوں گی۔ میں اپنی عزت اور شرم رکھتے ہوئے جس حد تک اپنے ان محسنوں کا ساتھ دے سکتی ہوں' دینا چاہیے۔ تبھی یہ باپ بیٹا میرا ساتھ دیں گے۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔"

کار تیز رفتاری سے مختلف شاہراہوں پر دوڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جمشید نے پوچھا "تم لندن میں ہو یا پاکستان پہنچی ہوئی ہو۔"

”ہں؟“ وہ چونک گئی۔ جانی اب بھی خیالوں میں بسا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے مسکرا کر بولی ”پاکستان میرے دل میں ہے جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لیا۔“

”گردن اٹھا کر مجھے دیکھتی رہا کرو۔“

رخسانہ نے سر گھما کر دیکھا پھر مسکرائی‘ وہ بولا ”شاباش دنیا کے کسی بھی ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ وہ تمہیں یہی سمجھائے گا کہ ہنستے بولتے رہنے سے آدھی بیماری دور ہو جاتی ہے۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحبہ؟“

”سچ بول رہے ہو مگر مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا ”تمہیں سر جھکا کر سوچنے کی بیماری نہ لگے۔ لگے تو میرے لیے لگے۔“

کار ایک جگہ رک گئی۔ اس نے کہا ”بس ایک منٹ‘ میں اپنا سامان رکھ کر آتا ہوں۔“

اس نے گاڑی سے اتر کر ڈگی سے اپنا سوٹ کیس نکالا پھر ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ اس کا آخری فقرہ رخسانہ کے دماغ میں گونج رہا تھا۔ انسان کی یہ ازل سے خواہش ہے کہ وہ اکیلا ہی ساری دنیا سے چاہا جائے۔ کوئی بھی اپنی ذات سے دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ دکھ درد میں بڑھ بڑھ کر شریک رہتا ہے تو اپنے لیے اس کی توجہ اور تعریف بڑی اچھی لگتی ہے اور جو بات اچھی لگتی ہے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دل میں جگہ بناتی رہتی ہے۔ پتا نہیں جمشید کی توجہ اور تعریفیں کیا رنگ دکھانے والی تھیں۔ ابھی تو رخسانہ سر سے پاؤں تک جانی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اس لیے فوراً ہی جمشید کی باتوں کو دماغ سے نکال دیتی تھی۔

کسی کی باتوں کو نظر انداز کرنا اور بات ہے لیکن بات بنا بنا کر بولنے والے کو نظر انداز نہ کرنا اور بات ہے۔ رخسانہ کے دماغ پر ایک بوجھ تھا کہ آخر وہ کب تک حیلوں بہانوں سے ٹالتی رہے گی؟ رات کو ایک ہوٹل کے کیبن میں کھانے کے دوران جمشید نے کہا ”بہت ہو چکا رخسانہ! لڑکیوں کو اتنا ریزرو نہیں رہنا چاہیے۔“

”یہ مشرقی انداز ہے۔ ہمارا معاشرہ ہماری سوسائٹی یہی سکھاتی ہے۔“

”تمہیں کچھ زیادہ ہی سکھا دیا گیا ہے۔ ٹیوب میں سفر کے دوران میں نے ایک ذرا سا

ہاتھ پکڑا تو تم نے فوراً ہی چھڑا لیا۔“

”یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ خیال کی پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے قربت کے باوجود فاصلہ رکھنا چاہیے۔“

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا ”تم محتاط اور محفوظ رہنا جانتی ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ چلو آج ہی اقرار کر لو کہ یہاں سے ہم جیون ساتھی بن کر پاکستان جائیں گے۔“

”میں یہاں شادی کے لیے نہیں آئی ہوں۔“

”جانتا ہوں‘ تمہارا چہرہ مکمل ہو گا پھر.....“

”پھر میں واپس جاؤں گی‘ اپنے ملک اپنے شہر میں پریکٹس کروں گی‘ اپنا مستقبل اپنے ہاتھوں سے بناؤں گی۔“

”اس کے بعد بوڑھی ہو جاؤ گی۔ شادی نہیں کرو گی۔“

”میرا مزاج دوسری لڑکیوں سے الگ ہے۔ میں کسی دوسرے کے متعلق کبھی نہیں سوچتی۔“

”یعنی میرے متعلق بھی سوچنے کی گنجائش نہیں ہے؟“

رخسانہ نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر نظریں جھکا کر کہا ”نہیں ہے۔“

اس نے صاف انکار کیا تھا لیکن مسکرا کر انکار کے مفہوم کو الجھا دیا۔ صاف گوئی کا بھرم رکھا تھا لیکن امید کا آئینہ دکھایا تھا۔ ایک حادثہ تبسم سے کتنے ہی معنے نکل آئے ہیں۔ جمشید خوش ہو گیا۔

رات کے دس بجے اس نے رخسانہ کو فلیٹ کے دروازے پر پہنچا دیا۔ کہا ”میں کل صبح آٹھ بجے آؤں گا۔ ہمیں نو بجے اسپتال پہنچنا ہے چونکہ دوپہر کے لیے پکانے کا وقت نہیں ملے گا اس لیے.....“

”وقت مل جائے گا۔ تم دوپہر اور رات کو میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھاؤ گے۔“

وہ مسکراتے ہوئے چلی گئی۔ جمشید تھوڑی دیر اس بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ مکمل چہرے والی رخسانہ تھی جسے وہ کالج میں بارہا دیکھ چکا تھا۔ جس سے چھپ کر محبت کرتا تھا۔ وہ اتنی مغرور تھی کہ اس کے سامنے حرف مدعا زبان تک نہیں آتا تھا۔ آج وہ اپنوں سے دور آ کر ایسی بے یار و مددگار ہو گئی تھی کہ وہ جب چاہتا

ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیتا لیکن یہ بات اتنی آسان بھی نہیں تھی۔ اس بے سروسامانی میں بھی اس لڑکی کے تیور بڑے حوصلہ شکن تھے۔

وہ حوصلہ پیدا کرنے کے لیے ایک بار میں آگیا۔ جس ہوسٹل میں رہنے گیا تھا اس کے روم میٹ احمد فخری سے بار میں ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا تھا۔ فخری بار کاؤنٹر کی سیٹ پر بیٹھا بیئر سے شغل کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا "بیئر چلے گی؟"

جمشید نے بیٹھتے ہوئے کہا "وہسکی ول ڈو۔ ایک تو پاپا بیئر سے آگے بڑھنے نہیں دیتے دوسرے رخسانہ آگئی ہے اس کے سامنے تمام دن پارسا بن کر رہنا پڑا ہے۔"

"یار تم لکی ہو۔ اپنے پاپا کے ساتھ بیئر پیتے ہو۔ ہمارے والدین یہاں برسوں رہ کر بھی مذہبی اور پاکستانی ہی رہتے ہیں۔ بہرحال آدھی محبوبہ کے متعلق بتاؤ بات آگے بڑھی؟"

"نہیں۔ بس امید ہے۔"

"یار جانے دو۔ کتنے برسوں سے امید کا روگ پال رکھا ہے امید کے ساتھ تدبیریں بھی کرتے رہے۔ اس کے لیے کتنے پاپڑ بیلے۔ اس کے لیے پلاسٹک سرجری کی راہیں ہموار کیں۔ جب تم ہوسٹل میں سامان رکھنے آئے تھے تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑنے کا مشورہ دیا تھا۔"

"پکڑا تھا۔ اس نے چھڑا لیا۔"

وہ جام اٹھا کر پینے لگا۔ فخری نے کہا "ہاتھ چھڑانے کا مطلب ہے دامن چھڑانا دور سے دامن کی ہوا دے کر الّو بنانا اور تم بن رہے ہو۔"

"شٹ اپ، طعنے نہ دو۔ کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ وہ ایک دم سے میری محبت کا دم بھرنے لگے۔"

"ایک ہی تدبیر ہے۔ آنکھیں بند کرلو۔ وہ خواب میں آکر سارے ارمان پورے کرے گی۔"

"پلیز فخری! میں پریشان ہوں۔ تم نے اس کا مکمل حسن نہیں دیکھا۔ کالج کے زمانے میں اسے دیکھ لیتے تو اس کے لیے سب کچھ ہارنے کو تیار ہو جاتے۔ وہ یہاں پھر مکمل ہوگی تو میں اسے جانے نہیں دوں گا۔"

"جمشید! تم نے اس کے متعلق جتنی باتیں بتائی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ چالاک اور خود غرض ہے اپنا چہرہ بنوائے گی، اور تمہیں ٹھینگا دکھا کر چلی جائے گی۔"

"ایسا نہ کہو، اس نے میری محبت اور احسانات کا صلہ نہ دیا تو میں اسے قتل کردوں گا۔"

"شاباش! یہ ہوئی نامردوں والی بات۔ جاؤ اسے مار ڈالو۔" اس نے قریب جھک کر کہا "عزت کی حرام موت۔"

جمشید نے دو گھونٹ پینے کے بعد کہا "مگر پھر۔ وہ۔ نفرت کرنے لگے گی۔"

"نہیں کرے گی۔ تمہیں تجربہ نہیں ہے۔ مجھے ہے۔ دیکھو جو ہارنا نہ جانتی ہو اسے ایک بار ہارنا سکھا دو۔ رخسانہ جیسی شریف اور شرم والیوں کو کوئی ایک ہی فتح کر سکتا ہے تم وہ ایک فاتح بن جاؤ۔ میرا دعویٰ ہے پھر وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گی۔"

وہ پینے اور سوچنے لگا۔ فخری نے کہا "تم نے سوچتے ہوئے اتنے برس گزار دیے اب اس لڑکی کی ٹال مٹول کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ابھی وہ ہاتھ آکر ہتھے نہیں چڑھ رہی ہے۔ پلاسٹک سرجری کے بعد تو ایسی جائے گی جیسے تھوک کر گئی ہو۔"

اس نے تلملا کر کہا "تم میری توہین کر رہے ہو۔"

"وہ کر رہی ہے۔"

"میں اس کی ایسی کی تیسی کردوں گا۔"

"کردو۔ یہی تو سمجھا رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو اور پیو۔ بہت سی باتیں عقل سے نہیں، جنون سے سمجھ میں آتی ہیں۔ شراب عقل چھین لیتی ہے مگر جنون اور حوصلہ دیتی ہے۔"

شیشے کا دوسرا جام آگیا۔ وہ پینے لگا۔ پہلے جام میں سرور پیدا ہوا تھا۔ دوسرے جام میں افق پر کالج والی ہری بھری رخسانہ للچانے لگی۔ فخری نے کہا "یہ اچھا موقع ہے تمہارے پاپا نہیں ہیں وہ فلیٹ میں اکیلی ہے۔"

"ہاں اکیلی ہے مگر رات کو دروازہ نہیں کھولے گی۔ شراب کی بو ملے گی تو اور بدک جائے گی۔"

"کوئی بات نہیں، وہ کل بھی اکیلی رہے گی۔"

"ہاں مگر میں نشے میں ہی شیر بن سکتا ہوں اور وہ بو پاتے ہی بھڑک جائے گی۔"

"یار سیدھی سی بات ہے' وہسکی میں بو ہوتی ہے۔ فائن کوالٹی کی جن میں قریب سے بھی بو نہیں ملتی۔ کل تم وہائٹ پی لینا میرے شیر۔"

شیر کا سینہ تن گیا۔ اس نے تیسرے پیگ کا آرڈر دیا "کل' ہاں کل رات کو میں فلیٹ میں اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے جاؤں گا۔ میں دیکھوں گا کہ مجھے کچا سمجھنے والی کتنی پکی ہوئی ہے۔ ہاں' کل رات....."

اس نے شیشے کے نازک سے جام کی پتلی سی کمر کو دبوچ لیا۔

○☆○

جانی اب پاگل ہونے ہی والا تھا۔ بے چارہ سوچ سوچ کر تھک گیا تھا لیکن وہ سیاہ ریشمی اور لمبے بال سمجھ میں نہیں آرہے تھے جو جانے کہاں سے آکر سینے سے لگ گئے تھے۔

جھورا پینٹر نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے پوچھا "استاد! ایک اور بات سمجھ میں آتی ہے۔"

"کیا بات ہے؟" جانی نے بے چینی سے پوچھا "جلدی بولو۔"

"بولتا ہوں مگر پہلے اپنی ایک پرائیویٹ بات بتاؤ۔ دیکھو غصہ نہیں کرنا۔ بھابی کو رخصت کرنے سے پہلے تم نے انہیں گلے لگایا ہوگا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ آگے بولو۔"

"اور کیا بولوں۔ صاف اور سیدھی بات ہے' وہ بال بھابی کے ہیں۔"

"نہیں ہیں۔ میری رخسانہ کے بال سنہری ہیں اور یہ بالکل کالے ہیں۔ یہ دیکھو۔"

اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی ڈبیا نکالی۔ جھورے سے کہا کہ وہ کار کے شیشے چڑھادے پھر اپنی طرف کے شیشے بھی چڑھا دیے۔ اس کے بعد اس ڈبیا کو احتیاط سے کھول کر کہا "یہ ہیں وہ بال۔ کہیں ہوا سے اڑ نہ جائیں۔ اس لیے کھڑکیاں بند کردیں۔"

جھورے نے انہیں غور سے دیکھا پھر تائید میں سر ہلا کر بولا "ہاں یہ کالے ہیں۔ استاد! یہ کالا جادو تو نہیں ہیں؟"

جانی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا "کالا جادو؟ نہیں یہ بکواس ہے۔ میں جادو وادو کو نہیں مانتا۔"

"وہ تو مانتی ہوگی جو تمہیں زلفوں کی زنجیر سے باندھ رہی ہے۔"

"ارے میں تو خود بندھا ہوا ہوں۔ تم یہ سوچ کے جواب دو' وہ کل رات میرے پاس آئی تھی کہ نہیں آئی تھی؟"

"دو ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ آئی ہوگی' تم ہوش میں نہیں تھے۔ ہوش میں ہوتے تو اسے پکڑ لیتے اور اگر تمہارا یہ دعویٰ کہ تم زیادہ مدہوش نہیں تھے' اپنے سامنے والے کو پہچان سکتے تھے تو پھر وہ نہیں آئی ہوگی کیونکہ تم اسے پہچان لیتے۔"

"بال کا مسئلہ تو رہ گیا۔ یہ کہاں سے آئے؟"

جھورے نے چونک کر چٹکی بجائی' کہا "استاد! پکڑ لیا۔ دیکھو جب تک بھابی تمہارے پاس گھر میں تھیں' تمہاری وہ فرزانہ دور بھاگتی تھی' اب نہیں بھاگے گی۔ کل آئی ہوگی تو آج رات کو بھی آئے گی' ضرور آئے گی۔ آج تم بالکل نہ پینا۔"

"نہیں پیوں گا لیکن وہ نہ آئی تو؟"

"تو سمجھ لینا کہ وہ کل بھی نہیں آئی تھی۔ کہیں چھپی ہوئی سفلی عمل کرا رہی ہے۔ تمہیں بھابی سے پھیر دینے کے لیے اپنے بالوں سے باندھ رہی ہے۔ آج رات کو فیصلہ ہو جائے گا۔"

جانی نے ڈبیہ کو بند کرکے قمیص کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' آج تم بھی موجود رہنا۔ ویسے تو میں ہوش میں رہوں گا مگر میں ایک گواہ چاہتا ہوں وہ جو بار بار سامنے آکر گم ہو جاتی ہے' تو وہی ہوتی ہے یا میری آنکھیں دھوکا کھاتی ہیں۔ تم رہو گے تو تمہاری آنکھیں دھوکا نہیں کھائیں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ میں رات کو آٹھ یا نو بجے تمہارے ہاں آجاؤں گا۔"

وہ وہاں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر ناظم آباد پہنچا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ سسرال میں اپنے بیٹے کو گود میں لے کر چومتے وقت رخسانہ یاد آئی۔ شرم بھی آئی کہ سیاہ زلفوں میں الجھ کر ایک محبت کرنے والی شریک حیات کو بھلا دیا تھا۔ وہ کامی کو دل کی دھڑکنوں سے لگا کر دل ہی دل میں کہنے لگا "رخسانہ! کہاں ہو؟ کیا لندن پہنچ گئی ہو؟ میں

تمہیں یاد کر رہا ہوں۔ بے شک کالے بال تمہاری یاد کو مٹائیں گے مگر ہماری اولاد ہم میں سے کسی کو مٹنے نہیں دے گی۔"

ساس نے بڑے مزے کے کھانے پکائے تھے' خوب پیٹ بھر کر کھانے کے بعد سستی محسوس ہوئی۔ سونے کو دل چاہنے لگا پھر خیال آیا کہ رات کو جاگنا ہے اور آنے والی کا انتظار کرنا ہے ابھی نیند پوری کر لینا چاہیے۔ وہ بیٹے کو گود میں لے کر ایک کمرے میں گیا۔ وہاں پلنگ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر تک ننھے کھلونے سے کھیلتا رہا اور اسے دیکھ دیکھ کر رخسانہ کے متعلق سوچتا رہا پھر سو گیا۔

آدھ گھنٹے بعد ساس کمرے میں آئیں۔ بچہ جاگ رہا تھا۔ جانی کی نیند میں خلل نہ ہو' یہ سوچ کر وہ بچے کو وہاں سے اٹھانے لگیں۔ ایسے ہی وقت بستر پر وہ چھوٹی سی پلاسٹک کی ڈبیہ نظر آئی۔ جو جانی کی جیب سے نکل پڑی تھی۔ شاید بیوی سے زیادہ ساس اپنے داماد کی ٹوہ میں رہتی ہے' انہوں نے فوراً ہی ڈبیہ کو کھول کر دیکھا۔ دیکھتے ہی ہائے نکلی "ہائے! یہ کس چڑیل کے بال ہیں؟"

انہوں نے کھڑکی کی طرف منہ کر کے ان بالوں کو چٹکی میں اٹھا کر دیکھا۔ یوں تو پہلی ہی نظر میں خیال سیدھا فرزانہ کی طرف گیا تھا۔ ان بالوں کی لمبائی دیکھ کر تصدیق ہو گئی۔ وہ بچے کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے چلتے ہوئے دوسرے کمرے میں آئیں اور فرید احمد کو اشارہ کیا کہ وہ پیچھے چلے آئیں۔ فرید احمد نے ان کے پیچھے بیٹھک میں پہنچ کر کہا "بیگم! کتنی مدت کے بعد اشارے سے بلایا ہے۔ قسم سے بیس برس پیچھے چلی گئی ہو۔"

انہوں نے گھور کر دیکھا پھر اپنی چٹکی شوہر کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا "دیکھئے' یہ کیا ہے؟"

وہ مسکرا کر بولے "مجھ سے زیادہ کون دیکھے گا اور پہچانے گا۔ میں برسوں سے اس چٹکی میں ہوں۔ بھئی یہ چٹکی ہے۔"

"آپ کا سر ہے۔ ذرا عینک لگا کر دیکھیں۔"

فرید احمد نے جیب سے عینک نکال کر آنکھوں سے لگائی پہلے بال نظر آئے پھر بیگم کے دوسرے ہاتھ میں چھوٹی سی ڈبیہ نظر آئی "بھئی قصہ کیا ہے؟"

"وہی قصہ ہے جو میری بچی کی شادی سے چلا آرہا ہے۔ ہماری جان پہچان کی عورتوں

میں صرف فرزانہ کے بال اتنے لانبے اور چمکیلے ہیں۔ جانی نے ان بالوں کو اس ڈبیہ میں بڑی محبت سے رکھا ہے کیا رخسانہ کے جاتے ہی وہ جانی سے ملنے لگی ہے؟"

"بیگم! بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ جانی سے اس کا ملنا ایک الگ بات ہے لیکن وہ ملنے کے بعد کیا اپنے بالوں کا تحفہ دے کر جاتی ہے؟"

"چولھے میں گیا اس کا تحفہ۔" وہ غصہ سے طنطناتے ہوئے کھڑکی کے پاس گئیں' پھر ان بالوں کو ڈبیہ سمیت باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد پلٹ کر بولیں "میں اس حرافہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

"جانی تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"کیا آپ ان بے شرموں کی حمایت کر رہے ہیں؟"

"میں اپنی بیٹی کا دشمن نہیں ہوں۔ تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ فرزانہ کو گالیاں دو گی کھلم کھلا اس کی مخالفت کرو گی تو جانی تمہارا جینا دشوار کر دے گا۔"

"میں اس سے ڈرتی نہیں ہوں۔ کیا وہ مجھے قتل کر دے گا؟"

وہ چپ رہ کر منہ تکنے لگیں۔ فرید احمد نے کہا "ذرا تحمل سے کام لو۔ پہلے ہم چپ چاپ معلوم کریں گے کہ فرزانہ جانی سے ملتی ہے یا نہیں؟"

"ملتی ہے وہ بال....."

"بال کی کھال نہ نکالو۔ ان پر نہ تو فرزانہ کا نام لکھا ہے نہ ہی وہ کوئی ٹھوس ثبوت ہیں۔"

"یہ ثبوت کیا کم ہے کہ وہ انہیں ڈبیا میں حفاظت سے رکھتا ہے؟"

"اگر حفاظت سے رکھتا ہے تو وہ تمہارے ہاتھ کیسے آگئے؟"

"وہ تو گہری نیند میں ڈبیہ اس کی جیب سے گر گئی تھی۔ میں نے دیکھا تو اٹھا کر لے آئی۔"

فرید احمد نے پریشان ہو کر کہا "یہ تم نے کیا غضب کیا۔ وہ جاگتے ہی ڈبیہ کو تلاش کرے گا۔ اس کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی ہو' وہ دیوانہ ہے۔ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لے گا۔ محلے والے کیا کہیں گے؟"

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"غصے میں سوچنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔"

"میں غصے میں نہیں، ممتا میں اندھی ہو جاتی ہوں۔ میں اپنی بیٹی کی جگہ کسی چڑیل کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

"ابھی برداشت کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ جانتی ہو کیا ہوگا؟ جانی تم سے انتقام لینے کے لیے ایک تو فرزانہ سے شادی کر سکتا ہے دوسرے کامی کو یہاں سے لے جائے گا۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں "میں کامی کو نہیں لے جانے دوں گی۔"

"تم روکنے والی کون ہوتی ہو؟ وہ کامی کا باپ ہے۔ اپنے بیٹے کو تمہاری بیٹی کی سوتن کی گود میں ڈال دے گا۔ تم اس کے جاگنے سے پہلے وہ ڈبیہ بستر پر رکھ آؤ۔"

وہ دوڑنے کے انداز میں چلتے ہوئے باہر کھڑکی کے پاس آئیں اور ڈبیہ کو تلاش کرنے لگیں۔ ایک پودے کے پاس وہ ڈبیہ کھلی پڑی تھی۔ انہوں نے مطمئن ہو کر کہا "مل گئی۔"

فرید احمد عینک لگائے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا "بال کہاں ہیں؟ کیا خالی ڈبیہ رکھو گی؟ وہ ہمارے سر کے بال نوچ لے گا۔"

دونوں میاں بیوی زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ مرغوں کی طرح گردن آگے بڑھائے دور دور تک دیکھنے لگے۔ بال ہوا میں اڑ گئے تھے۔ اب انہیں پانا ممکن نہیں تھا۔ فرید احمد نے زمین پر سے اٹھتے ہوئے کہا "مشکل ہے ادھر ہم ڈھونڈتے رہیں گے۔ ادھر وہ بیدار ہو جائے گا۔ اس ڈبیہ کو فوراً اس کے بستر پر پہنچانا ہوگا۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولیں "میں خالی ڈبیہ رکھ آتی ہوں۔"

"وہ ہماری کھوپڑی خالی کر دے گا۔ اسے لاکھ سمجھایا جائے گا لیکن وہ یہی کہے گا کہ تم نے حسد اور جلن سے ان بالوں کو پھینک دیا ہے اور یہ درست ہے۔"

وہ جھنجلا کر بولیں "میں کیا کروں؟ کیا اپنے بال نوچ لوں؟"

"غصے کی حالت میں بال نوچے جاتے ہیں۔ تم آرام سے دو چار توڑ کر ڈبیہ میں بند کر دو۔"

"ایں؟" وہ سوچنے لگیں۔

"یہ سوچنے کا موقع نہیں ہے۔"

"مگر میرے بال اس چھوکری کی طرح لانبے نہیں ہیں۔"

"زیادہ چھوٹے بھی نہیں ہیں۔ وہ بالوں کی لمبائی نہیں دیکھے گا۔ ڈبیہ کھول کر دیکھے گا اور مطمئن ہوتا رہے گا۔"

وہ دونوں بیٹھک میں آگئے۔ فرید احمد نے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر عینک لگا کر بیگم کا سر ٹٹولنے لگے۔ کہیں سفید، کہیں سیاہ اور کہیں بھورے رنگ کے بال تھے۔ بہرحال چار عدد سیاہ بال توڑ کر ڈبیہ میں بند کر دیے گئے۔ بیگم نے ناگواری سے کہا "ایسا داماد ملا ہے کہ صورت دیکھنے کو جی نہیں چاہتا، میری بیٹی کے جاتے ہی پر نکل آئے ہیں اس کے، پر کاٹ کے رکھ دوں گی۔ اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔"

ان کے بڑبڑانے کے دوران میں فرید احمد، جانی کے پاس اس ڈبیہ کو رکھنے چلے گئے۔

اتنے میں دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ دروازے کے پاس آئیں اور اسے کھولنے سے پہلے پوچھا "کون؟"

باہر سے آواز آئی "جی میں اورنگی ایک نمبر سے لیڈی ڈاکٹر فرزانہ کے گھر سے....."

بیگم کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ اندر جانی سو رہا تھا۔ باہر کوئی فرزانہ کا نام لینے والا آگیا تھا۔ دروازے کے دوسری طرف سے پھر کچھ کہا گیا، وہ پوری بات نہ سن سکیں۔ چند لمحوں کے بعد دوبارہ دستک سنائی دی پوچھا گیا "کیا آپ سن رہی ہیں؟"

وہ چونک کر بولیں "آں.... کیا کہہ رہے ہو بھائی؟"

"میں کہہ رہا ہوں ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں ان کا پڑوسی ہوں۔ مجھے آپ کا پتا بتایا گیا۔ میں خبر دینے....."

وہ خبر کیا سنتیں۔ ایک دم سے مارے خوشی کے اچھل پڑی تھیں۔ جھوم کر وہاں سے پلٹ گئی تھیں۔ پھر بھاگتے ہوئے دوسرے کمرے میں جا کر پہلے اپنے شوہر کو خوش خبری سنانا چاہتی تھیں۔ اس کے بعد جانی کے دل پر بجلی گرانا چاہتی تھیں۔ اس سے پہلے فرید احمد بیٹھک میں آگئے۔ بیگم اپنے آپ میں نہیں تھیں۔ ان پر ایسے لد گئیں جیسے وہ سہارا نہ بنتے تو گر پڑتیں۔ فرید احمد نے حیرانی سے کہا "یا حیرت! بڑھاپے میں لچھن دکھا رہی ہو۔ کیا بات ہے؟"

وہ خوشی سے انہیں جھنجوڑتے ہوئے بولیں "وہ مر گئی۔ میری بیٹی کی دشمن ہونے والی

سوتن مرگئی۔"

فرید احمد نے تعجب اور دکھ سے پوچھا "کون فرزانہ؟"

"ہاں۔ وہ باہر ایک آدمی اطلاع دینے آیا ہے۔"

وہ بیگم کو ایک طرف ہٹا کر تیزی سے چلتے ہوئے دروازے کے پاس آئے۔ اسے ایک جھٹکے سے کھولا۔ باہر ایک شخص سر جھکائے واپس جا رہا تھا۔ انہوں نے آواز دی "سنئے صاحب کس کا انتقال ہوا ہے؟"

اس نے پلٹ کر کہا "ڈاکٹر فرزانہ واسطی کی والدہ چل بسی ہیں۔ مغرب کے بعد نماز جنازہ ہوگی۔"

فرید احمد نے پلٹ کر گھورتے ہوئے بیگم کو دیکھا وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھیں۔ اب ان کا منہ لٹک گیا تھا۔ وہ بہت بلندی سے گری تھیں۔ فرید احمد نے قریب آکر پوچھا "کیا تمہارے کان بجتے رہتے ہیں؟"

وہ آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔ "اس سے بڑا صدمہ کوئی نہ ہوگا کہ دشمن مر کر زندہ ہو جائے۔"

فرید احمد نے انہیں تھپکتے ہوئے کہا "وہ بن باپ کی بچی رو رہی ہوگی۔ چند لمحوں کے لیے فرزانہ کی ماں بن کر سوچو۔ وہ پے در پے حالات کی مار کھا رہی ہے۔ ذرا انصاف سے سوچو' وہ صرف اس بھول کی سزا پا رہی ہے کہ اس کے ہاتھوں سے رخسانہ کا چہرہ بگڑ گیا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو آج جانی اس کا ہوتا۔ ایک طرف اس نے شعوری طور پر قربانی دی ہے۔ دوسری طرف دل کے معاملات میں بھٹک رہی ہے۔ یہ انسانی کمزوری ہے۔ کوئی اور انسانی کمزوری ہمارے تمہارے اندر بھی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ہماری بیٹی کی سوتن بن جائے۔ ہاں اتنا کہتا ہوں کہ آج تم اس کی ماں بن جاؤ۔"

بیگم نے کچھ کہنے کے لیے سر اٹھایا۔ فرید احمد نے انگلی اٹھا کر کہا "کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچ لو۔ ادھر فرزانہ کے ماں باپ نہیں رہے' ادھر ہماری بیٹی ہماری جان بن ماں باپ کے جانے اکیلی کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ یہاں تم اس کے سر پہ ہاتھ رکھو' وہاں کوئی اس کے سر پہ سایہ بنے گا۔"

بیگم نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے جان

سے پیاری' راج دلاری بیٹی کا آدھا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ ماں کے سینے سے ہائے نکلی۔ بند آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے تڑپ کر بولیں "رحم خدایا رحم' میں ابھی جا کر دشمن کو گلے لگاؤں گی۔ تو دشمنوں سے میری بچی محفوظ رکھ میرے مالک....."

وہ روتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جانی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ارادہ تھا کہ مغرب سے پہلے ہی اپنے گھر پہنچے گا۔ جانے وہ آنکھ مچولی کھیلنے والی کب آجائے۔ اس نے بستر پر پڑی ہوئی ڈبیہ کو کھول کر دیکھا۔ صرف ایک نظر ڈالی پھر اسے بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

بچہ چپ چاپ پڑا ہوا آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ بالکل رخسانہ جیسی بڑی بڑی سبز آنکھیں تھیں۔ جانی اسے اٹھا کر چومنے لگا پھر وہ اسے گود میں لیے دوسرے کمرے میں آیا۔ فرید احمد کو دیکھ کر بولا "بچے کو سنبھالیے۔ میں دیر تک سوتا رہ گیا۔ اب کمائی کی فکر کرنا ہے۔"

انہوں نے بچے کو لیتے ہوئے کہا "منہ ہاتھ دھو کر چائے پی لو پھر چلے جانا۔"

وہ جاتے ہوئے بولا "ٹائم نہیں ہے۔ میں باہر سے چائے پی لوں گا۔ رات کو کھانے نہیں آؤں گا۔"

وہ جواباً کچھ سنے بغیر باہر آکر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ دماغ میں وہ سمائی ہوئی تھی۔ اس کی دھن میں ٹیکسی چلاتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ وہاں بڑی ویرانی تھی اور ویرانی رہتی تھی وہ کیا جانتا تھا کہ جس کا انتظار ہو رہا ہے' وہ اپنی ماں کے سرہانے ماتم کر رہی ہے۔

آٹھ بجے جھورا پینٹر وعدے کے مطابق آگیا۔ رات کے بارہ بجے اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا "استاد! سو جاؤ۔"

جانی نے مایوس ہو کر کہا "اس نے میری نیند اڑا دی ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے تڑپا رہی ہے؟"

"اس کے نہ آنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ کل بھی نہیں آئی تھی۔ اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ تم یقین کرو' وہ اپنے بالوں سے تمہیں باندھ رہی ہے۔"

جانی نے بے یقینی سے پوچھا "کیا ایسا جادو ہوتا ہے؟"

"ضرور ہوتا ہے۔ ہم بچپن سے سنتے آرہے ہیں کہ کسی چڑیل کے بال اپنی مٹھی میں آجائیں تو وہ تابعدار بن جاتی ہے۔ اس کا بال جلاؤ تو وہ فوراً حاضر ہو جاتی ہے۔ جانتے ہو کیوں؟"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ سحرزدہ بالوں کو جلایا جائے تو بال والی کو تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ فوراً ہی گڑگڑاتے ہوئے حاضر ہوتی ہے اور ہر حکم کی تعمیل کرتی ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہا ہے؟ فرزانہ چڑیل نہیں ہے۔"

"جو اپنے بالوں سے جنتر منتر کرے' وہ ایک طرح سے چڑیل ہوتی ہے۔ برا نہ ماننا' کیا تمہیں اس کی حرکتوں سے تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔"

"مت پوچھو۔ میں بڑے عذاب میں مبتلا ہوں۔"

"تو پھر آؤ۔ ہم ابھی آزمائیں گے کہ یہ جنتر منتر والے بال ہیں یا نہیں؟ انہیں جلاؤ۔ اگر جادو ہوگا تو فوراً حاضر ہو جائے گی۔"

جانی نے ڈبیا کو سینے سے لگا کر کہا "نہیں جھورے! میں انہیں جلاؤں گا تو پھر میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔"

"جادو کا توڑ کرنا چاہیے۔ چلو سب نہ سہی ایک بال جلا کر دیکھ لو کچھ تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کیا چکر ہے؟"

وہ دونوں تھوڑی دیر تک بحث کرتے رہے پھر جانی راضی ہو گیا۔ جھورے نے ایک پرانے اخبار کے کئی ٹکڑے کیے انہیں دروازے کے سامنے ایک جگہ رکھ کر آگ لگائی۔ جانی نے ڈبیا کھول کر بڑی احتیاط سے ایک بال کو کھینچ کر نکالا۔ پہلے ڈبیا کو بند کر کے اسے جیب میں رکھا اور پھر دھڑکتے ہوئے دل سے اس بال کو آگ دکھانے لگا۔

ادھر آگ نے بال کو لپیٹ میں لیا۔ ادھر جادو نے اثر دکھایا۔ ایک رکشے کی آواز سنائی دی۔ آواز سے پتا چلا کہ رکشا مکان کے احاطے میں آکر رک گیا ہے۔ جانی اور جھورے نے شدید حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ جھورے نے دبی دبی آواز میں کہا "چچ.... چڑیل۔ بال جلانے سے وہی آتی ہے۔"

اب برآمدے میں قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں جلتی ہوئی آگ

کے سامنے اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے اٹھنا بھول گئے تھے۔ قدموں کی آواز دروازے کے پاس آگ کے سامنے آکر رک گئی۔ اب دھواں اٹھ رہا تھا دونوں نے آہستگی سے سر اٹھا کر دیکھا۔ دھوئیں کے پیچھے چڑیل مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹفن کیریئر تھا۔

جانی کے دیدے پھیل گئے تھے۔ حیرت سے منہ کھل گیا تھا۔ وہ بتیسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی "بیٹے! ایک جگہ میت ہو گئی تھی۔ وہاں سے واپس آئی تو معلوم ہوا تم کھانا کھانے نہیں آئے۔ رخسانہ نے سختی سے تاکید کی تھی کہ تم نہ آؤ تو میں کھانا پہنچا دیا کروں۔ ہی ہی ہی۔"

جانی نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔

○☆○
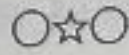
ڈاکٹر لوئیس مار کو ایک بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھا رخسانہ کے چہرے کو تک رہا تھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دل کی عجیب حالت تھی وہ ڈاکٹر کی زبان سے خوش خبری سننا چاہتی تھی کہ چہرہ جلدی مکمل ہو جائے گا۔

قریب ہی ایک کرسی پر جمشید بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی حالت بھی عجیب تھی۔ دل میں چور تھا۔ وہ چور نظروں سے رخسانہ کو دیکھتا تھا اور گھبرا کر سوچتا تھا' کب رات آئے گی؟ کب مراد بر آئے گی؟

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "مس! تمہیں مسٹر جمشید کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ تمہاری عدم موجودگی میں ہم ان کے تعاون سے تمہاری مکمل فیس اسٹڈی کر چکے ہیں۔ بلکہ ہم تمہارا چہرہ مکمل کر چکے ہیں۔"

رخسانہ نے چونک کر ڈاکٹر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ تو آدھی ہے' چہرہ کیسے مکمل ہو گیا؟ ڈاکٹر نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک فائل کو کھولتے ہوئے کہا "تم نے پاکستان سے اپنی جتنی تصویریں مختلف زاویوں سے بھیجی تھیں' وہ سب آدھے اچھے اور آدھے بگڑے ہوئے چہرے کی رپورٹیں تھیں مگر یہ دیکھو ہم نے تمہاری ادھوری تصویر کو مکمل کر دیا ہے۔"

اس نے ایک بڑی سی تصویر آگے بڑھائی۔ رخسانہ نے اس کو ہاتھ میں لے کر دیکھا

تو وہ حیران رہ گئی۔ تصویر میں چہرہ مکمل تھا۔ کہیں ایک تل برابر بھی عیب نہیں تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا "تم حیران ہو کہ یہ کیسے ہوا؟ سنو ہم نے تمہارے آدھے چہرے کے دو نیگیٹو تیار کیے پھر ایک نیگیٹو کو الٹ کر دوسرے نیگیٹو سے ملا دیا۔ اس طرح پرنٹ کے بعد یہ تصویر مکمل ہو گئی۔"

رخسانہ نے خوش ہو کر کہا "ڈاکٹر! میں نے ایک طویل عرصہ کے بعد خود کو مکمل دیکھا ہے۔ خواہ تصویر میں ہی سہی۔ پلیز یہ بتا دیں۔ میرا یہ عیب کب دور ہو گا؟"

وہ سوچتے ہوئے بولا "آئی سپوز...... چھ ماہ سے دس ماہ کا عرصہ لگے گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی "یقیناً آپ اپنے طریقہ کار اور مختلف دشواریوں کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں لیکن میں ایک غریب الوطن ہوں۔ میں ڈاکٹر ہوں مگر ابھی تک پریکٹس شروع نہیں کی۔ یہاں میری آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ سرجری سے فائنل پلیٹنگ تک جتنی دیر ہوتی رہے گی۔ میرے اخراجات اور میری پریشانیاں بڑھتی جائیں گی۔ اگر آپ ذاتی طور پر خصوصی توجہ دیں تو کم سے کم وقت میں میری مشکل آسان ہو جائے گی۔"

"میری کوشش یہی ہو گی۔ میں دوسرے ممالک سے آنے والوں کی پریشانیوں کو سمجھتا ہوں۔ میں کیا کروں، مجھے کتنے ہی ضرورت مندوں کو اٹینڈ کرنا پڑتا ہے۔ ہاؤ ایور میں کوشش کروں گا کہ تم جلد سے جلد اپنے وطن جا سکو۔"

"میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ یہاں میں فری رہتی ہوں اگر آپ کو اسسٹنٹ کی ضرورت ہو تو میں ہر وقت حاضر ہوں۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "ضرورت ہوئی تو ضرور یاد کروں گا۔"

ایک خاتون کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا "پلیز رخسانہ فرید کا گراف اسکیچ اور رپورٹ لے آؤ۔"

وہ خاتون چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد مطلوبہ چیزیں آ گئیں۔ ایک بہت بڑے گراف پیپر پر رخسانہ کے چہرے کے تفصیلی خطوط اسکیچ کیے گئے تھے۔ گراف کے چھوٹے سے چھوٹے خانے میں چہرے کا ایک ایک نقش نمبر وار تھا۔ ان نمبروں کے مطابق دوسرے کاغذات میں مفصل رپورٹ درج تھی۔ ڈاکٹر لوئیس مار کو ان کی اسٹڈی کرتا رہا اور

رخسانہ سے دوستانہ انداز میں گفتگو کرتا رہا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس کی خوش اخلاقی نے بڑی ڈھارس بندھائی تھی۔ رخسانہ مطمئن ہو رہی تھی۔

پھر ڈاکٹر نے کہا "مسٹر جمشید! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو تھوڑا وقت ویٹنگ روم میں گزار لیں۔ ابھی ان کے چہرے کی جلد کی رنگت، خاصیت اور ارجسما کے ردعمل کا تجربہ کیا جائے گا۔"

جمشید نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے آپ اندازہ بتا دیں کہ میں کب آ جاؤں؟"

ڈاکٹر نے گھڑی دیکھ کر کہا "ابھی گیارہ بجے ہیں۔ بارہ تیس پر لنچ کا وقفہ ہے۔ آپ اس وقت مس کو لے جائیں۔ دو بجے پھر لے آئیں۔"

جمشید نے مسکرا کر رخسانہ کو دیکھا پھر ڈاکٹر کے چیمبر سے واپس آ گیا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آج کا دن نہیں گزرے گا۔ دل پر قیامت گزرتے گزرتے شاید رات آئے۔

وہ کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ کاروبار کے سلسلے میں اپنے دفتر تک جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اندر عجیب سی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

وہ ایک پب میں آ کر بیٹھ گیا۔ کار کی ڈگی میں آج شام کے لیے ایک بوتل محفوظ تھی۔ وہ بیئر پینے لگا۔ رخسانہ کی وہ تصویر نگاہوں کے سامنے تھی جس پر اس کا چہرہ مکمل تھا۔ کیا غضب کا حسن تھا ایک تو قد و قامت، پھر جسمانی صحت و جاذبیت بھی ایسی تھی جیسے قدرت نے بڑی فیاضی سے حسن کا سارا مال و متاع اسی کی ذات میں بھر دیا ہو۔ دوسرے وہ چہرہ مکمل ہو جاتا تو وہ کیا سے کیا ہو جاتی؟

وہ مغرور ہو جاتی اور غرور کمان نہیں ہوتا کہ خم کھا جائے تیر ہوتا ہے، ٹوٹ جاتا ہے یا نشانے کو چھید کر رکھ دیتا ہے۔

ابھی وہ آرزو تھی، پوری ہو سکتی تھی، صورت پوری ہو جاتی تو حسرت بن جاتی۔ ایسی حسرت جس پر دم نکلتا ہے۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ جیسے ابھی سے دم نکل رہا ہو۔ سوا بارہ بجے کے قریب وہ پب سے نکل کر اسپتال پہنچا وہاں رخسانہ کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے بولا "کیا کھاؤ گی، انگریزی چینی یا ہندوستانی کھانا؟"

وہ بہت خوش تھی۔ چہکتے ہوئے بولی "پاکستانی کھانے کے لیے کیوں نہیں پوچھا؟"

"اس لیے کہ آج فلیٹ میں پکانے کے لیے دال چاول گرم مسالہ اور فریج میں گوشت وغیرہ کا اسٹاک نہیں ہے۔"

"پھر تو میں سینڈوچ کے دو پیس کھا کر چائے پی لوں گی اور بس۔"

"کیا ڈائٹنگ کا ارادہ ہے؟"

"آج میں اتنی خوش ہوں کہ مجھ سے کھایا نہیں جائے گا۔ ڈاکٹر انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اس نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے مجھ پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔"

جمشید نے ایک گہری سانس لے کر کہا "بے شک تم ایسی ہو۔ جس کے ساتھ دو گھڑی مل بیٹھوگی' وہ تمہارا ہو جائے گا۔"

انہوں نے ایک اوپن ریسٹورنٹ میں ہلکا سا لنچ کیا۔ جمشید نے ٹھیک دو بجے اسے دوبارہ اسپتال پہنچا دیا۔ وہاں سے وہ اپنے فلیٹ میں آیا۔ شکار کھیلنے سے پہلے کمین گاہ کا اچھی طرح جائزہ لینا پڑتا ہے کچھ ابتدائی تیاریاں ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً فلیٹ کے بیرونی دروازے کی چابی رخسانہ کے پاس تھی۔ وہ اس بہانے سے چابی لے آیا کہ فلیٹ اسپتال سے قریب ہے وہ وہاں جا کر آرام کرے گا۔ اب پلاننگ کے مطابق چابی اسی کے پاس رہے گی۔

وہ شام کو کچن میں پکانے میں مصروف رہے گی اور وہ چپ چاپ بیرونی دروازے کو مقفل کر دے گا۔ جب پرواز کا راستہ مسدود ہو جائے گا۔ تو وہ بے بس پنچھی کی طرح پنجرے میں پھڑپھڑاتی رہ جائے گی۔

اس نے کار کی ڈگی سے شراب کی بوتل نکال کر اپنے پاپا کے بیڈ روم میں چھپا دی کچھ ایسے کیسٹوں کا انتخاب کیا' جن میں چیخنے والے آرکسٹرا کی دھنیں تھیں۔ تاکہ ہوس کے نقار خانے میں طوطی کی آواز سنائی نہ دے۔ مکمل انتظام کرنے کے بعد ہر طرف سے مطمئن ہو کر وہ فلیٹ سے باہر آیا۔ رخسانہ کو اسپتال سے پانچ بجے فرصت ملنے والی تھی۔ اس وقت تین بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے دروازے کو لاک کیا کار وہیں چھوڑ دی۔ اسپتال قریب ہی تھا۔ وہ ٹہلنے کے انداز میں ادھر جانے لگا۔

اکثر گناہ یوں کیے جاتے ہیں' جیسے وہ گناہ نہیں' ہمارا حق ہو جمشید خود کو حق بجانب

سمجھ رہا تھا۔ پاکستان میں رخسانہ اس کے ہاتھوں بگڑی تھی۔ لندن میں اس کے ہاتھوں بن رہی تھی۔ آخر اپنی ہی تھی ہر مرد اپنی عورت کی تقدیر بگاڑتا اور بناتا ہے۔ جسے اپنا سمجھ لیتا ہے' اسے محبت سے' صبر سے یا جبر سے حاصل کر ہی لیتا ہے۔ رخسانہ کے رویے نے سمجھا دیا تھا کہ وہ صبر سے حاصل نہیں ہوگی۔ اس لیے جبر کا راستہ ہی رہ گیا تھا ایسی عورتیں پہلے پہل مانتی نہیں ہیں۔ منوانا پڑتا ہے۔ جانور کی طرح سدھانا پڑتا ہے پھر وہ سیدھی ہو جاتی ہیں۔

پانچ بجے وہ ڈاکٹر کے چیمبر سے باہر آئی۔ تمام دن کی تھکی ہوئی تھی مگر خوشی سے کھلی ہوئی تھی۔ اس نے جمشید کو اپنی تھکن کا علم ہونے نہیں دیا۔ ہوٹل کے اخراجات سے بچنے کے لیے خود پکانا چاہتی تھی۔ راستے کے کنارے چلتے ہوئے جمشید نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا "میں نے تمہارے متعلق بہت سوچا ہے۔ آخر ایک نتیجے پر پہنچ گیا ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولی "مجھے یقین ہے۔ کسی اچھے نتیجے پر پہنچے ہوگے۔"

"ہاں میں نے سوچا ہے کہ مجھے تمہارے مزاج کے خلاف عشق و محبت کے موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہیے۔"

رخسانہ نے خوش ہو کر کہا "تم بہت سمجھ دار ہو جمشید۔"

جمشید نے دل ہی دل میں جل کر کہا "خود کتنی مکار ہے۔ اتنا بھی نہیں کہتی کہ چلو عشق نہ سہی محبت سے تو بولتے رہیں گے۔ مگر یہ نہیں بولے گی۔ اس نے ٹھیک کہا۔ میں سمجھ دار ہوں۔ اسے بھی سمجھا کر رکھ دوں گا۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا "اگر تم میرے ایک سوال کا جواب دے دو تو میں کبھی شادی کا موضوع بھی نہ چھیڑوں گا۔"

"سوال کیا ہے؟"

"سوال آخری ہے۔ آخر مجھ سے ہی شادی کروگی نا؟"

اس نے ایک گہری سانس لی پھر آہستہ آہستہ سانس چھوڑتے ہوئے کہا "تم نے پوچھا ہے تم سے شادی کروں گی یا نہیں؟ تمہیں پوچھنا چاہیے تھا کہ شادی کروں گی بھی یا نہیں۔"

وہ اندر ہی اندر تلملا گیا "اونہہ شادی نہیں کرے گی کیا میں نے صورت بنا کر صرف صورت دیکھنے کے لیے بلایا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا ہے' جو حسین عورت کو سامنے بٹھا کر ساری عمر دیکھتا رہا ہو' اور اسے ہاتھ لگائے بغیر مر گیا ہو۔ اگر کوئی ایسا شخص گزرا ہوا ہو تو ہو۔ میں ایسا نہیں ہوں۔"

وہ فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ جمشید نے جیب سے چابی نکال کر دروازے کو کھولا۔ ایک طرف ہٹ کر رخسانہ کو اندر جانے کا راستہ دیا۔ وہ ایک کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی "میں ذرا لباس بدل لوں پھر کچن کا کام سنبھال لوں گی۔"

"اوکے میں باہر جا رہا ہوں ابھی آجاؤں گا۔"

اس نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ اندر سے گھبراہٹ شروع ہو گئی تھی۔ وہ کھلی فضا میں سانس لے کر اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔ جو کچھ پیش آنے والا تھا۔ اس کے لیے ذہانت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ ذہانت اس وقت تک' جب تک کہ نشہ نہ ہو۔ نشے کے بعد حوصلہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

پندرہ منٹ کے بعد وہ دروازہ کھول کر اندر آیا۔ کچن سے رخسانہ کی آواز آئی "کون؟"

"ہاں میں ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کچن میں آیا "مے آئی ہیلپ یو؟"

"نو تھینک یو۔"

"کچھ اوپری کام لے لو۔"

وہ چولہے پر سالن کی ہانڈی چڑھاتے ہوئے بولی "مرد کچن کا کام کرتے اچھے نہیں لگتے۔"

"اچھی بات ہے' میں پاپا کے بیڈ روم میں کتاب پڑھ رہا ہوں۔ ضرورت ہو تو بلا لینا۔"

وہ بیڈ روم میں آگیا۔ فلیٹ کے اندر گہری خاموشی تھی وہ اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز سن سکتا تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ جلدی سے بوتل نکالی۔ کھڑکی کے پاس میز پر گلاس رکھا تھا۔ اس میں پہلا پیگ بنایا۔ باتھ روم میں جا کر اس میں پانی ملایا پھر غٹا غٹ پینے لگا۔ وہ عجلت میں پینے کا عادی نہیں تھا مگر اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنے

کی جلدی تھی۔

گلاس خالی ہو گیا۔ وہ گہری گہری سانس لینے لگا۔ تھوڑی دیر تک واش بیسن کے سامنے جھکا رہا۔ آئینے میں خود کو دیکھتا رہا پھر تن کر کھڑا ہو گیا۔ گردن ذرا اکڑ گئی۔ اس نے آئینے میں مختلف زاویوں سے اپنی خوب روئی کا یقین کیا۔ اس کے بعد آدھا گلاس پانی لے کر کمرے میں آگیا۔ اس بار اطمینان سے بیٹھ کر دوسرا پیگ تیار کیا اور ٹھہر ٹھہر کر پینے لگا۔

دوسرے گلاس کے ساتھ ساتھ کھوپڑی خالی ہونے لگی۔ سر کے خالی گنبد میں آواز گونجنے لگی۔ "آخر وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ یہاں سے دھکے دے کر نکال دوں تو سڑکوں پر گشتی بن جائے گی۔ سوہو کے بدمعاش اٹھا کر لے جائیں گے۔ مگر نہیں' اپنی ہم وطن ہے۔ باہر بے عزت نہیں ہونے دوں گا۔ گھر میں عزت دوں گا لیکن یہ کم بخت میری نیکی کو سمجھتی نہیں ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا سا ڈگمگایا پھر سنبھل کر دروازے تک آیا۔ اسے کھول کر دیکھا۔ کچن سے رخسانہ کے گنگنانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا کمروں کے درمیانی کوریڈور میں آیا۔ وہاں ذرا رک کر معلوم کیا' کہیں وہ آ تو نہیں رہی ہے پھر مطمئن ہو کر بیرونی دروازے تک پہنچ گیا۔ جیب سے چابیاں نکال کر اسے مقفل کر دیا۔ وہاں سے پلٹ کر سٹنگ روم کے دروازے کو پھر بیڈ روم کو لاک کیا۔ جائے پناہ تلاش کرنے والی کو کسی دروازے کے پیچھے پناہ نہیں مل سکتی تھی۔

اب اطمینان سے تیسرا پیگ حلق سے اتارا جا سکتا تھا۔ وہ کوریڈور سے گزرنے لگا پھر ٹھٹک گیا۔ سامنے سے رخسانہ آرہی تھی۔ وہ بھی ٹھٹک گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ وہ بولی "بہت دیر سے تمہاری آواز سنائی نہیں دی۔ میں دیکھنے نکلی ہوں کہ کیا کر رہے ہو۔"

وہ بدستور مسکراتے ہوئے نشیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا "میں تمہاری ہی گنگناہٹ سن رہا تھا۔ بڑی رس بھری آواز ہے' مجھے نشہ ہونے لگا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے کچن کی طرف جانے لگی۔ وہ اپنے پاپا کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ رخسانہ کچن کے دروازے پر رک کر اس کے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو دیکھ رہی تھی۔

جمشید نے بیڈروم کے دروازے سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ جلدی سے مسکراتے ہوئے کچن میں آگئی۔ جمشید کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اس کے لبوں سے مسکراہٹ ختم ہوگئی۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے خلا میں تکنے لگی۔ سامنے جانی کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم نظر آرہے تھے۔

اس نے کچن سے سر نکال کر دیکھا۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ کمرے میں بیٹھا پی رہا ہوگا۔ وہ جلدی سے باہر آئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے کوریڈور میں پہنچی۔ وہ کمرے میں جاکر اپنا ضروری سامان اٹھاکر فلیٹ سے باہر جانا چاہتی تھی لیکن وہ دروازہ مقفل تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے بیرونی دروازے کے پاس آئی۔ اسے کھولنا چاہا۔ معلوم ہوا فرار کا راستہ بند ہوچکا ہے۔ وہ پلٹ کر دانت پیستے ہوئے دور کوریڈور کے آخری حصے کو دیکھنے لگی۔

وہ غصے میں تھی اور خوف زدہ بھی تھی کیونکہ شیطان پھر شیطان ہوتا ہے۔ اگر غالب آجائے تو کیا ہوگا؟ وہ کس منہ سے جانی کے پاس جائے گی۔ اسے دھوکا دے کر آئی تھی اور کس بے حیائی سے دھوکا کھانے والی تھی۔ ایک عورت جو حسین اور جوان ہو کیا وہ مردوں کی دنیا میں کسی محافظ رشتے کے بغیر سلامت رہ سکتی ہے؟ اب ٹوٹنے اور بکھرنے کا وقت آگیا تھا تو یہ حقیقت سمجھ میں آرہی تھی۔

پہلے جی میں آیا کہ دروازے کو پیٹنا اور چیخنا شروع کردے پھر خیال آیا کہ بات قانون کے محافظوں تک پہنچے گی۔ معاملہ طویل ہوگا۔ پردیس میں رقم خرچ ہوگی جب کہ آمدنی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ سوچتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ کوریڈور سے گزرتے ہوئے کچن میں آئی پھر کانپتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ خوف سے اس کی جان نکلی جارہی تھی پھر کانپتے ہوئے ہاتھ سے چاقو کے دستے کو پکڑلیا۔

اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے دانت پر دانت جمے ہوئے تھے۔ آنکھیں نفرت اور وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی مٹھی میں چاقو کانپ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھی پھر دماغ نے روک دیا "کیا کررہی ہے۔ اگر شیطان کو قتل کرے گی تو سزائے موت تک پہنچے گی اور اگر وہ چاقو چھین کر غالب آگیا تو بے آبروئی کی سزا پائے گی۔ دونوں صورتوں میں بربادی ہے' ہائے کیا صورت بنانے آئی ہے؟"

چاقو پر سے گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ اب وہ جانی کو اپنے پاس دیکھ رہی

تھی۔ اس مدہوش کو سنبھال رہی تھی۔ وہ ڈگمگارہی تھی۔ یہ سبق تو وہ برسوں سے پڑھتی آرہی تھی۔ گرنے والے کو سنبھالنا' بھٹکنے والے کو راہ پر لانا' بولنے والے کو چپ کرانا اور جاگنے والے کو سلادینا اسے خوب آتا تھا۔

اس نے دروازے پر پہنچ کر آواز دی "جمشید! میں آگئی ہوں۔"

کمرے کے اندر تیسرا گلاس خالی ہوچکا تھا۔ وہ اٹھنے ہی والا تھا۔ رخسانہ کی آواز سن کر خوش ہوگیا۔ جھوم کر بولا "آجاؤ میری جان! دل کا دروازہ کھلا ہے۔"

"پہلے یہ دروازہ تو کھولو۔" وہ غصے اور نفرت کو کچل کر مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔

جمشید نے کہا "ایں' یہ بند ہے۔ کمال ہے پوچھتا بھی نہیں' بند ہوجاتا ہے۔"

اس نے جھومتے ہوئے آکر دروازے کو کھول دیا۔ سامنے رخسانہ بڑی دلربائی سے مسکرارہی تھی۔ جمشید نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ وہ روٹھنے کے انداز میں بولی "بدمعاش کہیں کے۔ پہلے کیوں نہیں بتایا کہ پیتے ہو۔ جاؤ میں نہیں بولتی۔"

وہ غصہ دکھاتے ہوئے کمرے میں آگئی پھر بولی "تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ میں اپنے ہاتھوں سے پلاؤں۔"

"ایں؟" اس کی کھوپڑی ہوا میں اڑنے لگی "مم میں سمجھ رہا تھا۔ تم پینے والوں سے نرفت۔ آں نرفت۔ نہیں نفرت کرتی ہو۔"

"اب تو معلوم ہوگیا کہ نہیں کرتی مگر میں اس قابل کہاں ہوں۔ ابھی پلاؤں گی تو نہیں پیو گے۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "میں تمہارے ہاتھ سے زہر بھی پی سکتا ہوں۔ فلاؤ۔"

وہ میز کے پاس آئی اور بوتل کو کھول کر گلاس میں شراب انڈیلنے لگی۔ جمشید آگے بڑھا پھر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ ایک کرسی کا سہارا لے کر بولا "تم میری ہو۔"

"میں اس کی ہوں' جو پی کر بہکتا نہ ہو۔"

"میں نہیں بہکتا۔ لاؤ گلاس۔ ایں تم نے پانی نہیں ملایا۔ غلاس بھردیا۔"

"مرد پانی ملاکر نہیں پیتے۔ وہ جو پاکستان میں ہے' وہ بوتل منہ سے لگاکر نیٹ پی لیتا

ہے۔"

اس نے گھور کر پوچھا "وہ کون؟"

"تم پیو' میں بتاتی ہوں۔"

اس نے گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ پیا۔ دوسرا گھونٹ فوراً ہی پینے کا حوصلہ نہ ہوا۔ کیونکہ پانی کے بغیر شراب اتنی تیز اور ایسی آگ ہوتی ہے کہ حلق سے سینے تک جیسے پگھلی ہوئی آگ بہنے لگتی ہے۔ اس نے ہمت کر کے دوسرا گھونٹ حلق سے اتار لیا پھر پوچھا "وہ کون؟"

"وہ بہت زبردست پینے والا ہے۔ ایک روز اس نے میری کلائی پکڑ لی۔"

اس نے گلاس کو ایک جھٹکے سے رکھتے ہوئے کہا "میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔"

"میں نے کلائی چھڑا لی۔ صاف کہہ دیا کہ اس سے زیادہ پینے والا کوئی ملے گا تو میں شادی کروں گی۔"

"میں پیتا ہوں' اس سے زیادہ۔" اس نے گلاس اٹھایا آنکھیں بند کیں' ذرا سانس کو روکا اور چار گھونٹ پی گیا۔ اس کے بعد اس کی جو حالت ہوئی ہوگی' وہ خود جانتا ہوگا۔ رخسانہ نے فوراً ہی گلاس کو سنبھال لیا' اب وہ سنبھلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ آنکھیں بند کئے اپنے اندر جہنم کو دہکتا محسوس کر رہا تھا۔ اسے دور کہیں سے رخسانہ کی آواز سنائی دی "جمشید! بیٹھ جاؤ۔"

وہ بیٹھنے لگا۔ رخسانہ نے کرسی ہٹا دی۔ گرنے کی کراہیں سنائی دیں۔ وہ فرش پر پڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے منظر واضح نہیں تھا۔ دھند لکے میں رخسانہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا اور وہ جھکی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ "تم مرد کیا ہوتے ہو؟ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑتے ہی عورتوں سے کمتر اور کمزور ہو جاتے ہو۔ تم میں اتنی سکت نہیں ہے کہ گلاس کو تھام سکو۔ میری کلائی کیا پکڑو گے۔"

اس نے گلاس کو اس کے منہ سے لگا دیا۔ وہ پینا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ بڑبڑا رہا تھا جیسے انکار کر رہا ہو۔ رخسانہ نے ایک ہاتھ سے اس کی ناک دبائی۔ اسے منہ سے سانس لینا پڑا۔ سانس کے ساتھ دو گھونٹ حلق سے اتر گئے۔ تیسرے گھونٹ میں زور کا ٹھسکا لگا۔ وہ اس سے دور جا کر کھڑی ہو گئی۔ جمشید بڑی نقاہت سے کبھی چاروں شانے چت ہو جاتا تھا۔

نشہ جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو پینے والا اسی طرح کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

رخسانہ نے گلاس کو ایک طرف پھینک دیا پھر یک بیک دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی "ہائے' میں کہاں آ کے پھنس گئی۔ امی! آپ کے مشورے نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ آپ نے سکھایا تھا کہ جمشید کو خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہیے۔ ہم نے یہ نہیں سوچا کہ پرائے دیس میں' پرائے گھر میں اور پرائے لوگوں میں مجھ اکیلی کا کیا حشر ہوگا؟"

اس نے چہرے سے ہاتھوں کو ہٹا کر بھیگی آنکھوں سے خلا میں گھورتے ہوئے کہا "قصور جمشید کا نہیں' ہمارا ہے۔ اگر میں صاف اور سیدھی بات کہہ دیتی کہ میں شوہر اور بچے والی ہوں تو جمشید نارمل رہتا۔ شاید مجھ سے مایوس ہو کر پردیس میں میرا مددگار نہ بنتا۔ بلا سے' میں اپنے شوہر کی بھرپور امداد لے کر چار پانچ سال کے بعد آتی مگر یہاں آ کر جمشید کے لیے کنوارا چیلنج تو نہ بنتی۔"

بہت سی باتیں وقت پر سمجھ نہیں آتیں۔ یہی رخسانہ پلاسٹک سرجری کے لیے اتنی بے چین تھی کہ چار پانچ برس تک انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ ماں کی باتوں میں آ گئی۔ خود نادان نہیں تھی' چہرے کو جلد سے جلد مکمل کرانے کی نادانی کر چکی تھی اور اب؟

اب وہ مکمل کیسے ہوگی؟ اس فلیٹ کی دیواریں تنگ ہو گئی تھیں۔ وہ جمشید کا ساتھ چھوڑ کر بے گھر ہو رہی تھی۔ اس کے پاس کل تین ہزار پاؤنڈ تھے۔ اتنی رقم سے کہیں رہنے کھانے پینے اور پلاسٹک سرجری کے اخراجات پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ اب ادھورے چہرے کی تکمیل کیسے ہوگی؟

اسے رونا آ رہا تھا مگر وہ آنسوؤں کو ضبط کر رہی تھی۔ دانت پر دانت جمائے' ہونٹوں کو سختی سے بھینچے گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ بروقت ذہانت سے عزت بچ گئی تھی مگر آگے ابھی کتنے ہی اندیشے تھے۔ فلیٹ کے باہر جانے کتنے جمشید ہاتھوں میں پتھر لیے کھڑے ہوں گے۔

یہ سزا ملی یہ ثمر دار پیڑ بننے کی
کہ عمر بھر مری قسمت میں صرف پتھر تھے

وہ فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ نشے کی انتہا میں گم تھا یا سو چکا تھا۔ رخسانہ نے

اس کے پاس بیٹھ کر جیبوں کی تلاشی لی اور چابیاں حاصل کر لیں پھر وہاں سے اٹھ کر دوسرے بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگی "پہلے چہرہ بگڑا تھا۔ اب حالات بھی بگڑ گئے۔ یہاں سے واپس جاؤں گی تو جانی سے کیا کہوں گی؟ وہ پوچھیں گے کہ انکل جمشید نے اتنی دور بلایا' اتنی رقم خرچ کرائی پھر ساتھ کیوں نہ دیا؟ میں ناکام واپس کیوں آئی؟"

وہ بیڈروم میں آکر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ جمشید کے پاپا باقر علی نے وعدہ کیا تھا کہ پلاسٹک سرجری کے سلسلے میں جتنی رقم کی ضرورت ہوگی' وہ قرض کے طور پر دیں گے۔ رخسانہ وہ تمام رقم قسطوں میں ادا کرے گی۔ قرض کا لین دین انسانی خلوص اور ہمدردی کی بنا پر تھا۔ خلوص کو جمشید نے مار ڈالا اور ہمدردی کوئی یونہی نہیں کرتا۔ باقر علی کا بھی ایک مقصد تھا۔ وہ اسے بہو بنانا چاہتے تھے لہٰذا اب ان سے قرض لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

تمام سامان پیک ہو گیا پھر سے ایک نئے سفر کا آغاز تھا۔ اس کے پاس ایک بڑا سا پہیہ دار سوٹ کیس' ایک اٹیچی' ایک باسکٹ اور ایک سفری بیگ تھا۔ اس نے بیگ کو شانے سے لٹکایا۔ ایک ہاتھ میں اٹیچی لی۔ باسکٹ وہیں چھوڑ دی پھر سوٹ کیس کو فرش پر چلاتی ہوئی باہر دروازے تک آئی۔ اسے چابی سے کھولا اور باہر نکل گئی۔

باہر رات کالی تھی۔ آسمان کالا تھا۔ اجنبی شہر تھا۔ راستے بہت تھے اور منزل ایک نہ تھی۔

میرے جانی' میرے سر کے تاج! میرے آسمان! آج انکشاف ہوا کہ جو عورت اپنے آسمان کے سائے سے نکل جاتی ہے' اس کے پاؤں تلے سے زمین بھی سرک جاتی ہے۔

مگر جانی! میں ابھی واپس نہیں آؤں گی۔ میں انسان ہوں۔ مجھے اپنی تکمیل کا حق پہنچتا ہے۔ میں یہاں مر جاؤں گی یا اپنا چہرہ مکمل کروں گی۔ زمانے کو دکھاؤں گی کہ ایک اکیلی عورت کا عزم کیا ہوتا ہے۔

خدایا میرے عزم اور حوصلے کی لاج رکھنا۔

ادھر تیری خدائی ہے اور تو ہے۔

ادھر شہر دشمناں ہے اور میں ہوں۔

○☆○
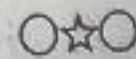
جانی نے الماری کھولی۔ اندر سے خارج ہونے والی دھیمی سی مہک نے اسے گھیر لیا۔ جب بھی وہ الماری کھولتا تھا' اپنی بیوی کی شناخت کا ایک جھونکا آتا تھا۔ وہ چند لمحوں تک گم صم کھڑا رہا۔ اس کے سامنے رخسانہ ہی رخسانہ تھی جو لباس وہ چھوڑ گئی تھی' وہ تہ بہ تہ رکھے ہوئے تھے۔ ہینگر سے پتلون کے ساتھ ساڑھیاں لٹک رہی تھیں۔ سائیڈ ہینگر میں دوپٹوں کے ساتھ ایک پراندہ نظر آ رہا تھا۔

اس نے پراندے کو تھام لیا۔ وہ ہنسنے' کھلکھلانے لگی "چھوڑو اللہ! چھوڑو نا میری چوٹی......"

جب وہ ہنستی تھی تو پائلیاں بجتی تھیں۔ کانوں میں سُر بولتے تھے اور سرور گھولتے تھے۔ ایک ایک پل کی ایک ایک سانس کی شریک رہ کر جاتی ہے' وہ جاتی مگر سانس کی طرح آتی ہے۔ کہیں سے صدا آتی ہے تو اس ن سرگوشی کا گمان ہوتا ہے۔ کسی کا آنچل لہراتا ہے تو وہ جھلکتی ہے۔ کہیں سے خوشبو آتی ہے تو وہ سانسوں میں بھر جاتی ہے۔ کوئی بے مروت لاکھ بھلاتا رہے' اسے یادوں کا ٹھکا ضرور لگتا ہے۔

وہ خیالات سے چونک گیا۔ جھورا پینٹر پوچھ رہا تھا۔ "تم کب تک الماری کے اندر جھانکتے رہو گے؟ کچھ سوچ رہے ہو کیا؟"

"ہاں۔" جانی کے منہ سے ہاں ایسے نکلی جیسے ہائے نکل رہی ہو "جھورے! وہ بہت یاد آ رہی ہے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں عامل بابا کے پاس چلو۔ جب تک جادو کا توڑ نہیں ہوگا' وہ یاد آتی رہے گی۔"

"میں فرزانہ کی نہیں' اپنی جان کی بات کر رہا ہوں۔"

"جان؟ یعنی کہ بھابی جان؟" اس نے حیرانی سے پوچھا "استاد! تم سمجھ میں نہیں آتے۔ محبوبہ کو یاد کرتے کرتے ایک دم سے اپنی گھر والی کے پاس پہنچ جاتے ہو۔"

"وہ بہت اچھی ہے۔ میں اس کی یاد دماغ سے نکالتا رہتا ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ اس کی یاد آنے سے گھبراہٹ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ خیال بے چین کرتا ہے کہ وہ اکیلی جان پردیس میں ہے۔ وہ کہاں ہوگی؟ کیا کر رہی ہوگی؟ اس پر کوئی مصیبت نہ آئے' اسے کوئی نہ ستائے۔ کوئی ستائے گا' وہ روئے گی تو میں غیرت سے مر جاؤں گا۔ میں اس کا

مرد ہوں۔ اس کی حفاظت میری ذمے داری ہے‘ میں اتنی دور سے اس کی حفاظت نہیں کرسکتا اس لیے گھبرا کر اس کی یاد سے پیچھا چھڑاتا رہتا ہوں۔"

جھورے نے کہا "میرا مشورہ ہے کہ بھابی کو خوب یاد کرتے رہو۔ فرزانہ کے جادو کا توڑ عامل بابا کے پاس نہیں۔ بھابی کے پاس ہے۔ دیکھ لو‘ ان کی یاد کی آندھی چلی ہے تو فرزانہ کو بھول گئے ہو۔"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا "فرزانہ کے لیے عامل بابا سے ملنا ہی ہوگا۔ کوئی ایسا عمل ہو جائے کہ وہ مجھے مل جائے یا پھر اس کا خیال میرے دل سے نکل جائے۔"

وہ الماری سے کپڑے نکال کر پہننے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر عامل بابا کے پاس جا رہے تھے۔ جھورے نے کہا "میرا خیال ہے‘ تم بھابی کو زیادہ چاہتے ہو۔"

"بے شک چاہتا ہوں۔"

"فرزانہ کو کم چاہتے ہو؟"

"کم اور زیادہ کا پتا نہیں چلتا ہے۔ فرزانہ کی یاد محبت سے شروع ہوتی ہے اور جب وہ نہیں ملتی تو نفرت ہوتی ہے۔ غصہ آتا ہے۔ ایسے وقت مل جائے تو میں اسے قتل کردوں۔"

"مشکل یہ ہے کہ تم کسی ایک طرف نہیں سوچتے ہو۔ کوئی ایک بات بولو۔ اسے محبت سے پانا چاہتے ہو یا قتل کرنا چاہتے ہو؟"

اس نے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد کہا "سوچتا ہوں‘ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے اور اپنے پیچھے دوڑا رہی ہے۔ ایسے ہی نہ جانے اور کتنے نوجوانوں کو دیوانہ بنا رکھا ہوگا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو اپنے پیچھے دوڑا رہی ہوگی۔ اسے تو قتل ہی کردینا چاہیے۔"

"استاد! گاڑی روک دو۔ میں تمہارے ساتھ پھانسی کے تختے تک نہیں جانا چاہتا۔"

"تم بزدل ہو۔ نہ وہ ابھی مل رہی ہے نہ ابھی میں انتقام لے رہا ہوں۔"

"کیا پتا وہ ابھی مل جائے۔ عامل بابا اسے حاضر کرسکتے ہیں۔"

"دیکھ جھورے! محبت اس کو بولتے ہیں کہ وہ خود ملنے آجائے۔ اگر عامل بابا اسے حاضر کریں یا میں اسے ڈھونڈ نکالوں تو یہ میری محبت اور اس کی بدمعاشی ہوگی۔ جی چاہتا

ہے وہ ملے تو پہلے اس کی ایک ٹانگ توڑ دوں پھر وہ بھاگ نہیں سکے گی۔ بھاگے گی تو لنگڑی ہزاروں میں پہچان لی جائے گی۔"

"بھئی وہ ملے گی۔ جیسے بھی ملے گی۔ تم دماغ ٹھنڈا رکھ کر سوچو۔ وہاں لندن میں بھابی اکیلی ہیں۔ خدا نہ کرے‘ ان پر کوئی مصیبت آئے تم یہاں فرزانہ کے ساتھ زیادتی کرو گے تو جیل میں جاؤ گے۔ بھابی کے کسی کام نہیں آسکو گے۔ یہاں تک کہ چار پیسے کما کر بھی یہاں سے نہیں بھیج سکو گے۔"

جانی نے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے ٹیکسی روک دی۔ اس مکان کے دروازے پر ایک زنگ آلود سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ جس پر عامل بابا کا نام جلی حروف سے لکھا ہوا تھا۔ نام کے اوپر نیچے لکھا گیا تھا۔ "محبوب قدموں میں جھکے گا۔ دشمن خون تھوکے گا‘ ملازمت شرطیہ ملے گی۔ ہر مراد پوری ہوگی۔ آزمائش شرط ہے۔"

دو شخص عامل بابا کے مکان سے باہر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک نے جانی سے پوچھا "لانڈھی چلو گے؟"

"ابھی نہیں‘ میں بابا سے ملنے آیا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ تم بھی کوئی مراد پوری کرانے آئے تھے؟"

دوسرے شخص نے مسکرا کر کہا "میرا یہ دوست ایک کافر حسینہ کے عشق میں گرفتار ہے۔ اسے اپنے قدموں میں جھکانے کے لیے تعویز لے جارہا ہے۔"

جانی نے اس عاشق کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ اس کے گال پچکے ہوئے تھے‘ آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں سگریٹ نوشی کی زیادتی سے ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ اس میں ایسی کوئی جاذبیت نہیں تھی کہ عورت اس کی طرف مائل ہو جاتی۔

جانی نے تعجب سے پوچھا "کیا وہ حسین عورت تمہارے تعویز پر عاشق ہوگی؟"

ایک پسلی کے عاشق نے سینہ تان کر کہا "مجھ پر ہوگی۔"

"بھائی صاحب! کیسے ہوگی۔ کیا تم بیمار اور پچکے گالوں والی عورت سے شادی کرسکتے ہو؟"

"ہرگز نہیں۔"

"پھر یہ کیوں سوچتے ہو کہ کوئی تمہارے پچکے گالوں کو طاق بنا کر بیٹھ جائے گی۔ بے

شک تم انسان ہو۔ تمہیں محبت کرنے کا حق ہے مگر آدمی کو پہلے تندرستی سے محبت کرنی چاہیے۔ کتنی عجیب سی بات ہے' ہم کسی کے دل میں اترنے کے لیے آنکھوں میں سُرمہ لگاتے ہیں' خوب اچھی طرح شیو کرتے ہیں' چہرے پر اسنو ملتے ہیں' اتنا نہیں سمجھتے کہ سنگار اور حسن صرف تندرستی ہے۔ صحت مند انسان ایک ایسا کِھلا ہوا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا' کبھی اس پر خزاں نہیں آتی۔ اس پر آپ ہی آپ محبتوں کی بہار آتی رہتی ہے۔"

جھورے نے کہا "استاد! جانوروں کو سدھاؤ۔ انسانوں کو نہ سمجھاؤ۔ ہم سب کو آئینہ دھوکا دیتا ہے۔ غلطی ہماری ہے۔ ہم نے کوئی ایسا آئینہ نہیں بنایا جو ہمیں انسانی حُسن کا راز بتا سکے۔"

دُبلا پتلا عاشق ناراض ہو کر اپنے ساتھی کے ساتھ چلا گیا۔ وہ دونوں مکان میں داخل ہوئے۔ ایک بڑے سے کمرے کے آخری حصے میں لکڑی کا تختہ بچھا ہوا تھا۔ اس پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ چادر پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ جھورے نے آگے بڑھ کر ادب سے کہا "بابا جی! یہ بادشاہ جانی ہے۔ کل میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔"

بابا نے گھور کر اپنی سرخ آنکھوں سے جانی کو دیکھا۔ جس طرح دائی سے پیٹ نہیں چھپتا' اسی طرح ایک نشہ باز دوسرے نشہ باز سے چھپ نہیں سکتا۔ بابا کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہی جانی نے دل میں کہا۔ بابا جی نے ابھی چرس کا دم لگایا ہے۔

"بول بچہ کیا چاہتا ہے؟"

"میں جسے برسوں سے تلاش کر رہا ہوں' وہ نہیں ملتی۔"

"وہ مردہ ہے تو نہیں ملے گی۔ زندہ ہے تو مل جائے گی۔"

"زندہ ہے مگر لاپتا ہے۔"

"جو لاپتا ہے' وہ تمہارے پتے پر آئے گی۔"

"کب آئے گی؟"

"جب ایک بکرا آئے گا۔ اس کے گوشت پر پڑھ کر پھونکا جائے گا اور کراچی کے ہر محلے میں گوشت کی ایک ایک بوٹی پھینکی جائے گی مگر......"

"مگر کیا؟" جانی نے بے چینی سے پوچھا۔

"مگر وہ بکرا ہمارا آدمی خریدے گا۔ وہ ذبح کرے گا۔ وہی تمام محلوں میں بوٹیاں پھینک کر آئے گا۔ بکرے کی قیمت ہمارے آدمی کو دے دے۔"

کمرے کے گوشے میں بیٹھا ہوا ایک شخص اٹھ کر جانی کے پاس آیا پھر آہستگی سے بولا "موٹا بکرا سات سو روپے میں اور دبلا تین سو میں آتا ہے۔ گوشت جتنا ہوگا' اتنے ہی زیادہ محلوں میں پہنچے گا۔"

جانی نے جیب سے روپے نکال کر سو سو کے سات نوٹ دیتے ہوئے کہا "کراچی میں رہنے کا یہ نقصان بھی ہے۔ اگر بھائی پھیرو میں رہتا تو مرغی سے کام چل جاتا۔"

پھر اس نے بابا جی سے پوچھا "کیا وہ خود ہی میرے پاس آئے گی؟"

"ہاں' خود آئے گی مگر......"

"مگر کیا؟"

"تو جس سے محبت کرتا ہے۔ اس کی کوئی نشانی تیرے پاس ہوگی۔ مثلاً محبوبہ کا رومال یا اس کی انگوٹھی وغیرہ۔"

"جی نہیں میرے پاس اس کی کوئی نشانی نہیں ہے۔"

جُھورے نے کہا "کیا کہہ رہے ہو استاد! اس کے بال تمہارے پاس ہیں۔ بابا جی! آپ بھی بھول گئے۔ کل میں نے بتایا تھا کہ محبوبہ نے غائب ہونے سے پہلے اپنے بال استاد کے پاس پہنچا دیے ہیں۔"

بابا نے جانی کو گھور کر کہا "ہوں سمجھ گیا بچہ تجھ پر جادو کیا جا رہا ہے۔ میں اس کا جادو اس پر لوٹا سکتا ہوں مگر......"

"مگر کیا؟"

"وہ بال مجھے دے دے۔ وہ جس محلے میں ہوگی' پہلے وہاں بکرے کی بوٹی پہنچے گی پھر میں ان بالوں پر عمل پڑھ کے انہیں ہواؤں میں اڑاؤں گا پھر وہ جیسے اڑتے ہوئے تیرے پاس آئے گی۔"

جانی نے جیب سے وہ ڈبیہ نکالی پھر ہچکچاتے ہوئے پوچھا "کیا ایک بال سے کام چل جائے گا؟ اس ڈبیہ میں چار بال تھے۔ پچھلی رات ایک بال کو جلایا تو سانس پہنچ گئی۔ ایک

آپ کو دوں گا۔ تو دو رہ جائیں گے۔"

"لا۔ ایک ہی دے دے۔"

اس نے بڑی احتیاط سے ایک بال ڈبیہ سے نکال کر دیتے ہوئے پوچھا "کیا وہ آج ہی میرے پاس نہیں آسکتی؟"

"آسکتی ہے مگر..... اتنے بڑے شہر میں ایک ہی دن کے اندر گوشت کی بوٹیاں پھینکنا ممکن نہیں ہے۔ اگر تجھے شبہ ہے کہ فلاں محلے میں رہتی ہے تو بتادے۔ پہلے اسی محلے کی طرف عمل کیا جائے گا۔"

"بابا جی! پہلے وہ عباسی شہید اسپتال کے پاس ناظم آباد میں رہتی تھی۔ وہاں سے کہیں چلی گئی۔ ہاں ایک بار اس بادامی برقعے کو اورنگی ایک نمبر میں دیکھا ہے مگر....."

"تو اپنی محبوبہ کے سر کا ایک بال اپنے گھر کے دروازے پر باندھ دے۔ وہ عورت بہت بری حالت میں گرتی پڑتی تیرے قدموں میں آگرے گی۔"

جانی تھوڑی دیر تک ہدایات سنتا رہا پھر جھورے کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔ باہر ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے بولا "چرس کا دم لگانے والے بھلا کیا عمل کرتے ہوں گے مگر دل کا معاملہ ہے۔ مجبوراً بابا جی کو سات سو روپے دیے۔ اب بھی وہ نہ ملی تو۔"

اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ غصے سے ایک گہری سانس لی پھر کہا "تو صبر کروں گا۔ اس کی موت میرے ہاتھوں ہوگی۔ جب بھی وہ ملے گی۔"

جھورے نے پریشان ہو کر اسے دیکھا پھر گھبرا کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گیا۔ جانی نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ دروازے کو بند کرتے ہوئے بولا "استاد! ابھی تو مجھے معاف کردو۔ اگر کل تم جیل یا حوالات میں نہ رہے تو ضرور آکے ملوں گا۔"

وہ جواب سنے بغیر تیزی سے چلتا ہوا قریب ہی ایک گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ جانی چند لمحوں تک چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا پھر گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھ گیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ اس نے سوچا دوپہر کو دو بجے تک ناگن چورنگی جانے والی کوئی سواری ملے گی تو وہ گھر جاکر دروازے پر ایک بال کو باندھ دے گا اور شام تک عامل بابا کی کرامت کا منتظر رہے گا۔

ایک جگہ تین برقع پوش عورتیں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھیں۔ وہ اورنگی ٹاؤن جارہی تھیں، جانی ادھر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ تین برقعے تین مختلف رنگ کے تھے۔ ایک کالا، ایک سفید اور ایک بادامی تھا۔ ایک بار بادامی برقع پچھلی سیٹ پر پھول کی پتیاں بکھیر کر گیا تھا۔ دوسری بار ائرپورٹ پر کالے برقعے نے فرزانہ کا اشارہ دیا تھا۔ وہ دو برقعے والیاں، تیسری سفید برقعے والی کو فری کہہ کر مخاطب کررہی تھیں۔

کسی فریدہ یا فیروزہ کو بھی فری کہا جاسکتا ہے مگر جانی کے خیال میں فرزانہ کا مخفف فری تھا، یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ راستے میں سفید برقعے والی نے اپنے ہونٹوں کی سرخی کا جائزہ لینے کے لیے پرس سے آئینہ نکالا اور نقاب کو الٹ دیا۔ جانی نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ ورنہ ان تینوں برقعے والیوں کو گاڑی سے دھکا دے کر باہر پھینکنے کا جی چاہنے لگا تھا۔ صرف وہ کم بخت دھوکا نہیں دے رہی تھی، اس کا نام بھی چکرا دیتا تھا۔

وہ تینوں حاجی ہوٹل سے ذرا دور جاکر اتر گئیں۔ اب وہ سواری اٹھائے بغیر اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے گاڑی کو موڑ کے آگے بڑھایا۔ آگے لوگوں کی بھیڑ نظر آئی کتنے ہی جوانوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ اس نے ٹیکسی روک دی۔ ایک نے کہا "ایک بزرگ چکرا کر گر پڑے ہیں۔ انہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔"

دوسرے جوان نے کہا "یہاں بالکل قریب ہی ڈاکٹر فنے واسطی کا کلینک ہے۔ بڑے میاں کو پچھلی سیٹ پر لے آؤ۔"

جانی کی نگاہوں کے سامنے بادامی برقع پہنے وہ معمر خاتون نظر آئیں جنہیں وہ کلینک کے دروازے پر دیکھ چکا تھا۔ کچھ لوگ بڑے میاں کو پچھلی سیٹ پر لے آئے تھے اور خود بھی گاڑی میں گھس کر بیٹھ گئے تھے۔ کلینک زیادہ دور نہیں تھا۔ دو منٹ میں ٹیکسی وہاں پہنچ گئی۔ لوگ بڑے میاں کو اٹھا کر اندر لے گئے، جانی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا رہ گیا۔

اسے وہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔ گھر جاکر عامل بابا کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے تھا مگر کوئی چیز اسے اس کلینک سے باندھ رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ جس معمر عورت کو اس نے کلینک کے اندر برقعے میں دیکھا تھا۔ اسی عورت کو تھوڑی دیر بعد بے پردہ کلینک سے دودھ والے کی دکان تک جاتے دیکھا تھا، کبھی پردہ اور کبھی بے پردگی کا طور سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ ٹیکسی سے نکل کر باہر آیا اور بڑے سے سائن بورڈ کو پڑھنے لگا۔

لیڈی ڈاکٹر نے۔ واسطی کے جلی حرفوں پر فرزانہ کا چہرہ طلوع ہونے لگا۔ اسی وقت کلینک سے باہر آنے والے ایک جوان نے باہر کھڑے ہوئے کچھ لوگوں سے کہا "ویسے تو آج کل کلینک بند ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا نا؟ بے چاری بہت اچھی ہے صدمے کے باوجود بڑے میاں کا معائنہ کر رہی ہے۔"

جانی نے بڑی توجہ سے یہ بات سنی۔ اس کے دماغ نے کہا "اس روز میں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ یہاں اس معمر خاتون کی بیٹی بھی رہتی ہو گی۔ والدہ کا انتقال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو بیٹی زندہ ہے' وہ لیڈی ڈاکٹر ہے۔ بے پردہ' دودھ دینے والے کی دکان تک گئی تھی اور برقعے والی اندر تھی۔"

یہ سوچتے ہی وہ تیزی سے چلتا ہوا کلینک میں داخل ہو گیا۔ وہاں کچھ لوگ ادھر ادھر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے پاس مریضوں کے معائنے کے لیے چھوٹا سا بیڈ پڑا تھا۔ اس پر بڑے میاں لیٹے ہوئے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر فرزانہ واسطی پاس کھڑی انجکشن تیار کرنے میں مصروف تھی۔

جانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ فرزانہ واسطی جس سے آنکھ مچولی کا واسطہ تھا۔ آج وہ بالواسطہ نہیں بلاواسطہ نگاہوں کے سامنے تھی۔ جانی فوراً دو آدمیوں کے پیچھے ہو گیا۔ ابھی وہ نظر نہیں آنا چاہتا تھا۔ آج وہ اس کے بھاگنے کے راستے مسدود کرنا چاہتا تھا اس کی نظر اندرونی دروازے پر گئی۔ وہاں پردہ لٹک رہا تھا۔ فرزانہ نے کسی سے کہا "ذرا میرے کمرے میں جا کر تکیہ لے آئیے۔"

وہ شخص پردہ ہٹا کر اندر کمرے میں آگیا۔ جانی سمجھ گیا کہ فرزانہ کی رہائش گاہ بھی یہی ہے۔ اندر سے تکیہ آگیا۔ فرزانہ نے اسے بڑے میاں کے سر کے نیچے رکھا بازو میں انجکشن لگایا پھر گہرے صدمے اور سنجیدگی سے بوڑھے چہرے کو دیکھ کر اپنے ابو کو یاد کرنے لگی۔ پہلے ابو دنیا سے گئے پھر امی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ آج کہیں سے کسی رشتے دار یا اپنے پرائے کی محبت کی جھوٹی تسلی بھی نہیں تھی۔ تنہائی کے عذاب کو وہی سمجھتا ہے جو انسانوں کی محفل میں اکیلا اور اجنبی ہو۔ کوئی اسے پوچھتا نہ ہو۔

بڑے میاں کو ہوش آگیا۔ آنکھ کھولتے ہی انہوں نے فرزانہ کو توجہ سے دیکھا' وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلیاں دینے لگی۔ انہوں نے پوچھا "تمہاری شادی ہو چکی

ہے؟"

وہ ایسے غیر متوقع سوال سے ذرا پریشان ہوئی پھر انکار میں سر ہلایا۔ انہوں نے پوچھا "ابھی شادی نہیں ہوئی پھر زندہ کیوں ہو؟"

یہ کہتے ہی وہ رونے لگے۔ سب ہی ان کے قریب آگئے۔ ایک نے پوچھا "چچا میاں' آپ کو کیا دکھ ہے؟"

دوسرے نے پوچھا "آپ بے ہوش کیسے ہو گئے تھے؟"

تیسرے نے پوچھا "آپ اتنی دھوپ میں کہاں جا رہے تھے؟"

بڑے میاں کے اندر سے یوں سانس نکلی جیسے روح نکل رہی ہو پھر وہ بڑے کرب سے بولے "جوان بیٹی کا کفن لانے جا رہا تھا۔"

سب ہی کے سوالات نے دم توڑ دیا۔ وہ بستر سے آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔ دو آدمیوں نے انہیں سہارا دیا۔ وہ تھرتھراتے ہوئے کہنے لگے۔ "وہ بڑی دل والی لڑکی ہے۔ اس نے اپنے منگیتر کو دھوکا دے کر ایک اپاہج بہن کو اس سے بیاہ دیا۔ یہ بیٹیاں کیوں دوسروں کے لیے اپنا من مارتی ہیں۔ اپنا تن راکھ کرتی ہیں' اپنی صورت اجاڑ دیتی ہیں' اپنی تقدیر بگاڑ لیتی ہیں اور بوڑھے باپ کو بیچ سڑک پر اوندھے منہ گرا دیتی ہیں۔ آہ خدایا! وہ کیوں مر گئی؟ مرجانا علاج نہیں ہے یہ علاج ہوتا تو ہر دوسرے گھر میں ایک بیٹی مرتی رہتی۔"

فرزانہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ جیسے بے جان مجسمہ بن گئی تھی۔ ویسے سر سے پاؤں تک مردہ تھی' صرف آنکھوں میں آنسو زندہ تھے۔ سچ تو ہے وہ رخسانہ کے لیے کیوں اپنا من مار رہی تھی؟ اور جب ایسا کر رہی تھی تو پھر روتی کیوں تھی؟ ٹھیک ہے کہ موت سے علاج نہیں ہوتا مگر سہاگ کا جوڑا پہن کر وہ جانی کی طرف سے مر سکتی تھی۔ سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا۔

وہ میز کے پیچھے اپنی کرسی پر تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی۔ یہی تو بات ہے کہ قصہ ختم نہیں ہوتا۔ حیات جاری رہتی ہے' قصے جاری رہتے ہیں۔ بلکہ حیات اپنے وقت پر ختم ہو جاتی ہے۔ قصے اس کے بعد بھی تاریخ کا حصہ بن کر رہتے ہیں۔

وہ لوگ بڑے میاں کو سہارا دے کر لے جانے لگے۔ ایک نے کہا "باہر جا کر دیکھو' وہ ٹیکسی ڈرائیور ہے یا چلا گیا۔"

فرزانہ نے ایک دم سے چونک کر سر اٹھایا۔ وحشت زدہ نظروں سے ایک ایک کا منہ تکنے لگی۔ دروازے پر کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا "ٹیکسی کھڑی ہے' ڈرائیور نہیں ہے شاید کسی ہوٹل میں چائے پی رہا ہوگا۔"

دھیرے دھیرے سب چلے گئے۔ وہ تنہا رہ گئی۔ باہر سے آنے والی آوازوں کو توجہ سے سننے لگی۔ شاید اس کی آواز بھی سنائی دے پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ سوچ سوچ کر چلتے ہوئے دروازے تک آئی۔ سامنے ہی ایک ٹیکسی نظر آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی گھبراہٹ شروع ہو گئی۔

اس نے فوراً ہی دروازے کو بند کر دیا۔ چٹخنی چڑھا دی۔ وہ اس ٹیکسی کو ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ ایک بار جب وہ پچھلی سیٹ پر خوشبو بکھیر کر گئی تھی تو اس ٹیکسی کا نمبر ذہن نشین کر لیا تھا۔ اب اس یقین سے دل دھڑک رہا تھا کہ جانی دوسری بار دروازے تک آن پہنچا ہے۔

اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اوپر خوف و دہشت کے باعث تھرتھراہٹ تھی۔ اندر چور جذبوں کے زلزلے تھے' وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر ٹیکسی اور ٹیکسی والے کو دیکھنا چاہتی تھی۔

دل نہیں مانتا جس کا ہو جاتا ہے۔ اس کا ہو جاتا ہے۔

جب اس کا ہو جاتا ہے تو پھر ساری دنیا اپنا زور لگا دے' دل کا زور نہیں ٹوٹتا۔ پہلے اخلاقی تقاضے نے فرزانہ کو توڑا کہ وہ سہیلی کے لیے قربانی دے لیکن دل کے تقاضے برقرار رہے جب ہم کسی کو ایک پھول دے دیتے ہیں تو اس کی تھوڑی سی خوشبو ہمارے پاس بھی رہ جاتی ہے۔

وہ کمرے میں آ گئی۔ کمرا خالی تھا۔ کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے پردے کو ہٹا کر آہنی جالی کے پار دیکھا۔ جانی کی آواز سنائی دی۔ "میں یہاں ہوں۔"

وہ ایک دم سے چیخ مار کر پلٹ گئی۔ کمرے کے آخری حصے میں وہ باتھ روم کے دروازے پر کھڑا تھا اور اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ فرزانہ کو چند لمحوں تک یوں محسوس ہوا جیسے دل کی دھڑکنیں رک گئی ہیں۔ جیسے سانس رک گئی ہے اور زبان پتھر ہو گئی ہے۔ اب وہ کچھ بول نہیں سکے گی۔

جانی نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا "میں نے تمہاری جیسی ذلیل لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔ ایک مرد اگر دوسرے مرد کو کسی عورت کے پاس پہنچا دے تو اسے دلال کہتے ہیں' جو لڑکی اپنا جلوہ دکھا کر کسی دوسری لڑکی کے پاس پہنچا دے' اسے دلالہ کہیں گے' حرافہ کہیں گے یا کیا کہیں گے؟ تمہیں جو بھی گالی دی جائے' وہ کم ہے۔"

وہ لرزتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے بولی "تم غصے میں ہو' میری بات نہیں سمجھو گے۔ بعد میں سمجھ سکو تو سن لو۔ جب پورا معاشرہ بگڑا ہوا ہو تو ایک سے کی جانے والی نیکی دوسرے کے لیے بدی بن جاتی ہے۔"

وہ بپھر کر آیا پھر اس نے تڑاخ کی آواز کے ساتھ ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ جیسے اس کا منہ گھوم گیا ہو۔ وہ گھوم کر سینٹر ٹیبل پر جا گری۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے۔ جانی نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "بلا سے تم نے نیکی کی۔ میرے ساتھ کیا کیا؟ میری محبت کا مذاق اڑایا مجھے بے وقوف بنایا۔ میں انسان ہوں۔ تم نے مجھے کتا سمجھا۔ میرے گلے میں محبت کا پٹا باندھ کر دوسرے کے دروازے پر پہنچا دیا......"

اس نے ایک جھٹکے سے بالوں کو کھینچ کر اسے کھڑا کر دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا رہی تھی۔ اس نے چیخ کر پوچھا "بولو کیا میں کتا ہوں؟"

تڑاخ۔ تڑاخ وہ مسلسل طمانچے کھا کر لڑکھڑاتے ہوئے آگے آ گئی اور شوکیس کے سہارے ٹھہر گئی۔ شوکیس کے شیشے لرزنے لگے۔ اس کی زلفیں بکھر گئی تھیں۔ گلابی مکھڑا طمانچوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ یک بیک تڑپ کر بولی "ہاں' ہم سب کتے ہیں۔ آگے سے کاٹتے ہیں' پیچھے سے دم ہلاتے ہیں۔"

وہ ایک قدم آگے بڑھ گئی۔ "میں نے تمہیں کاٹا' تمہیں زخم دیئے مگر تمہارے زخم کی تکلیف پر رت جگے کرتی رہی۔ تم ابھی مجھے کاٹ رہے ہو مگر میرے پیچھے محبت سے بھاگتے ہو۔ ہم اپنے آپ کو کیا کہہ سکتے ہیں؟ فرشتے مکمل فرشتے ہوتے ہیں۔ شیطان اپنی شطانیت میں کامل ہوتا ہے۔ جانور اپنے ہر عمل میں مکمل جانور ہے مگر ہم انسان آدھے ہیں۔ میں اپنے ضمیر کی سچائی سے رخسانہ کے سہاگ کی سلامتی چاہتی ہوں مگر آدھی جھوٹی ہوں اس لیے تمہیں دل سے نہ نکال سکی۔ رخسانہ تم پر جان نچھاور کرنے والی ایک

مثالی وفادار بیوی ہے مگر آدھی بے ایمان ہے۔ مصلحت اندیشی کے نام پر کسی وقت بھی تمہیں دھوکا دے جاتی ہے۔ تم ایک مرد کی بھرپور محبت اور غیرت سے اپنی بیوی پر جان دیتے ہو مگر آدھے بے غیرت ہو۔ بیوی کو تماپردیس بھیج کر میری تنہائی میں آ گئے ہو۔"

"مجھے بے غیرت کہتی ہے۔ کمینی۔ بدذات... دلالہ... آوارہ....."

وہ غصے سے بولتا جارہا تھا اور مار مار کر دل کی بھڑاس نکال رہا تھا مگر تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ آخر اس نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے پھر شوکیس کی طرف گئی وہ اپنے اختیار میں نہیں تھی' دھکا اتنی زور سے دیا گیا تھا کہ وہ لڑکھڑانے کے دوران جھک گئی پھر وہ جھکا ہوا سر شوکیس کے شیشے سے ٹکرایا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا۔

دھماکا جیسے محبت کے آستاں پر سر پھوڑنے کی روایت دہرائی جارہی ہو۔

شیشے کا ایک زبردست چھناکا ہوا جیسے انسان آئینہ در آئینہ ریزہ ریزہ ہو رہا ہو۔

وہ اپنے سر اور دونوں ہاتھوں سمیت شیشے کے آرپار آدھی چلی گئی تھی۔ آدھی شوکیس میں گھس گئی تھی۔ اس کے آس پاس دور تک شیشے کے ننھے ننھے ٹکڑے بارش کی پھوار کی طرح اڑتے اور بکھرتے جارہے تھے۔

پھر ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ فرزانہ ساکت ہو چکی تھی مگر اس کا لہو زندگی کی طرح رواں تھا۔ شوکیس کے باقی ماندہ شیشے پر خون کے چھینٹے تھے اور نیچے فرش پر وہ خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

جانی کا جنون سرد پڑ گیا۔ وہ گم صم حیران وپریشان نظروں سے فرزانہ کو تک رہا تھا۔ شاید اس انتظار میں تھا کہ وہ کوئی حرکت کرے گی' خود ہی شوکیس کے اندر سے نکل آئے لیکن وہ دیر تک اس طرح بے حس و حرکت پڑی رہی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ایک اندیشے نے سر اٹھایا۔ کیا وہ مر گئی ہے؟

اس خیال سے وہ لرز گیا۔ کہاں تو وہ غصے اور جنون میں اسے مار ڈالنا چاہتا تھا اور کہاں اس کے مرنے کے خیال سے لرز کر رہ گیا۔ نفرت سے محبت کو قتل کرنا آسان ہے مگر محبت سے محبت کی لاش نہیں دیکھی جاسکتی۔

وہ جھجکتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ سوچنے لگا کہ اسے آواز دے پھر خیال آیا۔ اتنی جلدی نرم پڑ کر آواز دے گا تو غصے اور انتقام کا بھرم نہیں رہے گا اس لیے وہ کھنکار کر

گلا صاف کرتے ہوئے ذرا گرج کر بولا "اے! وہاں کیا کر رہی ہو' اٹھو۔"

اٹھنا تو دور کی بات ہے اس کے جسم نے ہلکی سی جنبش بھی نہ کی تب وہ اور پریشان ہو گیا اور قریب گیا۔ ذرا دور سے جھک کر شیشے کے پاس شوکیس کے اندر دیکھنے لگا۔ اندر کانچ کے برتن بھی ٹوٹ گئے تھے۔ فرزانہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے شکستہ برتنوں پر جھکی ہوئی بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔

وہ اتنی تیزی سے شیشے سے آکر ٹکرائی تھی کہ خود کو سنبھالنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بڑی ذہانت اور حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اس نے ٹکرانے سے پہلے ہی دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ جسم پر کئی جگہ خراشیں آئی تھیں کئی جگہ سے خون رس رہا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس نے اپنے چہرے کو زخمی ہونے سے بچالیا تھا۔

جانی اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ آہستگی سے اس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "فرزانہ! فرزانہ! تم چپ کیوں ہو؟ بولتی کیوں نہیں ہو؟ فرزانہ!"

جانی کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے فرزانہ کو ادھر ادھر سے دیکھا۔ وہ آدھی شوکیس کے اندر تھی اور آدھی باہر۔ وہ شیشے کے اندر شگاف بناتی ہوئی اندر چلی گئی تھی اور اب اسے باہر اس وقت تک نہیں نکالا جاسکتا تھا جب تک کہ آس پاس کے شیشے توڑے نہ جاتے۔

وہ ایک گلدان کو اٹھا کر شیشے توڑنے لگا۔ فرش پر قطرہ قطرہ ٹپکنے والا خون اپنی مقدار بڑھاتا جارہا تھا۔ ذرا سی دیر میں جانی نے آس پاس کے شیشوں کو اتنی دور تک توڑ دیا تھا کہ اب وہ آسانی سے نکالی جاسکتی تھی۔ اس نے اندر ہاتھ ڈال کر اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا پھر اسے آہستگی سے پکڑ کر باہر کی طرف لے آیا۔ جب وہ اس کے بازوؤں میں آئی تو گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

دھیمی دھیمی سانسیں بتا رہی تھیں کہ وہ زندہ ہے مگر بے ہوش ہے۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیا کرے؟ کیا اسپتال لے جائے مگر دنیا والوں کو کیا کہے گا؟ اسپتال والے ایک زخمی عورت کو دیکھ کر پہلے تھانے والوں کی پرچی طلب کریں گے اور وہ اقدام قتل کے کیس میں الجھتا چلا جائے گا۔ جھورے پینٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ آج کسی وقت جیل یا حوالات کے پیچھے بند ہونے والا ہے۔

وہ تیزی سے سوچنے لگا۔ فرزانہ کا سر اس کے بازوؤں پر رکھا ہوا تھا۔ بکھری ہوئی

زلفوں کے ہجوم میں اس کا چہرہ یوں لگ رہا تھا جیسے گہری تاریک رات میں گلاب کھل رہا ہو۔ اس کا چہرہ محفوظ تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ ایسی معصوم‘ ایسی آسودہ دکھائی دے رہی تھی جیسے منزل پر پہنچ کر سو رہی ہو۔ تھکن اتار رہی ہو۔

اس نے دونوں بازوؤں سے اسے اٹھالیا۔ اس کے جوتے تلے شیشے کے ٹکڑے کراہ رہے تھے۔ اس نے وہاں سے چلتے ہوئے پلنگ کے پاس آکر فرزانہ کو لٹادیا۔ اس کے زخموں کا معائنہ کرنے لگا پھر وہاں سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا ڈسپنسری میں آیا۔ وہ ابتدائی طبی امداد کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ پٹیاں باندھ سکتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ بہتے ہوئے خون کو بند کرنے کے لیے کون سی دوا لگائی جاتی ہے۔

جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ تیزی سے پلٹ کر ڈسپنسری سے باہر آگیا۔ دروازے کو باہر سے بند کرکے تقریباً دوڑنے کے انداز میں چلتا ہوا گلی میں داخل ہوا۔ دوسری گلی میں ایک جراح کی دکان تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے کہا "میری گھر والی بری طرح زخمی ہوگئی ہے۔ خون بہہ رہا ہے کوئی ایسی دوا دو کہ خون فوراً ہی بند ہوجائے۔"

جراح نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر پوچھا "کہاں رہتے ہو؟ کہو تو میں ساتھ چلتا ہوں۔"

"جی نہیں۔ مرہم پٹی دینے سے کام چل جائے گا۔ میری گھر والی بہت پردہ کرتی ہے۔ بیمار ہوتی ہے تو کسی لیڈی ڈاکٹر سے علاج کراتی ہے‘ یہ مجبوری ہے۔"

"کیسی مجبوری؟ یہاں قریب ہی تو لیڈی ڈاکٹر فرواسطی کی ڈسپنسری ہے‘ وہاں چلے جاؤ۔"

"بھائی! میں وہاں گیا تھا۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ مہربانی کرکے کوئی اچھا سا مرہم دے دیجیے۔"

جراح نے بوتلوں اور ڈبوں کے ڈھیر سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پانچ روپے۔"

جانی نے جلدی سے پانچ روپے نکال کر اسے دیے‘ ڈبیا لی اور وہاں سے جانے لگا۔ جراح نے کہا "ارے اسے لگانے کا طریقہ تو سن لو۔ اس کی مرہم پٹی کے لیے بھی کچھ لے جاؤ۔"

"میرے گھر میں سب کچھ ہے‘ بڑی مہربانی۔"

وہ وہاں سے بھاگتے ہوئے واپس آیا۔ دروازہ کھول کر ڈسپنسری میں داخل ہوا۔ دروازے کو اندر سے بند کیا پھر وہاں سے روئی اور پٹیوں کا بنڈل اٹھا کر کمرے میں پہنچ گیا۔

وہ اسی طرح بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اگر ہوش میں ہوتی‘ اس سے شکایت کرتی یا لعنت ملامت کرتی یا اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی تو حساب برابر ہوجاتا لیکن اس کی خاموشی‘ اس کی بے ہوشی اور اس کی غفلت زدہ معصومیت نے جانی کے دل کو مٹھی میں جکڑلیا تھا۔ وہ بہت ہی نادم ہو رہا تھا اور سر جھکائے مرہم پٹی میں مصروف تھا۔

وہ حکیم تھا‘ نہ ہی نیم حکیم تھا۔ ایسا اناڑی بھی نہیں تھا کہ مرہم پٹی لگا کر زخموں پر پٹیاں نہ باندھ سکے۔ جہاں خراشیں آئی تھیں‘ وہاں اس نے صرف مرہم لگادیا تھا اور جہاں زیادہ زخم آئے تھے اور خون رس رہا تھا وہاں اس نے مرہم لگا کر پٹیاں باندھ دیں۔

پھر ایک بار فرزانہ کے چہرے کو دیکھا۔ ذرا قریب آیا پھر جھجکتے ہوئے کان لگا کر اس کے دل کی دھڑکنیں سننے لگا۔

دل دھڑک رہا تھا جیسے سرگوشی میں کہہ رہا ہو "گھبراؤ نہیں‘ میں زندہ ہوں۔ محبت کو محبت سے مارنے سے وہ نہیں مرتی۔ ہاں ٹوٹ جاتی ہے اور یہ تو بچوں کو بھی سمجھایا جاتا ہے کہ کسی بھی چیز کو توڑنا نہیں چاہیے۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے سامنے سر جھکا کر اپنے ہاتھ ملتے ہوئے بڑبڑانے لگا "میں اُلّو کا پٹھا ہوں‘ اوپر سے مارتا ہوں‘ اندر سے پچھتاتا ہوں۔ اب میں تمہارے سامنے کس منہ سے بولوں کہ میں پچھتا رہا ہوں۔"

اس کے دماغ نے کہا "بعد میں پچھتاتے رہنا‘ کیوں احمقوں کی طرح کھڑے ہو‘ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔"

وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح ہوش میں لایا جاسکتا ہے پھر وہ جلدی سے پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا باتھ روم میں گیا۔ پلاسٹک کے ایک چھوٹے سے مگ میں پانی لے کر وہاں سے واپس آیا پھر اپنے ایک ہاتھ کے چلو میں تھوڑا تھوڑا سا پانی لے کر فرزانہ کے چہرے پر چھڑکنے لگا۔ ذرا سی دیر میں

فرزانہ نے ایک گہری سانس لی۔ اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ ذرا سا کسمسائی پھر ساکت ہو گئی۔

وہ تاریکی سے روشنی کی طرف آ رہی تھی۔ ذہن آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا۔ کان کچھ سن رہے تھے۔ کھڑکی کے باہر ٹریفک کا شور سنائی دے رہا تھا پھر وہ تکلیف محسوس کرنے لگی۔ جہاں جہاں زخم آئے تھے، وہاں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ جہاں مار پڑی تھی، وہ حصہ دکھ رہا تھا لیکن وہ ابھی تک واضح طور سے نہیں سمجھ سکی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور وہ کس قسم کی تکلیفیں برداشت کر رہی ہے۔

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ پہلے نگاہوں کے سامنے کا منظر دھندلا سا تھا۔ پھر صاف ہونے لگا۔ اس کے سامنے جانی سر جھکائے کھڑا تھا، اسے دیکھتے ہی ساری باتیں روشن ہونے لگیں۔ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ بڑے کرب سے یاد آنے لگا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے سوچنے لگی۔ کیا سچ مچ ایسا ہو چکا ہے؟ کیا سچ مچ وہ میرے سامنے کھڑا ہے؟ کیا میں زخموں سے چور ہوں؟

وہ اسی طرح آنکھیں بند کئے، دونوں ہاتھ اٹھا کر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ٹٹولنے لگی۔ اس کا ہاتھ ہر اس مقام تک پہنچا جہاں جہاں زخم آئے تھے۔ کہیں اس کے ہاتھوں میں مرہم لگا، کہیں اس نے محسوس کیا کہ پٹیاں بندھی ہوئی ہیں پھر اس نے ایک دم سے حیران ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

وہ منہ سے کچھ نہیں بولی لیکن اس کی آنکھوں میں سوال تھا "جس نے زخم دیے اس نے مرہم رکھا ہے؟ جو سرکش بن کر آیا تھا، کیا وہی اس وقت سر جھکائے کھڑا ہوا ہے؟"

جانی نے ندامت سے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس ایک ساعت کے لیے دونوں کی نظریں ملیں پھر فرزانہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس ایک ساعت میں پتا چلا کہ جو ظالم تھا وہ مجرم بنا کھڑا ہوا تھا اور اس سے نگاہیں ملاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ بند آنکھوں کے پیچھے فرزانہ نے اس کی آواز سنی۔ وہ آواز لفظوں سے خالی تھی۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک رہا تھا۔ رکتے رکتے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں سکتا تھا۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ آدمی بچہ ہوتا۔ اس کے پاس زبان ہوتی، الفاظ نہ ہوتے۔ وہ

بولنے کی کوشش میں بچوں جیسی پیاری پیاری حرکتیں کرتا تو اس پر پیار آتا رہتا پھر کسی انسان کو کسی انسان پر غصہ نہ آتا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جب وہ بے ہوش تھی تو وہ بول رہا تھا اور جب ہوش میں آئی تو کچھ بول نہ سکا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے، ہم ایسی جگہ بولتے ہیں جہاں کوئی سننے والا نہ ہو اور جہاں سننے والا ہو، وہاں بولنے کی صلاحیتیں جواب دے جاتی ہیں۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے، وقت گزرتا جا رہا تھا۔ وہ ایسے اجنبی بن گئے تھے جن کی شناسائی خاموشی کی وجہ سے بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر فرزانہ نے اپنے اندر اتنی توانائی محسوس کی کہ اٹھ سکے اور اپنا حلیہ درست کر سکے۔ اس نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں لیکن اس کی طرف نہ دیکھا۔ اس کا دل و دماغ اس کے کان سب ادھر لگے تھے۔ ادھر یہ اپنے آپ میں سمٹی ہوئی بستر سے اٹھنے لگی۔ جانی نے جب اسے اٹھتے ہوئے دیکھا تو سہارا دینے کے لیے جھجکتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کی طرف ذرا جھکا۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر پیچھے کی طرف کھسک گئی۔

زخمی ہرنی بھاگتی نہیں ہے، کتراتی ہے۔ جانی پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے شوکیس کی طرف جھکی جھکی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں کے بے شمار ذرات فرش پر دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے کی کتنی چیزیں الٹ پلٹ کر یہ بتا رہی تھیں کہ تھوڑی دیر پہلے خوب تماشا ہوا تھا اور تماشا کرنے والا ابھی تک کھڑا تھا۔

کیوں کھڑا ہے؟ اب جاتا کیوں نہیں؟ فرزانہ نے دل میں سوچا مگر زبان سے نہیں پوچھا۔ وہ بستر پر آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے کنارے کی طرف آئی پھر بڑی مشکل سے کراہتے ہوئے فرش پر کھڑی ہو گئی، وہاں سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے "اسٹور روم" میں چلی گئی۔ جانی چپ چاپ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک جھاڑو لے کر آئی اور فرش پر بکھرے ہوئے کانچ کے ذروں کو جھاڑو سے سمیٹنے لگی۔

جانی نے تھوک نگل کر بڑی مشکل سے کہا "فرزانہ!.....تم..مجھے افسوس ہے۔"

وہ جھاڑو دیتے ہوئے رک گئی۔ سر اٹھا کر اسے گھور کر دیکھا پھر سر جھکا کر جھاڑو دینے میں مصروف ہو گئی۔ دو دشمن ایک چھت کے نیچے نہیں رہتے مگر وہ چھت تماشائی تھی۔ دیکھ رہی تھی کہ وقت کس طرح سمیٹ کر دو دشمنوں کو ایک مقام پر لے آتا ہے۔

جھاڑو کا آخری سرا فرش سے لگا ہوا تھا اور کانچ کے ذروں کو سمیٹتے سمیٹتے جانی کے قدموں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہاں فرزانہ کے ہاتھ رک گئے۔ جھاڑو رک گئی۔ وہ اسی طرح جھکی ہوئی تھی اور جھکی جھکی نظروں سے اس کے جوتوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انتظار کر رہی تھی کہ وہ ہٹے گا تو وہاں سے بھی کانچ کے ذروں کو سمیٹ کر ایک مقام پر پہنچائے گی۔

جانی اسی طرح کھڑا رہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ فرزانہ ضرورت مند ہے' اسے وہاں سے ہٹنے کے لیے کہے گی لیکن وہ بھی ضدی تھی۔ جانی کے آس پاس فرش پر جھاڑو پھیرتی ہوئی وہاں سے گزر گئی پھر شوکیس کے پاس پہنچی جہاں اس کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا اور اب اس مقام پر جم رہا تھا۔ وہ پھر اسٹور روم میں گئی۔ وہاں سے فرش پر ٹاکی لگانے والا کپڑا لے کر آئی اور خون کو پونچھنے لگی۔

جانی کو بڑی شرم آئی۔ جس کا خون بہا تھا' وہی ظلم کے نشان مٹا رہی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے ظلم کا جواز پیش کیا۔ "دیکھو میں تمہیں کبھی ہاتھ بھی نہ لگاتا مگر انصاف کی بات کرو۔ تم نے مجھے دھوکا دیا میری نظروں سے چھپتی رہیں اور غصہ دلا دلا کر مجھے پاگل بناتی رہیں۔ اگر میں نے پاگل پن میں ایسی حرکت کی تو اس میں میرا کتنا قصور ہے اور تمہاری کتنی غلطیاں ہیں۔"

اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ چپ چاپ اپنا کام کرتی رہی۔ ایک چھوٹے سے ٹین کے ڈبے میں تمام کانچ کے ریزوں کو سمیٹ کر ڈال دیا۔ فرش کی صفائی ہو گئی پھر اس نے کمرے کے گرے پڑے سامان کو درست کیا۔ اس دوران میں اس کی نظر آئینے پر گئی تو اس نے..... ذرا رک کر اپنے زخم کو آئینے میں دیکھا پھر گھوم کر جانی کو گھورنے لگی۔ جانی کی نظریں جھک گئیں۔ وہ ٹین کے ڈبے کو اٹھا کر وہاں سے ڈسپنسری کی طرف چلی گئی۔

یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ غصے میں ہے۔ جانی نے جو کچھ کیا' اس کے نتیجے میں نفرت ہی مل سکتی تھی۔ وہ شاید اسے ایک چھت کے نیچے برداشت بھی نہیں کر پا رہی تھی مگر اس سے بولنا بھی گوارا نہیں کر رہی تھی۔ لہٰذا اسے چلے جانے کے لیے بھی نہیں کہہ رہی تھی۔

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا پھر اندرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ بیرونی دروازے کے باہر کوئی آیا تھا یا کوئی آئی تھی۔ اندرونی دروازے کے پیچھے جانی تھا۔ اس کی رسوائی تھی یا اس کی کمزوری تھی۔ دیکھا جائے تو رسوائی کی بات نہ تھی۔ وہ جانی کو ڈسپنسری میں بلا کر آنے والے کے سامنے یہ ظاہر کر سکتی تھی کہ وہ کوئی دوائی لینے ڈسپنسری آیا تھا لیکن وہ اس کی کمزوری تھا اور ہر انسان اپنی کمزوری کو چھپا کر رکھتا ہے۔ وہ جلدی سے پلٹ کر اندرونی دروازے کے پاس آئی اس سے پہلے کہ جانی اس کی طرف آیا۔ اس نے دروازے کے پٹ کو جلدی سے بند کر کے اپنی طرف سے چٹخنی چڑھا دی۔

باہر سے دوسری بار دستک ہوئی پھر آواز سنائی دی۔ "باجی دروازہ کھولیے میں ارشد کمپاؤنڈر ہوں۔"

فرزانہ نے دروازہ کھول دیا۔ کمپاؤنڈر نے اسے دیکھتے ہی حیرانی سے پوچھا "باجی آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیسی حالت بنا رکھی ہے اور آپ کو تو جگہ جگہ زخم بھی آئے ہیں۔"

فرزانہ نے پوچھا "اندر آؤ گے یا باہر ہی سے بولتے رہو گے؟"

وہ اندر آگیا۔ دروازے کو اس نے بند کر دیا۔ وہ سوچ رہی تھی' کمرے کی صفائی تو کر دی اپنا حلیہ درست نہیں کیا اور کمپاؤنڈر کے سامنے چلی آئی۔ بہرحال اس نے بات بنا دی "میں اپنے کمرے میں شوکیس کے پاس ٹھوکر کھا کر گر پڑی تھی۔ شیشے ٹوٹ گئے میں بری طرح زخمی ہو گئی۔ جاؤ مرہم پٹی کا سامان لے آؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے خود اپنے لیے کچھ دوائیں تجویز کیں کیپسول اور ٹیبلٹس حلق سے اتار کر پانی پیا۔ اپنے لیے ایک انجکشن خود تیار کیا۔ کمپاؤنڈر نے مرہم پٹی کرنے کے بعد انجکشن لگایا۔ ساری چیزوں کو اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھا پھر کہا "باجی! آپ آرام کریں' میں آپ کے گھر کی صفائی کر دیتا ہوں۔ امی نے کہا ہے کہ آج بھی ہمارے ہاں سے آپ کا کھانا آئے گا۔"

وہ بولی "اپنی امی سے میرا سلام کہنا اور اب زحمت نہ کرو۔ میں خود پکا لیا کروں گی۔"

"نہیں باجی! کل آپ کی والدہ کا سوئم ہے کل تک آپ کو چولہا نہیں جلانا

چاہیے۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں' میں نے چولہا جلالیا ہے۔ خود پکالوں گی' تم اب جاؤ۔"

کمپاؤنڈر نے جانے کے لیے دروازہ کھولا پھر ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے کہا "پتا نہیں' کس نے یہاں ٹیکسی کھڑی کردی ہے آنے جانے کا راستہ روک دیا ہے۔"

فرزانہ نے ٹیکسی کو دیکھا ذرا سوچا پھر کہا "رہنے دو کلینک دو روز کے بعد کھلے گا۔ یہاں کسی کے آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ چلا گیا۔ فرزانہ نے دروازے کو پھر اندر سے بند کردیا۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ جانی کے متعلق سوچتے ہوئے اندرونی دروازے کے پاس آئی۔ اس کا دماغ کہہ رہا تھا جانی کو یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ دل معلوم نہیں کیا کہہ رہا تھا' وہ سننا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے دروازے کو کھول دیا۔ وہ سامنے ہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کو دیکھتے ہی فرزانہ جل گئی۔ غصے سے منہ پھیرلیا۔ اسے اپنے پیچھے اس کی آواز سنائی دی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں۔"

وہ اتنے قریب آکر بول رہا تھا کہ اسے اپنی گردن پر اس کے سانسوں کا بھبکا محسوس ہوا۔ وہ جلدی سے ایک قدم آگے بڑھ کر دور ہوگئی وہ پھر قریب آکر بولا "میں نے جو غلطی کی ہے اس کی تلافی کروں گا جتنے زخم پہنچائے ہیں' وہ جب تک نہیں بھریں گے' میں یہیں رہوں گا۔ تمہاری تیمارداری کرتا رہوں گا۔"

وہ ایک دم سے پلٹ کر بے اختیار بولنے پر مجبور ہوگئی "تم یہاں رہو گے' کیا تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے؟"

"دماغ تو اسی دن خراب ہوگیا تھا جب تم نے پہلی بار اپنی جھلک دکھائی اور آج تک چھپتی رہی تھیں۔"

"باتیں نہ بناؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"کیسے نہیں جاؤ گے؟ تم میرے کون لگتے ہو؟ یہاں کس رشتے سے رہو گے؟"

"جو رشتہ چاہے جوڑلو۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی "چلے جاؤ یہاں سے تم میرے کوئی نہیں لگتے ہو۔"

"میں کوئی نہیں لگتا ہوں تو پھر چیخنا شروع کردو۔ میں نے تم پر ظلم کیا ہے تمہیں نقصان پہنچایا ہے' اتنے زخم دیے ہیں کہ دنیا والوں کو دکھا کر مجھے سزا دلواسکتی ہو۔ مجھے جیل بھجواسکتی ہو۔ خاموش کیوں ہو؟ چیختی کیوں نہیں؟"

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی "میں بدنامی سے ڈرتی ہوں۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ کوئی کسی کے گھر میں گھس آئے تو گھر والی کو چیخنے چلانے اور قانونی تحفظ حاصل کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ دنیا والے تمہیں بدنام نہیں کریں گے' مجھے سزا دیں گے۔"

"جو تماشا تم کرچکے ہو' وہ میں دنیا والوں کو دکھانا نہیں چاہتی تم سے التجا کرتی ہوں' چلے جاؤ۔"

"تمہیں زخمی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"کیا تم مجھے بدنام کرو گے؟"

"تم نیک نامی سے حاصل نہ ہوئیں تو صرف تمہیں بدنام نہیں کروں گا' خود بھی بدنام ہوجاؤں گا۔"

"مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم کیا سمجھ کر یہ کہہ رہے ہو' کیا تمہاری بیوی نہیں ہے؟ کیا تمہارا بچہ نہیں ہے؟ مجھے کس رشتے سے حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ میں نے کبھی نہیں سوچا۔ تم مجھے دوڑاتی رہیں۔ میں تمہارے پیچھے دوڑتا رہا۔ اب ہم مل گئے ہیں تو رشتہ بھی طے کرلیں گے۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"تمہیں بحث نہیں کرنا چاہیے' تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کمرے میں چل کر آرام سے لیٹ جاؤ۔"

"میں تمہاری موجودگی میں......" وہ کہتے کہتے رک گئی پھر ایک دم نرم لہجے میں بولی "کیا تم چاہتے ہو' میں آرام کروں؟"

"بے شک میں یہی چاہتا ہوں۔"

"تو پھر چلے جاؤ۔ میں یہاں آرام سے لیٹی رہوں گی۔ تم رہو گے تو یہ ممکن نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے' میں باہر کھڑا رہوں گا۔"

وہ گھور کر بولی "یہ کیا بات ہوئی' تم باہر کیوں رہو گے؟"

"میری مرضی ہے۔ یہ تمہارا گھر ہے' تم مجھے نکال رہی ہو' ہر جگہ تمہاری مرضی نہیں چل سکتی۔ کیا تم مجھے دنیا سے بھی نکال دو گی؟"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف جانے لگا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے بولی "ٹھہرو تم میرے گھر کے سامنے نہیں رہ سکتے' لوگ کیا کہیں گے؟"

"میں اس طرح رہوں گا کہ لوگ تمہارے اور میرے تعلق کو نہ سمجھ سکیں گے۔"

"نہیں جانی! یہاں آس پاس مت رہنا۔ دنیا والے سب سمجھتے ہیں۔"

"ایک شرط پر چلا جاتا ہوں' شام کو آؤں گا۔"

"کیوں آؤ گے؟"

"تمہاری خیریت پوچھنے۔ تمہارے زخموں پر مرہم رکھنے۔ تم سے ملنے' تم سے باتیں کرنے۔ تمہیں دیکھنے اور تمہیں چاہنے۔"

"ایسی باتیں مت کرو۔ تم کون ہوتے ہو مجھے چاہنے والے؟"

"چاہنے والا ہوتا ہوں۔"

وہ بیرونی دروازے کے قریب پہنچ گیا پھر چٹخنی نیچے گرانے سے پہلے بولا "میں جارہا ہوں۔ رات کے آٹھ بجے میری ٹیکسی سڑک کے اس پار کھڑی ہوگی۔ تم چپ چاپ آکر اگلی سیٹ پر بیٹھ جانا۔ اگر نہیں آؤ گی تو میں دروازے پر دستک دوں گا۔ تم دروازہ نہیں کھولو گی تو میں ٹیکسی میں ساری رات گزار دوں گا پھر سڑک کے اس پار یہ ٹیکسی میرا گھر بن جائے گی۔ میں اسی طرح رہوں گا' اسی میں کھاؤں گا' اسی میں سوؤں گا' تمہارے مہربان ہونے تک وہاں انتظار کرتا رہوں گا۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ یہ کھلے ہوئے دروازے کو تکتی رہی پھر خیال آیا کہ یوں سوچ میں گم رہ کر اسے نہیں تکنا چاہیے۔ نہیں تو اس کا حوصلہ اور بڑھ جائے گا۔

یہ سوچتے ہی اس نے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔

دروازہ بند ہوگیا۔ وہ نظروں سے گم ہوگیا مگر چاہت جس سے منسوب ہوتی ہے' وہ کبھی سرتاج بن کر اور کبھی بے تاج بن کر اتنا کچھ دے جاتا ہے کہ عورت اس کی تصویریں اپنی ذات میں دیکھتی ہے۔ وہ جہاں جہاں زخم دے گیا تھا' وہاں وہاں اپنے نقش قدم چھوڑ گیا تھا۔ جہاں جہاں بدن دکھ رہا تھا وہ دکھائی دے رہا تھا۔ دروازہ بند کرو اور تصویروں پر پردہ ڈال دو تو تصور اور زیادہ روشن ہوجاتا ہے۔

○☆○
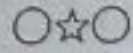
فرید احمد' کامران کو فیڈر سے دودھ پلا رہے تھے اور مسکرا کر اپنی بیگم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بیگم آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کررہی تھیں۔ انہوں نے کہا "بڑھاپے میں اللہ میاں نے ہمیں ایک بیٹا دے دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے یہ ہمارا ہی بچہ ہے۔"

بیگم نے پلٹ کر کہا "یہ ہمارا ہی تو ہے' کیا آپ اسے پرایا سمجھتے ہیں؟"

"پرایا تو نہیں ہے مگر ہماری بیٹی کا بیٹا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ صرف ہمارا ہوتا۔"

وہ اونہہ کہہ کر آئینے کے سامنے ہوگئیں۔ فرید احمد نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے فخر سے کہا "اونہہ نہ کہو' رخسانہ تو ہماری ہے۔"

وہ چوٹی گوندھتے ہوئے قریب آئیں اور کامران کو گود میں لیتے ہوئے کہا "مزار کی مٹی کھائی' تب وہ ہوئی تھی زیادہ فخر نہ کرو۔"

فرید احمد نے ایک گہری سانس لی۔ بے بسی سے چھت کو تکنے لگے جیسے آسمان سے شکایت کررہے ہوں۔ بیگم نے کامران کا لباس بدلتے ہوئے کہا "صبح سے شام ہوگئی مگر جانی کھانے کے لیے نہیں آیا۔ اب مجھے اس کے لیے کھانا لے جانا ہوگا۔"

"یہ تو اچھی ڈیوٹی لگ گئی ہے۔ وہ یہاں آتا نہیں ہے اور تم ٹفن کیریئر لے کر اس کے پاس چلی جاتی ہو اور بچے کو میں سنبھالتا رہتا ہوں۔"

"آپ سنبھالتے ہیں تو اپنے نواسے پر احسان نہیں کرتے ہیں۔"

"مگر یہ کیا تک ہے بیگم۔ وہ لڑکا یہاں کھانا کھانے کیوں نہیں آتا۔ کیا ضروری ہے کہ اس کا کھانا وہاں پہنچ جائے؟"

"آپ رخسانہ کی ذہانت کو نہیں سمجھیں گے۔ آخر وہ میری بیٹی ہے۔ مرد کو کنٹرول کرنا جانتی ہے۔ وہ مجھے سمجھا کر گئی ہے کہ جانی یہاں کھانے کے لیے نہ آئے تو میں اس کے لیے کھانا وہاں لے جایا کروں۔ کبھی نہ کبھی اسے شرمندگی ہوگی کہ میں بزرگ ہو کر اس کا کھانا اس کے پاس پہنچاتی ہوں۔"

"اس میں مصلحت کیا ہے؟"

"یہ ہے کہ جانی یہاں تین وقت آئے تو ہماری نظروں میں رہے گا۔ نہیں آئے گا تو میں وہاں کھانا لے کر جایا کروں گی اور اس کی نگرانی کرتی رہوں گی اور اسے بھٹکنے نہیں دوں گی۔ بھٹکنے لگے گا تو اس کی خبر مجھے ہوتی رہے گی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ٹفن کیریئر میں جانی کے لیے کھانا لے کر گھر سے نکلیں۔ ناظم آباد سات نمبر کے اسٹاپ سے ایک بس میں سوار ہوئیں اور ناگن چورنگی کی طرف جانے لگیں۔ شام کا وقت تھا۔ بس میں مردوں اور عورتوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ خصوصاً عورتیں ٹھسا ٹھس بھری ہوئی تھیں۔ ایک دوسری پر چڑھی آ رہی تھیں۔ اس پر کچھ عورتیں ایسی تھیں جو گھریلو ضروریات کا سامان اٹھائے ہوئے تھیں اور کچھ عورتیں بچوں کو اپنے اوپر لادے ہوئے تھیں۔ بس ڈرائیور بڑی ترنگ میں تھا۔ اونچی آواز میں کیسٹ ریکارڈر سے گانے سن رہا تھا اور بڑی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھتے چڑھتے رہ گئی۔ ڈرائیور نے بڑی پھرتی سے سنبھال لیا۔ کتنی ہی عورتوں کی چیخیں نکلیں بس کے مردانے حصے سے کتنے ہی لوگ ڈرائیور کو گالیاں دینے لگے۔

مشکل یہ ہے کہ ڈرائیوروں کو سمجھایا جائے تو بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ گالیاں دی جائیں تو انہیں اور غصہ آتا ہے۔ وہ ضد میں آ کر گاڑی کو اور بے لگام چھوڑ دیتے ہیں۔ ٹھیک ناگن چورنگی کے پاس پہنچتے ہی جہاں گاڑی کو رکنا تھا' وہاں ڈرائیور نے ایک گاڑی سے اوور ٹیک کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گاڑیاں آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے گزریں۔ دونوں ہی گاڑیاں ڈگمگائیں' ایک دوسری سڑک کے فٹ پاتھ پر چلی گئی۔ دوسری اپنی جگہ تھم گئی۔ اس وقت تک عورتیں اور بچے چیخ رہے تھے۔ کتنے ہی مسافر ایک دوسرے پر آ پڑے تھے۔ کسی کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ کوئی چیخ رہا تھا' کوئی کراہ رہا تھا۔ عورتوں کی بھی یہی حالت تھی۔

رخسانہ کی امی نیچے دبی ہوئی تھیں۔ اوپر معلوم نہیں کتنی عورتیں آ پڑی تھیں۔ بچے رو رہے تھے۔ عورتیں رو رہی تھیں اور ڈرائیور کو گالیاں دے رہی تھیں۔ کوئی اپنے سامان کو رو رہی تھیں اور ڈرائیور کو گالیاں دے رہی تھیں۔ کوئی اپنے سامان کو سیٹ رہی تھی۔ کسی عورت کی سبزی سے بھری ہوئی ٹوکری بیگم کے سر پر الٹ گئی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکلوں سے خود کو عورتوں کے درمیان سے نکالا۔ آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔ ان کا حلیہ عجیب تھا۔ ٹماٹر پچک کر ان کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ کھلے ہوئے منہ میں کچے گوشت کی ایک بوٹی آ گئی تھی۔

تھو..... تھو۔ انہوں نے بوٹی منہ سے باہر تھوک دی۔ منہ بساندا ہو رہا تھا۔ بدن دکھ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں چوٹیں آئی تھیں۔ لباس بھی ایک آدھ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ انہوں نے عورتوں کی بھیڑ میں سے ڈھونڈ کر ٹفن کیریئر کو ہاتھ میں لیا پھر راستہ بناتے ہوئے بس سے باہر آ گئیں۔ چاروں طرف عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ سب ڈرائیور کو پکڑے ہوئے گالیاں دے رہے تھے اور اسے مار رہے تھے۔ کچھ لوگ زخمی مسافروں کو طبی امداد پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بیگم کراہتی ہوئی اس بھیڑ سے نکل گئیں۔ قریب ہی جانی کا مکان تھا۔ انہوں نے سوچا کہ وہاں پہنچ کر اپنے داماد کی ٹیکسی میں بیٹھ کر کسی ڈاکٹر کے پاس جائیں گی۔

جانی گھر میں تھا۔ اس نے ایک بہترین پتلون اور بشرٹ پہنی ہوئی تھی۔ شیو کرنے کے بعد چہرے کو خوب جھاڑ پونچھ کر صاف کیا تھا اور اب آئینے کے سامنے کنگھا کر رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے فرزانہ کی صورت گھوم رہی تھی' وہ کہہ کر آیا تھا کہ آٹھ بجے تک اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ ابھی پانچ بجنے والے تھے مگر بے چینی ایسی تھی کہ ابھی سے جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

وہ کنگھی کرنے کے بعد اسے آئینے کے سامنے رکھنے لگا۔ تب اچانک ہی اس کنگھی سے رخسانہ کی آواز سنائی دینے لگی "کتنی بار سمجھایا ہے' میری کنگھی استعمال نہ کیا کرو' تمہارے سر میں بھی جوئیں پڑ جائیں گی۔"

آئینے کی سطح پر اس کا عکس مٹ گیا۔ رخسانہ نظر آنے لگی۔ وہ بہت ہی نفاست پسند تھی۔ صفائی کا بڑا خیال رکھتی تھی لیکن جب کبھی اپنی امی کے پاس ہوتی تھی تو سر میں

جوئیں بھر کر آتی تھی۔ اس نے بڑے دکھ سے پوچھا "جانی۔ جانی بن سنور کر کہاں جا رہے ہو؟"

وہ ہچکچانے لگا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رخسانہ کے عکس نے کہا "دیکھو، جھوٹ نہ بولنا تم نے وعدہ کیا تھا۔ جانی نے کہا "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس سے خود نہیں ملا۔ بس تقدیر ادھر لے گئی۔"

"دیکھو جانی، مرد اپنی عورت کی تقدیر بناتا ہے اور تم کسی عورت سے اپنی تقدیر بنانے جا رہے ہو، کیا یہ اچھی بات ہے؟ کیا تم اسے میری جگہ دو گے؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا "نہیں نہیں میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ تم اتنی اچھی ہو، اتنی پیاری ہو کہ میں تمہاری جگہ کسی کو نہیں دے سکتا۔"

"دیکھو پھر اپنی قسم اور اپنا وعدہ یاد کرو کہ تم میرے آنے تک کبھی دوسری شادی کا خیال تک دل میں نہیں لاؤ گے۔ کسی کو میری جگہ نہ دو گے۔"

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ تم نے کہا تھا کہ میں پانچ برس تک کبھی دوسری شادی کا خیال بھی دماغ میں نہ لاؤں اور میں نے تم سے کہا تھا۔ جب تک تم میری شریک حیات رہو گی۔ اس وقت تک کوئی دوسری تمہاری جگہ نہیں لے گی۔"

"وہ جگہ لے رہی ہے۔ دیکھو جانی! تم آئینہ دیکھتے ہو تو اسے دیکھتے ہو مجھے نہیں دیکھتے۔"

"خدا کی قسم اس وقت میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ دنیا کا ہر تصور، ہر خواہش، ہر محبت، ہر رشتہ مٹ گیا ہے تم ہی تم نظر آ رہی ہو۔"

اچانک ہی وہ آئینے کی سطح سے مٹ گئی اور اس کی ساس نظر آنے لگیں۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بہت ہی برے حلیے میں تھیں۔ ان کا منہ رونے جیسا تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر جانی ایک دم سے چونک گیا۔ آہستہ آہستہ قریب آتے ہوئے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ اچانک ہی عامل بابا کی بات یاد آ گئی۔ آج شام تک وہ بالوں والی تمہارے پاس بہت ہی بری حالت میں پہنچے گی۔"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولیں "بیٹا مجھے سخت چوٹیں آئی ہیں، وہاں بس کا حادثہ ہو گیا تھا مجھے فوراً ہی کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔"

جانی کی نظریں اس کے سر پر پہنچ کر اٹک گئیں۔ بیگم نے اپنے سر میں جہاں ایک ہیرپن لگائی تھی، وہاں ہیرپن سے گوشت کی ایک بوٹی اٹکی ہوئی تھی اور جانی کے دماغ میں عامل بابا کی بات گونج رہی تھی کہ وہ بالوں والی جس محلے میں ہوگی، وہاں گوشت کی بوٹی پھینکی جائے گی تو اس کے عمل سے وہ کھنچی چلی آئے گی اور ساس صاحبہ کھنچی آئی تھیں۔

انہوں نے پوچھا "بیٹے! تم اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیوں دیکھ رہے ہو؟"

وہ خیالات سے چونک گیا پھر جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا "میں آپ کے حال پر ترس کھا رہا ہوں، مجھے آپ سے بے حد ہمدردی ہے، آیئے میں ابھی ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔" وہ فوراً ہی پلٹ گئیں۔ جانی نے انہیں روکتے ہوئے کہا "ٹھہریے آپ کو اتنی تیزی سے نہیں چلنا چاہیے۔"

"کیوں نہیں چلنا چاہیے؟"

اس نے سر پر رکھی ہوئی کچے گوشت کی بوٹی کو دیکھتے ہوئے کہا "چلتے ہوئے جھٹکا لگے گا تو یہ گر جائے گی۔"

انہوں نے حیرانی سے پوچھا "کیا گر جائے گا؟"

"میرا مطلب ہے، آپ کو چوٹیں آئی ہیں۔ آپ گر سکتی ہیں اس لیے سنبھل سنبھل کر چلنا چاہیے۔ ٹھہریے، میں آپ کو سہارا دے کر لے جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازے کو بند کیا۔ تالا لگایا پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا "میرا ہاتھ تھام لیجئے، میں آپ کو آرام سے لے جاؤں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولیں "بیٹا! تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو، کتنی عزت کرتے ہو۔"

وہ اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل کر ٹیکسی تک آئیں۔ جانی نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر انہیں بٹھایا پھر دوسری طرف سے گھوم کر خود اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور بڑے آرام سے ڈرائیو کرنے لگا۔ اس نے عقب نما آئینے کو بالکل جھکا دیا تھا اور اس زاویے پر رکھا تھا کہ اپنی ساس کا سر نظر آ رہا تھا اور سر پر وہ بوٹی رکھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بوٹی سر سے گرنے نہ پائے۔

انہوں نے پوچھا "تم اتنی آہستہ سے گاڑی کیوں چلا رہے ہو؟"

"میں آپ کو آرام سے ڈاکٹر کے پاس پہنچانا چاہتا ہوں۔ تیزی سے چلاؤں گا' گاڑی کو جھٹکے لگیں گے تو آپ کو تکلیف ہوگی۔"

وہ مسکرا کر دعائیں دینے لگیں پھر کہا "میری ڈاکٹر بیٹی ہوتی تو گھر ہی میں علاج ہوتا۔ اللہ جانے اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔ اللہ اسے خیریت سے رکھے۔"

جانی نے پوچھا "رخسانہ کو گئے آج تیسرا دن ہے اس کا خط کب تک آسکتا ہے؟"

وہ کچھ سوچ کر بولیں "زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں خط آجانا چاہیے۔"

"اس کے جانے کے بعد آپ اس فکر میں مبتلا ہوگئی ہیں کہ میں کہیں بہک نہ جاؤں یا دوسری شادی نہ کرلوں۔"

وہ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بولیں "نہیں' میں ایسا نہیں سوچتی تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

"بس یونہی' جب آنکھوں کے سامنے کوئی بات ہوتی ہے' کوئی تجربہ سامنے ہو تو ایسا بولنا پڑتا ہے۔"

"میں نہیں سمجھی۔ کیسا تجربہ؟ تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میرے ایک دوست کی ساس ہے وہ اس پر جادو ٹونے کرتی رہتی ہے۔"

"کیا تم مجھ پر شبہ کر رہے ہو؟"

"بالکل نہیں۔ سورج مشرق سے نکلتا ہے تو کیا اس بات پر شبہ کیا جاسکتا ہے؟"

وہ سامنے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولیں "یہ تم کدھر جارہے ہو؟ مجھے کس ڈاکٹر کے پاس لے جارہے ہو؟"

"ڈاکٹر ذرا دور رہتا ہے میری جان پہچان والا ہے۔ وہ سستا علاج کرے گا' اچھا علاج کرے گا۔"

وہ مطمئن ہوگئیں۔ تھوڑی دیر تک چپ چاپ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی رہیں پھر چونک کر بولیں "ابھی تم نے مجھ پر شبہ کیا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں' بس یونہی ایک انسان دوسرے انسان پر شبہ کرتا ہے پھر وہ شبہ دور ہوجاتا ہے۔ میرا شبہ دور ہوچکا ہے۔"

"آخر سنوں تو۔ تم میرے متعلق کیا رائے قائم کر رہے ہو؟"

اس نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا "کامی کیسا ہے؟"

"اچھا ہے' تم کیسے باپ ہو' اسے صبح سے دیکھنے بھی نہیں آئے؟"

"میں مصروف تھا پھر آؤں گا۔"

"ابھی ڈاکٹر سے دوا لینے کے بعد تم میرے ساتھ گھر چلو گے اور کامی کو پیار کرو گے۔"

"ہاں کروں گا۔" وہ انہیں باتوں میں ٹالتا رہا اور فاصلے طے کرتا رہا پھر اس نے عامل بابا کے مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ گاڑی سے اتر کر دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "آئیے تشریف لائیے۔"

وہ باہر نکلتے ہوئے آس پاس دیکھتے ہوئے بولیں "یہ تم کہاں لے آئے ہو؟ یہ کس کا مکان؟"

یہ کہتے ہوئے ان کی نظر بڑے سے سائن بورڈ پر پڑی پھر وہ حیرانی سے بولیں "یہ تو کسی عامل کا مکان معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں' وہ جھاڑ پھونک کے ذریعے آپ کی ساری تکلیفیں دور کردیں گے۔ آئیے۔"

اس نے ہاتھ پکڑ لیا اور تقریباً کھینچتے ہوئے دروازے پر لے آیا۔

"کون ہے؟" اندر مسند پر بیٹھے ہوئے عامل بابا نے اپنے ماتحت سے پوچھا "کس کی گاڑی آئی ہے؟"

ان کے ماتحت نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا "استاد! وہی ٹیکسی ڈرائیور ہے جو سات سو روپے دے کر گیا تھا۔"

"تم بکرے کا سر اور پائے خرید کر لائے ہو؟"

"لے آیا ہوں۔ آخری کمرے میں رکھے ہیں۔"

"جاؤ انہیں لے آؤ اور دروازہ کھول دو۔"

اس نے دروازے کو کھول دیا۔ جانی اپنی ساس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے آیا۔ وہ کہہ رہی تھیں "ارے تم مجھے اس طرح کیوں کھینچ رہے ہو؟"

جانی نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے عامل بابا سے کہا "بابا جی آپنے بہت ہی اچھا عمل پڑھا ہے' چور پکڑا گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ میری محبوبہ نے مجھ پر جادو کیا ہے لیکن

جادوگرنی یہ ہے دیکھیے جو گوشت کی بوٹی آپ نے ناظم آباد کے اس محلے میں پھینکوائی ہوگی وہ بوٹی اس کے سر پر آکر چپک گئی ہے۔"

عامل بابا نے شدید حیرانی سے ان کے سر میں چپکی گوشت کی اکلوتی بوٹی کو دیکھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایسا ہو جائے گا۔ سات سو روپے تو ان کی جیب میں پڑے تھے۔ صرف بیس روپے میں بکری کا سر اور پائے خریدے گئے تھے تاکہ ثبوت کے طور پر بھی جانی کے سامنے پیش کیے جاسکیں اور اس وقت ان کے ماتحت نے وہ ثبوت بھی لا کر پیش کر دیا۔

بیگم نے جانی کی بات سنتے ہی اپنے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ بوٹی ہاتھ میں آگئی۔ انہوں نے اسے ایک طرف کھینچتے ہوئے کہا "یہ تو بس کا حادثہ ہو گیا تھا۔ ایک عورت کی گوشت کی ٹوکری مجھ پر الٹ گئی تھی۔ وہ گوشت سر پر چپک گیا۔"

اس کی بات سنتے ہی عامل بابا نے زوردار قہقہہ لگایا پھر کہا "چالاک جادوگرنی! اب تیری بات نہیں بنے گی۔ میں کوئی معمولی عامل نہیں ہوں۔ میں نے عمل پڑھا اور تو گرفتار ہو گئی۔"

جانی نے اپنی جیب سے وہ چھوٹی سی ڈبیا نکالی پھر اسے کھول کر چٹکی میں بالوں کو پکڑ کر بابا جی کے سامنے لاتے ہوئے کہا "اب اس سے پوچھیے' کیا یہ بال اس کے نہیں ہیں؟"

عامل بابا نے سرہلا کر کہا "بے شک اسی کے بال ہیں اور یہ ابھی اقرار کرے گی۔"

بیگم نے پریشان ہو کر اپنے بالوں کو دیکھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ان کے بالوں کا بھید یوں کھل جائے گا۔ انہوں نے ڈھیٹ بن کر انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا "نہیں! یہ میرے بال نہیں ہیں۔ بھلا میں اپنے داماد کے پاس کیوں چھوڑوں گی۔"

"جادو کرنے کے لیے اور اپنے داماد کو تسخیر کرنے کے لیے۔"

جانی نے کہا "ہاں تم مجھے اپنی مٹھی میں رکھنا چاہتی تھیں تاکہ میں تمہاری بیٹی کی غیر موجودگی میں کسی دوسری طرف نہ بھٹک جاؤں مجھے گمراہی سے روکنے کے لیے تم نے یہ جادو ٹونے سے کام لیا ہے۔"

بیگم نے بڑی محبت سے پچکارتے ہوئے کہا "جانی تم میرے بیٹے ہو۔ میں بھلا تم پر کیوں جادو کروں گی۔"

"بس اب مجھے بیٹا نہ کہنا۔ کل رات کو جب میں نے تمہارا ایک بال جلایا تھا اور تم حاضر ہو گئی تھیں' اسی وقت مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا پھر بھی میں نہ سمجھ سکا مگر اب دھوکا نہیں کھاؤں گا۔"

عامل بابا نے کہا' یہ اس طرح اقرار نہیں کرے گی۔ ابھی میرے آدمی اسے رسیوں سے باندھیں گے' اسے فرش پر بٹھائیں گے اور اس کے سامنے ایک انگیٹھی سلگا کر اس میں مرچیں ڈالیں گے۔ جب مرچوں کا دھواں اس کی ناک میں جائے گا تو اس کے اندر سے وہ چڑیل نکل کر بولنے لگے گی۔"

"یا اللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولیں "جانی مجھے معاف کر دو۔ اب اگر مجھے کبھی دوسری زندگی ملی تو میں بیٹی پیدا نہیں کروں گی۔ اگر بیٹی ہوئی تو کسی ٹیکسی ڈرائیور کو داماد نہیں بناؤں گی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو میں اقرار کرتی ہوں کہ یہ بال میرے ہیں مگر میں نے کوئی جادو نہیں کیا ہے۔ اگر تم لوگ مرچوں کا دھواں میری ناک تک پہنچانا چاہتے ہو تو میں مجبوراً اقرار کرتی ہوں کہ میں نے جادو بھی کیا تھا۔ بس خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو' مجھے جانے دو۔"

عامل بابا نے کہا "تمہارا داماد ہی تمہیں معاف کر سکتا ہے ورنہ میں تو ابھی ایسا عمل پڑھوں گا کہ تم جل کر راکھ ہو جاؤ گی۔"

جانی نے آگے بڑھ کر خوشامدانہ انداز میں کہا "بابا جی آپ کی بڑی مہربانی' آپ ایسا عمل پڑھیں کہ بیٹی کے جہیز میں آنے والی ہر ساس جل کر راکھ ہو جائے۔"

عامل بابا اٹھ کر بیٹھ گئے جیسے عمل پڑھنے والے ہوں۔ بیگم نے گھبرا کر پہلے تو بابا جی کو دیکھا پھر فوراً ہی جیسے عقل آگئی۔ وہ جانی کی طرف گھوم کر چونکتے ہوئے بولیں "ہائے میں تو بھول ہی گئی کامران کے دودھ پینے کا وقت ہو گیا ہے اور اس کے نانا کو پتا نہیں ہے کہ کتنا دودھ اور کتنا پانی ملانا چاہیے۔"

جانی سوچنے کے انداز میں ان کا منہ تکنے لگا۔ اس کے تصور میں اس کا ننھا سا بیٹا رو رہا تھا اور دودھ کے لیے مچل رہا تھا۔ بیگم نے کہا "بابا جی سے کہو' مجھے تھوڑی سی مہلت دے دیں۔ میں بچے کو دودھ پلا دوں اس کے بعد یہ مجھے جلا کر راکھ کر دیں۔"

جانی نے چونک کر کہا "کس کی مجال ہے کہ آپ کو نقصان پہنچائے۔ آپ مرجائیں

گی تو میرے بیٹے کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اسے دودھ کون پلائے گا۔ میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔"

یہ کہتے ہی وہ اپنی ساس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لے گیا۔ بابا جی حیرانی سے دیکھتے رہ گئے۔ وہ گاڑی میں اپنی ساس کو بٹھانے کے بعد اسے ڈرائیو کرتے ہوئے بولا "آپ کے ہاتھ میں میری بہت بڑی کمزوری ہے' میں آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر ایک بات کان کھول کر سن لیجیے۔ آئندہ میں آپ کے گھر کھانا کھانے نہیں آؤں گا۔ آپ کے گھر کا پانی بھی نہیں پیوں گا معلوم نہیں کیا پڑھ کر پھونک دیں اور میں مر جاؤں۔"

"جانی ایسا کیوں سوچتے ہو؟ تم میری بیٹی کے سہاگ ہو۔ میں تمہیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہوں؟"

"بس اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ آپ میرے گھر کی طرف بھی نہیں آئیں گی۔"

"واہ کیوں نہیں آؤں گی' وہ میری بیٹی کا بھی گھر ہے۔ اس نے جاتے وقت تاکید کی تھی کہ میں وہاں آتی جاتی رہوں اور تم پر نظر رکھوں۔"

"بس بس' اب جاسوسی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو کہتا ہوں اس پر عمل کریں۔ اگر آپ میرے گھر کی طرف آئیں گی تو میں اپنے بچے کو آپ کے گھر سے لے آؤں گا اور رخسانہ کے آنے تک تمام رشتے توڑ دوں گا۔ ہو سکا تو میں بچے کو لے کر کراچی سے چلا جاؤں گا۔"

"نہیں جانی ایسا ظلم نہ کرنا۔ کامی میری بیٹی کی یاد دلاتا ہے۔ میں اس کو پیار کرتی ہوں تو وہ پیار میری بیٹی کو پہنچتا ہے خدا کے لیے مجھے کامی سے جدا نہ کرنا۔"

"میں آپ کی طرح ظالم نہیں ہوں اسی لیے کہتا ہوں آپ میرے گھر کی طرف نہ آئیں۔ میں آپ کے گھر میں صرف اپنے بیٹے کو پیار کرنے کے لیے آؤں گا پھر چلا جاؤں گا۔ اگر یہ منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ سمجھ لیں جس دن آپ میرے گھر کی طرف آئیں گی' اس دن کامی آپ کے گھر سے چلا جائے گا۔"

اس نے مکان کے سامنے ٹیکسی روک دی۔ بیگم سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ جانی نے پوچھا "اب کیا سوچ رہی ہیں گھر آگیا ہے چلیے۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آئیں۔ جانی ٹیکسی سے باہر نکل کر ان کے پیچھے چلتا ہوا مکان میں داخل ہوا' وہاں فرید احمد نے اپنی بیگم کا حلیہ دیکھا تو حیران رہ گئے پریشان ہو کر جانی کی طرف دیکھا۔ یہ شبہ ہوا کہ ساس اور داماد میں جھگڑا ہوا ہے اور یقیناً جانی اپنی جہالت کی وجہ سے ہاتھا پائی پر اتر آیا ہوگا۔

اب فرید احمد میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ جانی سے ہاتھا پائی پر اتر آتے۔ تاہم انہوں نے غصہ دکھاتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا "کیا بات ہے؟ کیا ہوا میری بیگم کو؟"

"بیگم آپ کے سامنے کھڑی ہیں' آپ ان سے پوچھیے' مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں۔"

بیگم نے جھجکتے ہوئے کہا "میں جانی کے لیے کھانا لے جا رہی تھی کہ بس کا حادثہ ہو گیا' وہاں میری یہ حالت ہو گئی۔"

جانی نے ہاتھ نچا کر کہا "دیکھو جھوٹ مت بولو۔ نہیں تو مجھ کو غصہ آجائے گا۔ بس کا حادثہ تو ایک بہانہ ہے۔ اصل میں عامل بابا کی کرامات نے تمہیں اس حال کو پہنچایا ہے۔"

فرید احمد نے حیرانی سے پوچھا "کیسی کرامات؟"

"عامل بابا نے ان کے بالوں پر عمل کیا تھا۔ گوشت کی بوٹیاں پھینکی تھیں۔ ایک بوٹی ان کے بالوں سے جا کر چپک گئی اور ان کی یہ حالت ہو گئی۔"

بیگم کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ جانی نے ہاتھ بڑھا کر کہا "خبردار! ابھی کچھ نہ بولنا مجھے بولنے دو۔" یہ کہہ کر اس نے فرید احمد کو مخاطب کیا "انہوں نے اپنے بال میرے پاس پہنچائے تھے۔ آپ کیسے شوہر ہیں؟ اپنی بیوی کو ان حرکتوں سے منع نہیں کر سکتے تھے؟ ایسی حرکتیں عورتیں نہیں کرتیں چڑیلیں کرتی ہیں۔ اب میں نے الٹا عمل کروا دیا تو دیکھ لیجیے' نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ ایمان سے' رخسانہ کی قسم کھا کر' اپنے نواسے کی قسم کھا کر کہیں کہ آپ کی بیگم نے اپنے سر کے بال میرے پاس نہیں پہنچائے؟"

بیگم نے اس سے دور ہٹ کر ڈرتے ہوئے کہا "نہیں یہ جھوٹ ہے۔ وہ میرے بال نہیں تھے۔"

جانی نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کے انداز میں کہا "مجھے جھوٹ بولنے سے غصہ آتا ہے۔ ابھی تم نے عامل بابا کے سامنے اقرار کیا تھا۔"

"میں تمہاری ساس ہوں، مجھے تم نہ کہو۔"

"ساس صرف بولنے کے لیے ایک رشتہ ہے ورنہ عورت اپنے داماد کو بھی ماں کی محبت دے سکتی ہے میری کوئی اماں نہیں ہے تم چاہتیں تو میری ماں بن کر دکھا سکتی تھیں لیکن تم سچ مچ یہ ثابت کر رہی ہو کہ بیوی کی ماں آخر ساس ہی ہوتی ہے۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ گٹھ جوڑ کرتی رہتی ہے۔ جیسا کہ تم نے مجھ پر جادو ٹونے کروائے' اپنے بال میرے پاس رکھتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ کیا کسی شریف گھرانے کی معزز خاتون ایسا کر سکتی ہے؟"

وہ غصے سے پیر پٹختا دوسرے کمرے میں اپنے بیٹے کے پاس چلا گیا۔ بیگم کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں نڈھال سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ان کے قریب ہی فرید احمد نے بیٹھتے ہوئے آہستگی سے کہا "میں ایسے ہی وقت کے لیے سمجھاتا ہوں مگر تم الٹی سیدھی حرکتوں سے باز نہیں آتیں۔"

"میں نے کیا کیا ہے' کیا میں اس پر جادو کر رہی تھی؟"

"نہیں کر رہی تھیں لیکن اپنے بال توڑ کر اس کی ڈبیا میں تو رکھے تھے' کیا ضرورت تھی اپنے بال توڑ کر اس کی ڈبیا میں رکھنے کی۔ آسان تو یہ تھا کہ ڈبیا میں جو بال تھے' ہوا میں اڑا دیے جاتے۔ ایک ذرا سی حماقت سے کیسی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔"

"آپ میرے پاس بیٹھے ہوئے بولے جا رہے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ داماد کی غلط فہمی دور کریں۔"

"میں کتنی غلط فہمیاں دور کر سکتا ہوں' ٹھیک ہے کہ وہ غلط سمجھ رہا ہے لیکن یہ بات سچ ہے کہ تم داماد کے خلاف گٹھ جوڑ کرتی رہتی ہو۔ اگر تم جانی کی ماں ہوتیں تو کبھی یہ برداشت نہ کرتیں کہ تمہاری بہو جھوٹ بول کر اور تمہارے بیٹے کو دھوکا دے کر لندن جائے چونکہ تم ساس ہو اس لیے تم نے اپنی بیٹی کے جھوٹ اور فریب کو برداشت کر لیا بلکہ فریب دینے کی تعلیم بھی تم نے ہی بیٹی کو دی۔"

وہ غصے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد اپنا حلیہ بدل کر لباس تبدیل کر کے باہر آئیں۔ اسی وقت جانی بھی کامی کو گود میں لے کر کھلاتا ہوا' اس کو چومتا ہوا بیٹھک میں آیا پھر اس نے فرید احمد سے کہا "میں آپ کو بھی یہ بات سمجھا دوں کہ مجھے آپ دونوں پر بالکل بھروسا نہیں ہے' میں چاہوں تو کامران کو یہاں سے لے جا سکتا ہوں

لیکن اتنا سمجھتا ہوں کہ آپ دونوں مجھ سے تو دشمنی کر سکتے ہیں' اپنے نواسے سے نہیں کر سکتے لہٰذا یہ یہاں رہے گا۔ میں یہاں کبھی کھانے کے لیے یا ایک گلاس پانی پینے کے لیے بھی نہیں آؤں گا۔ دوسری بات یہ کہ آپ دونوں کبھی میرے گھر کی طرف نہ آئیں مجھے کیا معلوم آپ میرے گھر کے دروازے پر کون سا منتر پڑھ کر چلے جائیں اور میں نقصان اٹھاؤں۔ میں کسی صورت میں آپ لوگوں پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ کیا میری بات سمجھ میں آ رہی ہے؟"

فرید احمد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "بیٹا! یہ میں مانتا ہوں کہ تمہاری ساس نے تم سے بڑی زیادتی کی ہے۔ دیکھو بزرگ سمجھ کر معاف کر دو۔ اس طرح قطع تعلق نہ کرو۔ رخسانہ ہماری بیٹی ہے اور تمہاری بیوی ہے۔ وہ ہم سب کی محبتوں کا مرکز ہے تمہیں اس کا واسطہ ہے' غصہ تھوک دو۔"

"مجھے تھوکنا نہیں آتا۔ جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکا ہوں۔ اگر آپ نے میرے گھر آنے کی ضد کی تو میں ابھی کامران کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ جب تک آپ کی بیٹی نہیں آئے گی' اس وقت تک میں نواسے کی شکل دیکھنے نہیں دوں گا۔"

بیگم جلدی سے چلتے ہوئے تقریباً دوڑتے ہوئے جانی کے سامنے آئیں پھر گڑگڑا کر بولیں "نہیں بیٹے' مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ قسم کھاتی ہوں کہ میں تمہارے گھر کی طرف نہیں آؤں گی۔ یہ بھی نہیں آئیں گے' بس تم آ کر کامران کو دیکھ لیا کرنا' لاؤ اسے مجھے دو' ہم سے جدا نہ کرو۔ تمہاری جو خوشی ہو گی' وہی ہماری خوشی ہو گی۔"

یہ کہہ کر انہوں نے کامران کو اس کی گود سے لے لیا۔ جانی نے انہیں دھمکی دینے والی نظروں سے دیکھا پھر وہاں سے باہر آ گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے سوچ رہا تھا چلو اسی بہانے ساس اور سسر کو اپنے گھر کی طرف آنے سے روک دیا ہے' یہ بات بڑی اچھی ہے۔ اگر فرزانہ آئندہ ملاقات کے لیے راضی ہو گئی اور اس سے ملنے ملانے کا سلسلہ رہے گا تو اس سلسلے میں کوئی ایسی جگہ ہو جہاں تنہائی ہو' کوئی تیسرا نہ ہو۔ چار دیواری ہو' کوئی دور سے دیکھنے والا نہ ہو۔ بجلی فیل ہو' دیواریں بھی اندھی ہو جائیں' اوپر چھت ہو' آسمان تک نہ دیکھ سکے۔ اس نے خوشی سے گنگناتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ

کی ہمیر بدلے پھر اطمینان سے ڈرائیو کرنے لگا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد پولیس اسٹیشن کے سامنے ایک سپاہی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا' اسے رکنا پڑا۔ ایک انسپکٹر تھانے کی عمارت سے نکل کر ایک مولوی صاحب سے باتیں کرتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ ان کے پیچھے ایک عورت چادر میں لپٹی ہوئی تھی' اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ وہ تینوں ٹیکسی کے پاس آکر رک گئے۔ انسپکٹر نے جانی سے کہا "انہیں دارالامان تک پہنچا دو اور ان سے کرایہ نہ لینا۔"

مولوی صاحب اس عورت کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر نے ان سے کہا "میں نے تمام کاغذات آپ کو دے دیے ہیں۔ انہیں دارالامان میں دکھایئے گا تو اس لڑکی کو وہاں پناہ مل جائے گی۔"

پھر انسپکٹر نے ٹیکسی کی باڈی کو بید سے مارتے ہوئے جانی سے کہا "جاؤ۔"

جانی غصے سے کھول گیا۔ اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور دانت پیستے ہوئے اسے آگے بڑھا دیا۔ یہی انداز ڈرائیوروں کو احساس کمتری میں مبتلا کرتا ہے' کس طرح تھانے دار نے بید مار کر جانے کے لیے کہا تھا۔ جیسے ٹیکسی پر نہیں' جانی کی پیٹھ پر چابک رسید کرتے ہوئے ایک جانور کی طرح ہانک رہا تھا کہ چلو۔

ٹیکسی کی محدود فضا میں خاموشی تھی پھر اس خاموشی میں چادر والی کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ اب اس نے اپنے سر سے چادر ہٹا دی تھی۔ جانی نے عقب نما آئینے میں کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ لڑکی خوب صورت تھی۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ مولوی صاحب کہہ رہے تھے "بیٹی صبر کرو۔ بزرگوں کے مشورے کے بغیر کبھی کوئی بڑا اقدام نہیں اٹھانا چاہیے۔ دیکھ لو تمہارا کیا حال ہو رہا ہے خدا کسی نوجوان لڑکی کو پردیس میں پہنچا کر یوں دربدر کی ٹھوکریں نہ کھلائے۔"

مولوی صاحب کی باتیں سنتے ہی جانی کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ یکبارگی اس کے خیالات اچھل کر اپنی رخسانہ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ بھی تو جوان تھی' خوب صورت تھی' پردیس میں تھی۔ خدا نہ کرے کہ وہ دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہو۔ جانی کا دل گھبرانے لگا تھا۔

جب اپنے دل میں درد اٹھتا ہے تو اس درد سے دوسروں کی پہچان ہوتی ہے۔ اس

نے مولوی صاحب سے پوچھا "کیا بات ہے؟ یہ لڑکی کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے' کیوں رو رہی ہے؟"

مولوی صاحب نے کہا "یہ نواب شاہ کی رہنے والی ہے' والدین کو دھوکا دے کر اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ کر چلی آئی۔ یہاں اس کے عاشق نے ایک مکان کرائے پر لیا۔ وہ اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔ تب یہ انکار کرنے لگی۔ مجھے اس بات پر غصہ آتا ہے کہ اس لڑکی نے اپنے بزرگوں کو دھوکا دیا اور عاشق کے ساتھ یہاں آئی لیکن اس لڑکی کی شرم و حیا نے میری ہمدردیاں حاصل کر لی ہیں۔ اس نے اپنی عزت کو داؤ پر نہیں لگایا۔ اس لڑکے سے صاف صاف کہہ دیا کہ پہلے نکاح پڑھایا جائے گا پھر پتا چلا کہ اس لڑکے کی پہلے ہی کہیں شادی ہو چکی ہے اور وہ ایک بچے کا باپ ہے۔ وہ دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ ہاتھ نہیں آرہی ہے تو وہ شادی کے لیے راضی ہو گیا۔ ابھی تقریباً دو گھنٹے پہلے مجھے نکاح پڑھانے کے لیے بلایا گیا تھا۔"

مولوی صاحب ایک لمحے کے لیے چپ ہوئے' پھر بولنے لگے۔ "وہاں صرف چار نوجوان نظر آئے۔ پانچواں وہ لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے نکاح کا رجسٹر سنبھالتے ہوئے پوچھا "لڑکی کے والد اور رشتے دار کہاں ہیں؟"

ان میں سے ایک نوجوان نے کہا "میں لڑکی کا سرپرست ہوں۔"

میں نے پوچھا "لڑکی کے والدین کہاں ہیں؟"

اس نے جواب دیا "والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔"

مجھے شبہ ہوا' میں نے پوچھا "لڑکی کے خاندان میں دوسرے بزرگ تو یقیناً ہوں گے۔"

اس نے جواب دیا "اتفاق سے کوئی بڑا بوڑھا نہیں ہے۔"

میں نے دولہا کو دیکھتے ہوئے پوچھا "ان صاحب زادے کے بزرگ کہاں ہیں؟"

صاحب زادے نے کہا "دیکھیے مولوی صاحب' اصل بات یہ ہے کہ میری ایک شادی ہو چکی ہے میرے گھر والے کبھی دوسری شادی کے لیے راضی نہیں ہوں گے اس لیے میں ان سے چھپ کر یہ نکاح کر رہا ہوں۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ باہر کھلے ہوئے دروازے تک آیا پھر وہاں سے میں نے کہا

"دیکھو مجھے کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے اگر یہاں لڑکی کا کوئی سگا رشتے دار ہے تو پھر وہ مجھے اپنا نام اور پتا بتائے' میں لڑکی کے متعلق تحقیقات کروں گا۔"

ایک نوجوان نے کہا "مولوی صاحب! آپ کو نکاح پڑھانے سے کام ہے' ہم آپ کو منہ مانگی فیس ادا کریں گے۔ ہم کوئی ناجائز کام نہیں کر رہے ہیں۔"

"نکاح اس وقت جائز ہوتا ہے جب لڑکی کے والد یا معتبر سرپرست یا معتبر وکیل ہوں۔ تم نوجوانوں کی عمر ایسی معتبر نہیں ہے کہ کسی لڑکی کی طرف سے وکالت کر سکو۔ تم لوگ حماقت ہی کر سکتے ہو' لڑکی کو یہاں میرے سامنے لے آؤ۔"

ایک نے کہا "مولوی صاحب! آپ خواہ مخواہ بات بڑھا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "بات تو اب بڑھنے والی ہے' دیکھو میں یہاں دروازے پر کھڑا ہوں میرے سامنے پورا محلہ نظر آ رہا ہے۔ میں چاہوں تو ایک چیخ مار کر سارے لوگوں کو جمع کر لوں لیکن میرا مذہب سکھاتا ہے کہ کسی نامحرم کی عزت رکھی جائے۔ پتا نہیں وہ لڑکی کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی شرم و حیا کا تقاضا ہے کہ میں اس کی عزت رکھوں۔ جب بات بنے گی تو میں سچ مچ نکاح پڑھا دوں گا' کوئی اعتراض نہیں ہو گا اور کوئی گڑبڑ ہو گی تو اس لڑکی کو یہاں سے لے جاؤں گا۔"

مولوی صاحب کہہ رہے تھے اور جانی کا دماغ اپنے معاملات میں الجھ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کا بھی نکاح جب رخسانہ سے پڑھایا گیا تھا اور اس خوشی اور مسرت کے موقع پر اس کا اپنا کوئی بزرگ نہیں تھا۔ مستری چاچا ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔ انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ جانی' تم زبردست دھوکا کھانے والے ہو۔ واقعی بزرگوں کی بات نہ ماننے سے اکثر دھوکا کھانا پڑتا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا۔ اب تو کوئی شکایت بھی نہیں تھی' رخسانہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ اتنی اچھی کہ اس سے اچھی اور کوئی ہو نہیں سکتی تھی۔

مولوی صاحب کہہ رہے تھے "وہ لڑکے مکان کے اندرونی حصے میں گئے۔ میں تھوڑی دیر انتظار کرتا رہا پھر میں نے آواز دی تو یہ لڑکی روتے ہوئے میرے پاس آئی۔ اس نے بتایا کہ وہ سب پچھلے دروازے سے بھاگ گئے ہیں۔ میں اس لڑکی کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اس کے حوالے سے میں دوسرے تمام نوجوانوں کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ

ایسی محبت' ایسا عشق نہ کرو جو خاندان کو بدنام کرے اور ماں باپ کو منہ دکھانے کے قابل نہ رکھے۔ اپنے بسے بسائے گھر کو اجاڑ دے۔ وہ ایک بیوی اور ایک بچے والا تھا' اسے اپنی بیوی سے دھوکا کرتے ہوئے' اپنے بچے کو چھوڑ کر کسی دوسری نوجوان لڑکی کی طرف مائل ہوتے ہوئے کیا ذرا بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا ہو گا کہ وہ عشق یا اپنی ہوس کے لیے اپنی محبت کرنے والی بیوی اور بچے کو....."

جانی آگے نہ سن سکا۔ اس کا دماغ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ کامران اس کی گود میں ہمک رہا تھا۔ رخسانہ آنسو بھری آنکھوں سے مسکرا رہی تھی۔ اس نے دارالامان کی عمارت کے سامنے گاڑی روک دی۔ مولوی صاحب نے اترتے ہوئے کہا "بیٹے! ذرا ٹیکسی روک کے رکھنا۔ معلوم نہیں اس لڑکی کو یہاں پناہ ملتی ہے یا نہیں۔ سنا ہے دارالامان میں بڑی سختیاں ہوتی ہیں اور بڑی چھان بین کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لڑکی کو فوری طور پر نہ رکھیں' مجھے اسے پناہ دینے کے لیے کہیں اور لے جانا پڑے تو بیٹے ذرا انتظار کر لینا۔"

جانی نے اپنی گھڑی دیکھی' آٹھ بجنے والے تھے۔ اس نے فرزانہ سے کہا تھا کہ وہ آٹھ بجے اس کے کلینک کے سامنے سڑک کے دوسری طرف آ کر اپنی گاڑی میں رات گزارے گا۔ اس نے کہا۔

"مولوی صاحب! مجھے افسوس ہے آپ کسی دوسرے ٹیکسی یا رکشا میں آ جائیے گا' مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

"بیٹا! نیکی سے زیادہ ضروری کام کوئی نہیں ہوتا۔ یہ لڑکی پردیس میں ہے۔ معلوم نہیں اس کی قسمت میں کہاں کہاں ٹھوکریں کھانا لکھا ہے۔ اگر ہم اور تم اسے ٹھوکروں سے نہیں بچائیں گے' تو ذرا سوچو اگر ہماری کوئی عزیزہ پردیس میں جائے اور اس کے ساتھ....."

جانی پھر آگے نہ سن سکا۔ رخسانہ نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہ لندن کی انجانی شاہراہوں پر بھٹک رہی تھی۔ کوئی اسے سہارا نہیں دے رہا تھا۔ لوگ اسے ہوس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اس نے گھبرا کر اس چادر والی کو دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ مولوی صاحب میں انتظار کروں گا' چاہے ساری رات گزر جائے۔ میں یہیں بیٹھا رہوں

گا۔"

مولوی صاحب اسے دعائیں دیتے ہوئے لڑکی کو اپنے ساتھ دارالامان کی عمارت میں لے گئے۔ جانی کو یوں لگا جیسے رخسانہ چادر میں لپٹی ہوئی پناہ کی تلاش میں گئی ہے۔ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا' وہ سوچ رہا تھا کب اس کا خط آئے گا۔ کب اس کی خیریت معلوم ہوگی۔ وہ دن گننے لگا۔ آج تیسرا دن تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ اس کے انکل جمشید وہاں مل گئے ہوں گے' اسے ٹھکانا مل گیا ہوگا۔ وہ وہاں خیریت سے ہوگی' آرام سے ہوگی۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

آدھے گھنٹے کے بعد مولوی صاحب واپس آئے لیکن انہوں نے کہا "بیٹے یہاں کے قوانین بہت سخت ہیں اور یہ بھی بڑی اچھی بات ہے کہ بہت دور تک تحقیقات ہوتی ہے۔ یہاں کی جو بڑی بیگم صاحبہ ہیں' ان کا حکم ہے کہ اس علاقے کے تھانے دار کو بلایا جائے۔"

جانی نے کہا "لیکن ہمارے علاقے کے تھانے دار نے تمہاری کارروائی مکمل کر دی ہے۔"

"ہاں' وہ تو ہے لیکن یہاں یہ بیگم صاحبہ بڑی محتاط ہیں۔ کہتی ہیں کہ اس علاقے کے تھانے دار کی موجودگی میں لڑکی کو دارالامان میں داخل کیا جائے گا۔ کیا حرج ہے' چلو یہیں قریب ہی تھانہ ہے' وہاں کے انسپکٹر کو بلا کر لے آئیں گے۔"

مولوی صاحب اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک منٹ کے اندر ہی وہاں کے تھانے کے سامنے پہنچ گیا۔ ایک سپاہی نے بتایا کہ تھانے دار نہیں ہے' کسی طرف گئے ہوئے ہیں' وہاں ان کی جیپ خراب ہو گئی ہے۔ اس لیے جلد واپس نہیں آسکیں گے۔ اگر انہیں جلدی لانا چاہتے ہیں تو ٹیکسی لے کر چلے جائیں۔

یہ کہہ کر سپاہی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ "چلو میں بتاؤں گا کہ انسپکٹر صاحب کہاں ہیں۔"

مولوی صاحب نے جانی کا منہ دیکھا پھر بے بسی سے کہا "میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں اتنی دیر تک تمہاری ٹیکسی کو اپنے لیے رکھوں۔ میں نے ایک نیکی کرنے کے لیے تمہیں آمادہ کیا تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ تم اس لڑکی کو دارالامان پہنچانے کے پیسے

نہیں لو گے لیکن تم پر بوجھ پڑ رہا ہے۔"

جانی نے مسکراتے ہوئے کہا "مولوی صاحب! کوئی بات نہیں آیئے ہم اس لڑکی کو کنارے لگا کر ہی واپس جائیں گے۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر سپاہی کے بتائے ہوئے پتے پر چلنے لگا۔ مولوی صاحب نے پوچھا "کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے۔"

"جی ہاں' میرا ایک بیٹا بھی ہے' میری بیوی بہت تعلیم یافتہ ہے لیڈی ڈاکٹر ہے' وہ لندن گئی ہوئی ہے۔"

"کیا اکیلی گئی ہے؟"

"جی ہاں' وہ بہت سمجھ دار ہے۔"

"بے شک سمجھ دار ہوگی لیکن عورت کو دور سمندر پار ملازمت کے لیے بھیجنا اچھی بات نہیں ہے اور وہ اکیلی۔"

"وہ ملازمت کے لیے نہیں بلکہ علاج کے لیے گئی ہے' اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے چہرے کو ٹھیک کرا کے آئے گی۔"

مولوی صاحب چند لمحوں تک سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا "میری دعا ہے کہ تمہاری شریک حیات بخیریت وہاں سے واپس آئے۔"

جانی نے دل کی گہرائیوں سے کہا "آمین۔"

مولوی صاحب نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر پوچھا "اپنی شریک حیات کو بہت چاہتے ہو؟"

"جی ہاں' وہ بہت اچھی ہے۔ اتنی اچھی ہے کہ میں اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔ بیوی نگاہوں سے دور ہو جائے' تو اسے یاد رکھا جائے ورنہ آج کل کے نوجوان بیوی کے میکے جاتے ہی دوسری لڑکیوں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ معلوم نہیں' یہ محبت کا روگ اتنا پھیلتا کیوں جا رہا ہے۔ محبت اچھی چیز ہے لیکن اسے بیماری نہیں بنانا چاہیے اور اسے گھر کی تباہی کا سبب بھی نہیں بننا چاہیے۔"

جانی نے کہا "آپ نے تو محبت کو اچھی چیز کہا ہے مگر یہ اچھی کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر میں دوسری لڑکی میں دلچسپی لوں تو یہ تباہی کا سبب بنے گی۔"

"جب تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ محبت تباہی لاسکتی ہے تو اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا بیوی سے محبت پوری نہیں ہوتی؟"

وہ چپ ہوگیا پھر کچھ سوچ کر بولا "مولوی صاحب' اگر بیوی کے علاوہ کوئی دوسری بھی بہت زیادہ پسند آجائے اور دل اسی کی طرف لگا رہے تو اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟"

"پہلے تو اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جو دلچسپی' جو کشش تمہیں دوسری میں ملتی ہے' وہ بیوی میں تلاش کرو۔ اگر بیوی میں کسی بات کی کمی ہو' اولاد پیدا ہونے کی امید نہ رہی ہو... یا دائمی مریضہ ہو یا ایسی کوئی بات ہو جس کی وجہ سے مرد دوسری شادی پر مجبور ہوسکتا ہے تو دوسری شادی کرلینا چاہیے لیکن ایک شادی شدہ مرد کو عاشق نہیں بننا چاہیے۔ دیکھو نا' اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوب صورت چیزیں پیدا کی ہیں۔ خواہ عورت ہو یا پھول ہو یا کوئی بہت ہی خوب صورت منظر ہو۔ آدمی جتنا خوب صورتی میں دلچسپی لے گا' اتنا ہی خوب صورتی کو پسند کرتا چلا جائے گا۔ انہیں اپنانے کی کوشش کرتا جائے گا' انہیں اپنانے کا ڈھنگ ایسا ہونا چاہیے کہ اپنے گھر پر' اپنی شریک حیات پر' اپنے بچوں پر اس کا برا اثر نہ پڑے۔ اس کے بعد خوب صورتی سے محبت کرنا بہت اچھی بات ہے۔"

جانی کے دماغ میں ایک بات گونج رہی تھی۔ دوسری شادی کرنا جائز تو ہے لیکن اس کا صحیح جواز پیش کرنا ہوگا اور وہ کون سا ایسا جواز پیش کرسکتا ہے کہ فرزانہ اس کی ہوجائے۔

پھر اس کے دماغ نے سمجھایا' فرزانہ ایسی نہیں ہے کہ وہ کسی پر سوتن بن کر آئے گی۔ رخسانہ اور فرزانہ دونوں ہی تعلیم یافتہ عورتیں ہیں' وہ کسی کی سوتن بننا کبھی گوارا نہیں کریں گی۔

سپاہی کے کہنے پر اس نے ایک مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ سپاہی مکان کے اندر گیا پھر پانچ منٹ بعد واپس آیا اور مولوی صاحب کو اندر بلا کر لے گیا پھر پندرہ منٹ بعد وہ مولوی صاحب اور تھانے کا انچارج باہر آئے اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ جانی نے انہیں دارالامان پہنچادیا۔ مولوی صاحب تھانے کے انچارج کے ساتھ دارالامان میں

جانے لگے۔ جانی نے کہا "مولوی صاحب! آپ اطمینان رکھیے۔ جب تک اس لڑکی کا یہاں ٹھکانا نہیں بنے گا۔ میں آپ کے انتظار میں یہاں بیٹھا رہوں گا۔"

مولوی صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اندر چلے گئے۔ تقریباً ساڑھے دس بجے وہ تھانے کے انچارج کے ساتھ باہر آئے۔ اس پولیس انسپکٹر نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے جانی کے برابر بیٹھ کر کہا "مجھے کورنگی جانا ہے' ذرا لے چلو۔"

مولوی صاحب پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بتانے لگے کہ لڑکی کو دارالامان میں رکھ لیا گیا ہے۔ صبح اس کے والدین کو اطلاع پہنچادی جائے گی' یہ ایک نیکی کا کام ہوگیا۔

جانی نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ ناظم آباد کے قریب مولوی صاحب اسے دعائیں دیتے ہوئے اتر گئے۔ ٹیکسی پھر آگے بڑھ گئی۔ پولیس انسپکٹر نے کہا "یہ مولوی صاحب تمہاری بڑی تعریفیں کررہے تھے۔ اگر تمہارے جیسے ڈرائیور اسی طرح نیکیاں کرتے رہے تو کوئی عورت غلط ہاتھوں میں نہیں جائے گی۔ کوئی مسافر راستے میں نہیں بھٹکے گا۔ ہر مسافر کو اپنی منزل ملتی رہے گی۔"

"آپ درست کہتے ہیں لیکن بہت سے لوگ ہمیں نیکیاں نہیں کرنے دیتے۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا نیکی کرنے سے کون روکے گا؟؟"

"کچھ تو حالات روکتے ہیں' کچھ آپ لوگ روکتے ہیں۔"

انسپکٹر نے چونک کر اور گھور کر اسے دیکھا۔ جانی نے کن انکھیوں سے اس کی گھورتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے ڈرائیو کرتے ہوئے بولا "آپ کو میری بات بری لگی ہوگی لیکن جب آپ نے میری نیکی کی تعریف کی ہے تو یہ سن لیجے کہ ہم نیکیاں کیوں نہیں کرسکتے۔ میں دارالامان سے لیاری تقریباً بیس میل تک آپ کو لینے کے لیے گیا پھر بیس میل واپس آکر دارالامان تک پہنچایا' اب وہاں سے کورنگی لے جارہا ہوں۔ اگر آپ کورنگی کے آخری سرے میں جائیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تیس میل جاؤں گا اور تیس میل واپس آؤں گا۔ حساب لگالیجے۔ میں تقریباً پچاس روپے کا پیٹرول پھونک چکا ہوں۔ کوئی ٹیکسی ڈرائیور اس طرح نیکیاں کرکے جب اپنے گھر جائے گا تو وہ اپنی بیوی بچوں..... کو کیا کھلائے گا اور دوسرے دن اپنی گاڑی میں پیٹرول بھرنے کے لیے پیسے کہاں سے لائے گا۔"

انسپکٹر نے سامنے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا "تم اپنی جگہ درست کہتے ہو لیکن ہم جانتے ہیں کہ ٹیکسی ڈرائیور کتنی حرام کمائی حاصل کرتے ہیں۔ کس طرح مسافروں کو لوٹتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی پولیس والا ایک آدھ بار ان کی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر تک پہنچ جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"جناب یہی تو بات ہے' آپ حرام کی کمائی کرنے والوں کا محاسبہ نہیں کرتے بلکہ ان کی گاڑیوں میں بیٹھ کر ان کی کمائی میں شریک ہو جاتے ہیں۔"

"کیا بکواس کرتے ہو؟"

"اگر آپ ناراض ہوتے ہیں تو میں اپنی زبان بند رکھوں گا لیکن آپ نے نیکی کی بات چھیڑی ہے۔ اتنا کہہ دوں کہ بدی کی سزا اس دنیا میں فوراً قانون کے ہاتھوں مل جاتی ہے۔ لیکن نیکی کی جزا فوراً نہیں ملتی بلکہ اسے اللہ میاں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بے شک وہ صلہ دیتا ہے اور ضرور دیتا ہے لیکن بندے کا بھی تو کچھ فرض ہے۔ اگر ہر ٹیکسی ڈرائیور کو اس کی نیکی کے بدلے سونے کا میڈل نہ دیا جائے اور اسے نقد روپے انعام کے طور پر نہ دیے جائیں' اس کی تعریفیں نہ کی جائیں صرف اس کے پیٹرول کا خرچ دے دیا جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ ہر ٹیکسی ڈرائیور نیکی کی طرف مائل ہوتا رہے گا۔"

انسپکٹر چپ چاپ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس انسپکٹر کی بھی ایک منی بس تھی جو جونا مارکیٹ سے اورنگی کے روٹ پر چلتی تھی۔ پچھلے دنوں اس کے ایک بہت بڑے افسر نے اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں اس کی منی بس اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس کا پیٹرول کا خرچ بھی انسپکٹر کی جیب سے گیا۔ دو دنوں میں تقریباً نو سو روپے کا نقصان ہو گیا۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ نیکیاں عام کیوں نہیں ہوتیں؟ ہر بڑا افسر اپنے ماتحت کو نیکی سے روکتا ہے وہ ماتحت جھنجلا کر اپنے دائرہ اختیار میں رہنے والوں کو نیکیوں سے باز رکھتا ہے۔

انسپکٹر نے آگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ سامنے والے بس اسٹاپ پر گاڑی روک دو۔"

جانی نے حیرانی سے پوچھا "کیا بات ہے آپ کورنگی نہیں جائیں گے؟"

"میں بس میں جاؤں گا۔"

جانی کو بڑی حیرانی ہوئی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جب لوگ اپنے درد کی دھوپ

میں جلتے ہیں تو دوسروں کی جلن کا احساس ہوتا ہے۔ اس نے گاڑی اسٹاپ پر روکی۔ انسپکٹر نے اترتے ہوئے پوچھا "کتنے پیسے ہوئے؟"

"جناب آپ شرمندہ نہ کریں۔ میں آپ سے ایک پیسہ نہیں لوں گا۔"

انسپکٹر نے دروازہ بند کر دیا پھر کھڑکی پر جھکتے ہوئے کہا "تم نے مجھے تھوڑی سی اچھائی دی ہے' میں اس اچھائی کو دوسروں میں تقسیم کروں گا۔ جاؤ میری دعا ہے نیکیاں کرو۔"

جانی نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔ گیئر بدل کر گاڑی آگے بڑھائی۔ اس وقت انسپکٹر نے جیب سے پچاس کا ایک نوٹ نکال کر چپکے سے اگلی سیٹ پر ڈال دیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اس وقت انسپکٹر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ سینہ پھولا ہوا تھا اور وردی میں وہ اتنا جچ رہا تھا کہ اپنے قد سے اونچا لگ رہا تھا۔

جانی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا فرزانہ کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار اتنی تیز تھی جیسے پیچھے سے آندھی چل رہی ہو اور اسے اڑائے لیے جا رہی ہو۔ اس نے انسپکٹر سے درست کہا تھا کہ پولیس والے میٹر کے حساب سے نہ سہی' پیٹرول کے حساب سے بھی کبھی پیسے نہیں دیتے اسی بات کا دوسرا پہلو دیکھا جائے تو وہ خود کئی بہانوں سے پیٹرول ضائع کرتا تھا۔ جب سے فرزانہ کی تلاش شروع ہوئی تھی' تب سے وہ ہزاروں روپے کا پیٹرول پھونک چکا تھا۔ بیشک یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ وہ اپنی محبت میں اپنے گھر کو بھی پھونک سکتا تھا لیکن اسی بات کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ کسی کی تلاش میں پیٹرول ہر لمحے نہیں جلتا لیکن شادی کے بعد سے وہ اب تک ہر لمحہ اپنی محبت کرنے والی بیوی کا خون جلاتا آ رہا تھا۔ ایک ہی بات کئی پہلوؤں سے سمجھی جا سکتی ہے مگر سمجھا نہیں آتا ہے۔

وہ محبوب کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس وقت کلینک کے آس پاس دور دور تک رات کا سناٹا تھا۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی سامنے سڑک پر سے گزر جاتی تھی۔ جانی نے اپنی گاڑی کو اس طرح کھڑا کیا کہ اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پوری طرح کھڑکی پر پڑنے لگی گاڑی کو بند کرنے سے پہلے انجن کو ریس دینے لگا تاکہ اس کا شور دور دور تک سنائی دے محلے والے سمجھیں کہ کسی گاڑی میں خرابی ہے وہ درست کی جا رہی ہے' فرزانہ سنے تو اس کا دل دھڑکنے لگے۔

فرزانہ کے کان شام ہی سے آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ دل رہ رہ کر دھڑک رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کیسے ضدی سے پالا پڑا ہے۔ اب اسے کھڑکی پر روشنی محسوس ہو رہی تھی۔ اوپر سے پردے پڑے ہوئے تھے پھر بھی روشنی کا احساس ہو رہا تھا پھر انجن کا شور سنائی دیا۔ اشارہ مل گیا کہ وہ نہ آئی تو دیوانہ اور شور مچائے گا۔

وہ بستر سے اٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس آئی مگر کھڑکی نہیں کھولی۔ دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ادھر یہ تھی‘ ادھر وہ تھا اور ان کے درمیان آدھی رات گزر رہی تھی۔

○☆○
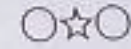
ٹھیک اس وقت لندن میں سات بج رہے تھے۔ تقدیر نے رخسانہ کو ٹھوکر مار کر فلیٹ سے باہر نکال دیا تھا۔ اب وہ بھیگی آنکھوں سے اپنے آس پاس کے اجنبی ماحول کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بزدلی سے نہیں رو رہی تھی بلکہ یہ سوچ کر رونا آگیا تھا کہ ایسے وقت جانی ہوتا تو اسے بازوؤں میں چھپا لیتا۔ دل کی دھڑکنوں میں بٹھا لیتا پھر دنیا کا اتنا بڑا شہر ایک دیو کی طرح اسے ہڑپ کرنے کی دھمکیاں نہ دیتا۔

لندن میں تقریباً دو لاکھ افراد ایسے ہیں جنہیں سوسائٹی ٹھکرا دیتی ہے۔ یا وہ بے روزگار ....یا نیم دماغی مریض ہوتے ہیں۔ ان کے کھانے یا رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ ڈاؤن اینڈ آؤٹ کہلاتے ہیں۔ رخسانہ ڈاؤن تھی۔ فلیٹ کی بلندی سے فٹ پاتھ کی پستی پر آگئی تھی۔ وہ آؤٹ ہو چکی تھی۔ لندن کی کسی سوسائٹی میں ان ہونے کا کوئی ذریعہ یا کسی سے کوئی رشتہ نہ تھا۔

اس وقت وہ اسمتھ اسٹریٹ پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر کنگسٹن کی شاہراہ تھی۔ اس شاہراہ سے کیسے جانے کے لیے ٹیکسی یا شاید کوئی بس مل سکتی تھی مگر وہ کہاں جائے؟

دور بینی کا سلیقہ بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ رخسانہ اس حد تک ذہین تھی کہ پاکستان چھوڑنے سے پہلے دور تک دیکھ لیا تھا۔ اگرچہ وہ جمشید کو اس قدر ہوسناک نہیں سمجھتی تھی‘ تاہم اتنا سمجھ گئی تھی کہ گھر اور شوہر سے رخصت ہو کر جو عورت پانی کی سطح پر چلتی ہے کسی وقت بھی غڑاپ سے ڈوب سکتی ہے لہٰذا تیراکی کا سامان ساتھ رکھنا چاہیے۔

اس نے اپنے سفری بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ وہاں لندن کا ایک تفصیلی نقشہ تھا اور ایک ڈائری تھی جس میں اہم اداروں کے پتے درج تھے۔ زیر زمین ٹیوب کے ذریعے سفر کرنے کا پورا نقشہ اور تفصیلات موجود تھیں۔ یہ سب کچھ اس نے لندن گائیڈ بک اور مختلف سفرناموں سے حاصل کیا تھا۔

اس نے چھوٹی سی ڈائری کو کھول کر دیکھا۔ ایک صفحے پر لکھا تھا "اے ڈبلیو پی۔ یعنی اے وومنز پلیس۔"

اس کے نیچے لکھا تھا "۴۲۔ ارل ہام میں کئی زنانہ سینٹر ہیں جو پریشان حال عورتوں کو سستی رہائش‘ سستا کھانا اور ایسے پتے فراہم کرتے ہیں جہاں وہ آئندہ روزگار حاصل کر کے اپنے اعتماد پر زندگی گزار سکتی ہیں۔"

اس نے ڈائری کو بیگ کے اندر رکھا پھر اللہ کا نام لے کر سامان اٹھالیا اور کنگسٹن روڈ کی طرف چلنے لگی۔ سامان بہت بھاری تھا۔ وہ چلتے چلتے سامان کو زمین پر رکھ دیتی تھی۔ کبھی سوٹ کیس کو پہیے پر چلاتی پھر اٹھا کر چلنے لگتی تھی۔ وہاں سے کنگسٹن روڈ زیادہ دور نہیں تھا۔

لندن کا نقشہ اس کے تصور میں تھا۔ وہاں کی خاص خاص باتیں اس کے ذہن میں تھیں۔ اگر وہ ٹیوب کے ذریعے سفر کرتے ہوئے ارل ہام تک جاتی تو جہاں وہ کھڑی ہوئی تھی‘ وہاں سے سب سے پہلے ٹیوب کا اسٹیشن سلون اسکوائر تھا جو نقشے میں بہت قریب نظر آتا تھا لیکن اندازے کے مطابق میلوں دور ہوگا پھر یہ کہ وہ اتنا سامان اٹھا کر وہاں تک نہیں جاسکتی تھی۔

شاہراہوں پر گاڑیاں تیزی سے گزرتی جا رہی تھیں۔ ہیڈ لائٹس کی روشنیاں کبھی اسے روشن کرتی تھیں‘ کبھی بجھا دیتی تھیں۔ وہ ایسی شمع کی مانند تھی جو بجھ رہی تھی اور بھڑک کر روشن ہو رہی تھی۔ موسم سرما کا آغاز تھا۔ ہلکی ہلکی سردی پڑ رہی تھی۔ اس کے باوجود اتنا بوجھ اٹھانے کے باعث پسینا پسینا ہو گئی تھی۔ سامان فٹ پاتھ پر رکھا ہوا تھا اور وہ دوپٹے کے ایک سرے سے اپنے چہرے اور گردن کے پسینے کو خشک کرتی جا رہی تھی۔

اتنی دیر میں کتنی ہی ٹیکسیاں گزریں لیکن وہ خالی نہیں تھیں پھر ایک سفید رنگ کی

ویگن اس کے قریب آکر رکنے لگی۔ اس ویگن پر این اے بی لکھا ہوا تھا۔ اس گاڑی میں نیشنل اسسٹنسی (NATIONAL ASSISTANCY) بورڈ کے افراد تھے۔ وہ افراد ایسے لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے جو آوارہ نظر آتے تھے یا سڑک اور فٹ پاتھوں پر بے سہارا دکھائی دیتے تھے یا نشے کی حالت میں گھومتے تھے یا پلوں کے نیچے پارک میں جا کر بنچ پر نشے کی حالت میں سو جاتے تھے۔

ایک شخص نے اس کے قریب آکر کہا "تم اپنے لباس سے انڈین یا پاکستانی لگتی ہو؟"

"میں پاکستانی ہوں۔"

"مختصر طور پر اتنا بتادو کہ اتنے سامان کے ساتھ کہاں سے آرہی ہو اور کہاں جانا چاہتی ہو؟"

وہ تذبذب سے سوچنے لگی کہ سچ بول دے یا جھوٹ کی آمیزش کرے۔ اب تک جو جھوٹ بولتی آئی تھی اس کا نتیجہ بھگت رہی تھی۔ اس شخص نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اگر تم اس شہر میں اجنبی ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ این اے بی کا ادارہ کیا ہے اور ہماری ڈیوٹی کیا ہے۔ تم یہ کارڈ پڑھ سکتی ہو۔"

وہ پہلے ہی کتابوں میں اس ادارے کے متعلق پڑھ چکی تھی۔ اس نے کہا "میں پاکستان سے یہاں آئی ہوں۔ اسمتھ اسٹریٹ پر ایک فلیٹ ہے۔ وہاں میں اپنے میزبان کے پاس رہی تھی لیکن ابھی میرے میزبان نے نشے کی حالت میں بے حیائی کا مظاہرہ کیا۔ میں اپنی عزت بچا کر اپنے سامان کے ساتھ باہر آگئی۔"

"کیا وہ میزبان اتنا کمزور ہے کہ اس نے تمہیں بھاگنے کی مہلت دے دی؟"

"نشہ انسان کو کمزور کردیتا ہے' وہ بے ہوش ہوگیا ہے۔"

"بے ہوش ہوگیا ہے یا تم نے کچھ کیا ہے؟ بہتر ہے کہ ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور وہاں تک ہماری رہنمائی کرو۔"

اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ لوگ رخسانہ کا سامان اٹھا کر گاڑی کے اندر لے گئے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئی۔ جب گاڑی اسمتھ اسٹریٹ کی طرف مڑنے لگی تو ایک شخص وائرلیس کے ذریعے پولیس والوں سے

رابطہ قائم کرنے لگا اور اسے اسمتھ اسٹریٹ کا پتا بتاتے ہوئے فوراً پہنچنے کی درخواست کی۔ رخسانہ چاہتی تھی کہ بات پولیس والوں تک نہ پہنچے اور وہ جمشید سے دامن بچا کر چپ چاپ نکل جائے لیکن اب معاملہ الجھتا جارہا تھا۔

وہ این اے بی کے افراد کے ساتھ فلیٹ کے اندر آئی۔ ان لوگوں نے باقر علی کے بیڈروم میں پہنچ کر جمشید کو دیکھا۔ وہ فرش پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے اتنی زیادہ قے کی تھی کہ اس کے آس پاس گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ بدبو سے دماغ پھٹا جارہا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی اپنی ناک پر رومال رکھ لیے۔ ایک شخص نے رومال کے ذریعے بوتل کو پکڑ کر دیکھا پھر گلاس کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد اپنے ساتھی سے بولا "گلاس اور بوتل کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ پولیس والے آئیں گے تو انہیں ان پر اس لڑکی کی انگلیوں کے نشانات مل سکیں گے۔"

ایک شخص جمشید کی نبض ٹٹول رہا تھا اور اس کے دل کی دھڑکنیں محسوس کررہا تھا پھر اس نے کہا "ایمبولینس کے لیے فوراً کہا جائے' اسے اسپتال پہنچانا ہوگا۔ یہ زندہ ہے۔"

اتنے میں پولیس کی ٹیم وہاں آپہنچی۔ رخسانہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک پولیس افسر نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سوالات شروع کردیے۔ وہ سنبھل سنبھل کر جواب دینے لگی پھر آفیسر نے کہا "تم مائنڈ نہ کرو میں اپنی ڈیوٹی سے مجبور ہوں' اس لیے تمہارے سامان کی تلاشی لوں گا۔"

رخسانہ نے کہا "بے شک آپ تلاشی لے سکتے ہیں۔ اس میں میرے تین ہزار پاؤنڈ ہیں۔"

آفیسر نے پوچھا "یہ تین ہزار پونڈ میزبان کے ہوں گے؟"

"جی نہیں' یہ میری رقم ہے۔"

"پاکستان سے اتنی رقم لانے کی اجازت نہیں ہے' تمہارے پاس تین ہزار پاؤنڈ کہاں سے آئے؟"

"میرے میزبان کے والد نے مجھے علاج کے سلسلے میں دیے ہیں۔"

"اس شخص کے ہوش میں آنے اور تمہاری حمایت میں بیان دینے تک تم ہماری

نظروں میں رہو گی۔"

آدھ گھنٹے بعد وہ پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں بیٹھی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دل ہی دل میں خدا سے التجا کر رہی تھی۔ خدایا میں کہاں آکر پھنس گئی۔ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس کو مدد کے لیے پکاروں؟ میرے مالک جہاں کوئی نہیں ہوتا' وہاں تو ہوتا ہے۔ میرے حال پر رحم فرما۔ مجھے اس مشکل سے نکال دے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ اپنے شوہر سے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گی۔ کبھی دھوکا دے کر یوں بے سہارا ہونے کے لیے گھر سے نہیں نکلوں گی۔"

وہ روتی رہی۔ آنسو پونچھتی رہی اور خدا سے دعا مانگتی رہی۔ اپنی غلطیوں کے سلسلے میں توبہ کرتی رہی۔ دس بج گئے لیکن اسپتال سے کوئی خبر نہیں آئی کہ جمشید ہوش میں آیا ہے یا نہیں۔ گیارہ بجے اس نے ایک سپاہی سے پوچھا "کیا اسپتال سے کوئی خبر نہیں آئی' مجھے کچھ معلوم تو ہونا چاہیے۔"

سپاہی نے اسے تسلی دی "اطمینان رکھو' اور سکون سے بیٹھی رہو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ جب بھی تمہاری بے گناہی کا ثبوت ملے گا تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔"

وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی اور سوچنے لگی۔ اگر جمشید مر گیا تو کیا ہوگا؟ اس کی خرابی آجائے گی' اسے شاید ساری عمر وہاں کے جیل خانے میں گزارنی پڑے معلوم نہیں کیا سزا ہوگی۔ وطن کا سفارت خانہ اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد کر سکے گا یا نہیں؟ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

رات کا ایک بج گیا' دو بج گئے پھر تین بج گئے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی' اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ نیند آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس اندھیرے میں کبھی جانی کی شکل نظر آتی تھی' کبھی اپنے ننھے سے کامی کو دیکھتی تھی اور اس کا دل مچلنے لگتا تھا۔ میرے بچے! میں کہاں آگئی؟ تجھ سے دور ہوں اب شاید تجھے گود میں لے کر پیار نہیں کر سکوں گی۔ تیری زبان ہوتی تو اپنی ماں کے لیے دعا مانگتا۔ یا اللہ میرا بچہ میرے لیے رو رہا ہوگا۔ وہ اپنے رونے کے انداز سے' اپنے آنسوؤں کی زبان سے مجھے بلا رہا ہوگا۔ تو اس کے معصوم بلاوے کی لاج رکھ لے میرے

مالک!"

چار بج گئے وہ پھر اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ "جانی! تم کہاں ہو؟ اس وقت پاکستان میں کیا وقت ہوا ہوگا؟ تم سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو؟ جاگ رہے ہو تو کیا کبھی سوچ بھی سکتے ہو کہ تمہاری شریک حیات کیسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ میں کیا کروں' کیا تمہیں اطلاع دوں؟ مگر نہیں تمہیں اطلاع دوں گی تو تم سب پریشان ہو جاؤ گے پھر یہ تو قانونی معاملات ہیں۔ تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکو گے۔ اب جو کچھ ہوگا' وہ جمشید کے بیان کے بعد ہی ہوگا۔ مصیبتیں سب پر آتی ہیں لیکن مجھ پر جیسی مصیبت آئی ہے شاید کسی پر نہ آئی ہو کیونکہ میں اس شخص کے بیان کی محتاج ہوں' جو میری عزت کا دشمن بنا ہوا ہے۔ کیا دشمن ہوش میں آنے کے بعد میرے حق میں بیان دے گا؟"

اس کا دل بری طرح ڈوبنے لگا۔ وہ بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سپاہی نے دروازے کے پاس آکر اسے دیکھا اور تعجب سے کہا "عجیب عورت ہو' ابھی تک جاگ رہی ہو۔"

تھوڑی دیر بعد صبح ہو گئی۔ چھ بج گئے پھر آٹھ بج گئے۔ دس بجے ایک پولیس افسر نے آکر کہا "مس! ہمیں افسوس ہے کہ تمہیں رات بھر پریشان ہونا پڑا لیکن ہم قانون کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ مسٹر جمشید نے تمہارے حق میں بیان دیا ہے۔ وہ تین ہزار پاؤنڈ تمہارے ہیں اور تمہارا دوسرا سامان بھی محفوظ ہے۔ تم چیک کر سکتی ہو۔ اب تم جہاں جانا چاہو گی ہم وہاں پہنچا دیں گے۔" وہ پولیس آفیسر کی پوری باتیں نہ سن سکی۔ صرف اتنا ہی سنا کہ جمشید نے اس کے حق میں بیان دیا ہے' وہ خوشی کے مارے چکرا کر گر پڑی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی' ایسی گری کے بے ہوش ہو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو پہلے سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں ہے کون سا ماحول ہے کون سا دیس ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور آہستگی سے پکارا "جانی!"

جانی کا نام لیتے ہی اچانک ہوش آگیا کہ وہ جانی کے دیس میں نہیں بلکہ پردیس میں ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ اسپتال کا ماحول تھا۔ وہ ایک صاف ستھرے اجلے سے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ شاید اسپیشل وارڈ میں تھی۔ لندن شہر کے اسپتال اور وہاں کا علاج بڑا مہنگا ہوتا ہے اس پر یہ کہ وہ اسپیشل وارڈ میں لیٹی ہوئی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر

بیٹھ گئی۔ حیرانی سے سوچنے لگی۔ پولیس والے اتنے دریا دل نہیں ہوسکتے کہ پہلے الزام عائد کریں۔ اس کے بعد کسی اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں پہنچادیں اور یہاں کا بل ادا کریں۔

اس نے پریشانی سے سوچا۔ مجھے یہاں کس نے پہنچایا ہے؟

اس وقت اس کمرے کا دروازہ کھلا۔ سید باقر علی نے جھانک کر کمرے میں دیکھا پھر رخسانہ کو دیکھ کر سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیوں بیٹے! میں اندر آسکتا ہوں؟"

رخسانہ نے انہیں دیکھا تو ایک دم سے رو پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بولی "آپ اکیلے ہیں تو آجائیں۔"

وہ قریب آتے ہوئے بولے "ہاں میں اکیلا ہوں۔ میرا بیٹا لاک اپ میں ہے۔"

اس نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے انہیں دیکھا۔ وہ سر جھکا کر بولے "اتنی بڑی دنیا میں سب ہی دشمن نہیں ہوتے، کچھ دوست بھی ہوتے ہیں۔ دوستوں کو سمجھنے اور دیکھنے کا ڈھنگ چاہیے۔ آنسو بھری آنکھوں سے دیکھو گی تو دنیا بھیگی بھیگی، دھندلی سی نظر آئے گی۔ جو دنیا کو صاف اور واضح طور پر دیکھنا چاہتے ہیں، وہ پہلے عینک کے شیشے صاف کرلیتے ہیں۔ بیٹی اپنی آنکھیں پونچھ لو۔"

وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اتنے میں پولیس آفیسر اجازت حاصل کرکے کمرے میں داخل ہوا پھر اس نے کہا "مس! ہم تمہارا بیان لینا چاہتے ہیں لیکن تم بے ہوش ہوگئیں۔ مسٹر باقر کے مشورے اور اخراجات پر تمہیں یہاں پہنچایا گیا ہے۔ بہرحال تم بیان دینا چاہو تو پوری آزادی سے دے سکتی ہو۔"

"میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ میں کسی کے خلاف بیان نہیں دوں گی۔"

پولیس افسر نے کہا "لیکن پچھلی رات تم نے فلیٹ میں کہا تھا کہ مسٹر جمشید......"

رخسانہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا "پچھلی رات میں غلط فہمی میں مبتلا تھی۔ آفیسر! آپ خود ہی سوچیں جو شخص خود ہی اس قدر نشے میں دھت ہو کہ اپنا ہوش نہ رہے وہ مجھ پر کیا مجرمانہ حملہ کرے گا؟"

"تم فلیٹ سے نکل کر بھاگی کیوں تھیں؟ اپنا سامان لے کر کیوں نکل آئی تھیں۔"

"بات یہ ہے کہ ہم مشرقی لڑکیاں کسی غیر مرد کے ساتھ تنہا نہیں رہتیں۔ بصد مجبوری

رہنا بھی پڑے تو شراب سے نفرت کرتی ہیں اور شرابیوں سے ڈرتی بھی ہیں۔ میں مسٹر جمشید سے نہیں بلکہ ان کے نشے کی زیادتی سے ڈر کر فلیٹ سے چلی آئی تھی۔ دیٹس آل۔"

آفیسر نے ایک کلپ بورڈ اور کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے قلم لے کر ایک مختصر سا بیان تحریر کیا اور اپنے دستخط کرکے آفیسر کو دے دیا۔ آفیسر وہاں سے چلا گیا۔

سید باقر علی نے اسے احسان مندی سے دیکھتے ہوئے کہا "بیٹی، تم بہت اعلیٰ ظرف ہو۔ تم نے میرے بیٹے کو بچالیا۔"

"پاپا، یہ اعلیٰ ظرفی میں نے آپ سے سیکھی ہے۔ وہ تین ہزار پاؤنڈ میرے ہیں، آپ مجھ پر الزام عائد کرسکتے تھے کہ میں نے وہ رقم آپ کے فلیٹ سے چرائی ہے۔ آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے مجھے اپنے بیٹے کی خاطر کسی الزام میں ملوث نہیں کیا۔ ہاں مگر میری رقم اور میرا سامان کہاں ہے؟"

"میں نے فلیٹ میں رکھوادیا ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی "نہیں پاپا، اب میں اس فلیٹ میں قدم نہیں رکھوں گی۔"

"جو ہوا، اسے بھول جاؤ۔ میں نہیں تھا تو جمشید ایسی حماقت کر بیٹھا۔ دیکھو بیٹے! انسان آخر انسان ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تہذیب کے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔"

وہ ناگواری سے بولی "کیوں بھٹک جاتا ہے؟ کیا انسانیت کا کوئی معیار نہیں ہے؟ جس کا جی چاہے، بھٹک جائے۔"

"بیٹے! انسانیت تو ایک انسان کی ذات سے اور ذات کی ذرہ ذرہ پاکیزگی سے اور تنکے تنکے شعور سے ایک آشیانے کی طرح تعمیر ہوتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم ایک ایک ذرے کو پکار نہیں سکتے اور شعور کو تنکا تنکا چن نہیں سکتے۔ ہر انسان کو ایک مرکز پر لاکر ایک انسان، کا معیار قائم نہیں کرسکتے۔ اسی لیے انسانی تاریخ ازل سے انسانیت کی نہیں، بربریت کی مظہر ہے۔"

"تو پھر جہاں بربریت کا مظاہرہ ہو چکا ہے، میں وہاں نہیں جاؤں گی۔"

"مگر باپ کے سائے میں کبھی ایسا نہیں ہوا ہے، نہ ایسا ہوگا کیا تم میری بیٹی نہیں ہو؟"

"بیٹی ہوں مگر دودھ کی جلی ہوں۔"

"ایسی بات نہ کہو۔ میرا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے میرے بیٹے کی غلطیوں کی تلافی کا موقع دو۔"

"آپ تلافی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ یہی آپ کا سب سے بڑا احسان ہوگا۔ مہربانی فرما کر میرا سامان میرے پاس پہنچا دیں۔ میں ابھی اسپتال سے جاؤں گی۔"

"کہاں جاؤ گی؟ کیوں ضد کر رہی ہو؟ یہ لندن شہر ہے۔ اتنی مہنگی جگہ ہے کہ نہ تم روزگار حاصل کر سکتی ہو' نہ کہیں ٹھکانا بنا سکتی ہو پھر یہ کہ پلاسٹک سرجری جیسا مہنگا علاج تمہارے بس کی بات نہیں۔"

"انسان کے بس میں سب کچھ ہے۔ میں یہ ثابت کردوں گی کہ مجھ میں کتنا حوصلہ ہے اور میں کیا کر سکتی ہوں۔ میرے پاس تین ہزار پاؤنڈ ہیں۔ میں اس میں سے اتنی رقم الگ نکال کر رکھوں گی کہ ناکامی کی صورت میں اپنے ملک واپس جا سکوں۔ باقی جو رقم میرے پاس ہوگی میں اس کے بل بوتے پر یہاں رہائش اختیار کروں گی۔ اپنے لیے روزگار تلاش کروں گی۔ دن رات محنت کروں گی اور پلاسٹک سرجری کے اخراجات برداشت کرنے کی کوشش کروں گی' آگے اللہ مالک ہے۔"

انہوں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "تم بہت ضدی ہو۔ چلو میری ایک آخری بات مان لو۔ تم جہاں جانا چاہو گی میں تمہارے سامان کے ساتھ وہاں پہنچا دوں گا۔ میری اتنی سی بات مان لو۔"

"میں ارل ہام کی طرف جانا چاہتی ہوں' وہاں کئی زنانہ سینٹر ہیں۔ وہاں میری مشکل آسان ہو سکتی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ تم انتظار کرو۔ میں تمہارا سامان لے کر ابھی آتا ہوں۔"

وہ جانے لگے تو رخسانہ نے آواز دی "پاپا ایک اور بات سن لیجیے۔ اپنے بیٹے سے کہہ دیجیے کہ میں شادی شدہ ہوں۔"

باقر علی نے پلٹ کر بے یقینی سے دیکھا۔ رخسانہ نے ہاں کے انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا "آپ یقین کرلیں' میں صرف کسی کی بیوی ہی نہیں بلکہ ایک بچے کی ماں بھی

ہوں اپنا ایک ننھا سا بیٹا پاکستان میں چھوڑ کر آئی ہوں۔"

انہوں نے حیرانی سے پوچھا "تو پھر تم نے پاسپورٹ میں اپنے آپ کو مس کیوں ظاہر کیا ہے؟"

"یہی ایک غلطی ہوگئی۔ غلطی کیوں ہوئی؟ اس بات کو دہرا کر میں اپنی نظروں میں نہیں گرنا چاہتی۔"

باقر علی بڑی دیر تک اسے دیکھتے رہ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں سے جانا بھول گئے ہیں' رخسانہ نے پوچھا "آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

انہوں نے چونک کر کہا "آں۔ بس یونہی' کچھ نہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد رخسانہ نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تقریباً سوا دس بجے سے اب تک بے ہوش تھی یا گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وقت گزرنے کا علم ہی نہیں ہوا۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ ڈاکٹر سے نہ مل سکی اور نہ ہی اسے اطلاع دے سکی کہ آج وہ اپنے علاج کے سلسلے میں نہیں آسکے گی۔

سید باقر علی نے کاؤنٹر پر اسپتال کا بل ادا کرنے کے بعد کہا "مس رخسانہ ایک گھنٹے کے اندر اسپتال چھوڑ دیں گی۔"

کاؤنٹر کلرک نے کہا "کوئی بات نہیں' میں ٹائم نوٹ کر لیتا ہوں۔"

باقر علی نے رخسانہ کو مس رخسانہ کہتے وقت جھجک سی محسوس کی۔ وہ جسے مس سمجھ رہے تھے' وہ کسی کی مسز تھی۔ سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسپتال کی عمارت سے باہر آئے۔ پہلی بار جب بیٹے نے رخسانہ کا غائبانہ تعارف کرایا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ پہلے وہ رخسانہ کو دیکھیں گے' اس کے بعد اسے بہو بنانے کے متعلق فیصلہ کریں گے پھر پاکستان سے رخسانہ کے خطوط آتے رہے۔ وہ خطوط بیٹے کے نام تھے لیکن بیٹا انہیں پڑھنے کے لیے دے دیتا تھا۔ تحریر سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ رخسانہ بہت محتاط' سنجیدہ اور باوقار لڑکی ہے پھر وہ لندن آئی اور اس سے روبرو ملاقات کے بعد وہ بے حد متاثر ہوئے۔ فوراً ہی فیصلہ کرلیا کہ رخسانہ ہی بہو بنے گی۔

سید باقر علی سوچتے ہوئے عمارت کے اس حصے میں آئے جہاں ٹیلی فون بوتھ تھا۔ وہ ایک بوتھ کے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت ان کے دماغ میں ایک پاکستانی خاتون سلمیٰ قادر کا نام تھا۔

سلمیٰ قادر نے پیشام پلیس میں ایک ذاتی اسپتال قائم کیا تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی باشندوں کو سستا علاج مہیا کیا جائے۔ اس کے لیے وہ پاکستانی اور ہندوستانی ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرتی تھیں۔ انہوں نے فون پر ان سے رابطہ قائم کیا۔ تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے سلمیٰ قادر کی آواز سنائی دی۔ باقر علی نے کہا "ہیلو سلمیٰ! میں باقر بول رہا ہوں۔ کیا تمہارے اسپتال میں کسی لیڈی ڈاکٹر کے لیے ویکنسی ہے؟"

"ابھی تو نہیں ہے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میری ایک دور کی عزیزہ کی جوان لڑکی ہے۔ وہ ایک اچھی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ ابھی حال ہی میں کالج سے نکلی ہے۔ یہاں پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنے چہرے کے کچھ عیب دور کرانے آئی ہے۔ اس سلسلے میں اسے کافی رقم کی ضرورت ہے۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں' وہ بہت خود دار ہے۔ براہ راست مجھ سے کوئی مدد حاصل نہیں کرے گی۔"

"میں سمجھ گئی۔ چلو تمہاری خاطر میں ایک لیڈی ڈاکٹر کے لیے ویکنسی نکال لوں گی۔"

"تم ڈاکٹروں کو کیا دیتی ہو؟"

"تم جانتے ہو کہ چیریٹی اسپتال ہے۔ میں ایک ڈاکٹر کو ستر پاؤنڈ فی ہفتہ دیتی ہوں اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو چالیس پاؤنڈ فی ہفتہ......"

"یہ تو بہت کم ہے۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے اخراجات پورے نہیں ہوں گے۔ بہرحال تم مس رخسانہ کو ستر پاؤنڈ فی ہفتہ دے سکتی ہو۔ یہ پے میری طرف سے ہوا کرے گی۔"

باقر علی نے مس رخسانہ کہتے وقت پھر ذرا دکھ محسوس کیا۔ سلمیٰ قادر نے کہا "یہاں ڈاکٹر دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے شام کو اسپتال میں ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ مس رخسانہ اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کے سلسلے میں بھی مصروف رہا کریں گی۔ کیا یہ ڈیوٹی کے وقت

یہاں حاضر ہو سکیں گی۔"

"ہاں' یہ سوچنے کی بات ہے۔ تم کوئی مشورہ دو۔"

"میں کیا بتاؤں' مس رخسانہ میرے اسپتال میں برابر ڈیوٹی نہیں دیں گی اور انہیں ستر پاؤنڈ فی ہفتہ ادا کئے جائیں گے تو یہاں کی دوسری لیڈی ڈاکٹرز اور ڈاکٹر احتجاج کریں گے یا پھر اپنی تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کریں گے۔ ویسے یہ بتاؤ کہ مس رخسانہ کی رہائش کہاں ہے؟"

"رہائش کا بھی مسئلہ ہے۔ وہ ابھی کسی وومن سینٹر میں جا کر معلوم کرنا چاہتی ہے کہ ایک اکیلی عورت کے رہنے کے لیے کون سی جگہ محفوظ ہو سکتی ہے۔"

"یہ پرابلم نہیں ہے۔ میرے اسپتال کے اسٹاف کے لیے جو ایک ایک کمرے کے اپارٹمنٹس ہیں' میں اس میں سے ایک اپارٹمنٹ اسے دے سکتی ہوں۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔ وہیں اس کے کھانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ چلو ایسا کرو کہ اسے پارٹ ٹائم ملازمت دے دو اور پچیس پاؤنڈ فی ہفتہ دیا کرو۔ اس سے دوسرے ڈاکٹروں کو اعتراض نہیں ہو گا۔ باقی میں سوچتا ہوں کہ اس کی امداد کس طرح کی جا سکتی ہے۔"

"باقر علی! ایک تدبیر ذہن میں ہے۔ دنیا کے کروڑ پتی اور ارب پتی ڈاکٹروں نے ایک امدادی بینک قائم کیا ہے۔ ان کے منشور کے مطابق وہ ایسے خستہ حال ڈاکٹروں کو مالی امداد دیتے ہیں جو کسی مہلک دائمی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا کسی میجر آپریشن سے گزرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی شرط یہ ہے کہ وہ جتنی رقم امداد کے طور پر دیتے ہیں اس کی نصف رقم قسطوں میں واپس لیتے ہیں۔ باقی نصف رقم کا تقاضا نہیں کرتے۔"

باقر علی نے خوش ہو کر کہا "واہ تم نے بڑی خوش خبری سنائی ہے۔ اس سے رخسانہ کی مشکلات دور ہو جائیں گی اور اس کی خودداری بھی قائم رہے گی۔ کیا تم اس کے لیے یہ امداد حاصل کر سکو گی؟"

"ضرور تم اطمینان رکھو۔"

"اچھا تم ارل ہام کے کسی زنانہ سینٹر کا پتا یا فون نمبر جانتی ہو؟"

"میں ابھی ڈائریکٹری میں دیکھ کر فون نمبر معلوم کر لوں گی۔"

"تو فوراً ڈائریکٹری دیکھو اور کسی اچھے زنانہ سینٹر کا نام اور پتا بتاؤ تاکہ میں رخسانہ کو وہاں لے جاؤں۔ اس سے پہلے تم اس زنانہ سینٹر میں فون کے ذریعے اطلاع کر دینا کہ تمہیں اپنے اسپتال کے لیے ایک لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ لیڈی ڈاکٹر ایشیا کے ملک سے تعلق رکھتی ہو۔ جب میں رخسانہ کو لے کر وہاں پہنچوں گا تو یقیناً وہ زنانہ سینٹر والے رخسانہ کو تمہارا ہی پتا بتائیں گے۔ تم سمجھ گئیں نا؟"

"ہاں، تم انتظار کرو۔ میں ابھی پتا بتاتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد سلمیٰ قادر نے انہیں ایک زنانہ سینٹر کا پتا بتا دیا۔ وہ ریسیور رکھ کر بوتھ سے باہر آ گئے پھر کار میں بیٹھ کر اپنے فلیٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازے کے سامنے زینے پر جمشید سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کار سے اتر کر باہر آئے۔ زینے پر قدم رکھ کر بیٹے کو دیکھا۔ وہ بدستور نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ باپ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ انہوں نے جیب سے چابی نکالی پھر دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ ایک بیڈ روم میں رخسانہ کا سامان رکھا ہوا تھا وہ اس سامان کو اٹھانا چاہتے تھے۔ پیچھے سے جمشید کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ندامت سے سر جھکائے کہہ رہا تھا "پاپا! میں بہت شرمندہ ہوں۔"

انہوں نے ناراضگی سے دیکھتے ہوئے کہا "اس سے پہلے بھی تم شرمندگی ظاہر کر چکے ہو لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کے دل میں جو میل آ گیا ہے، اسے دھویا نہیں جا سکتا ہے۔ کیا اب وہ تم پر یا مجھ پر اعتماد کرے گی۔ کبھی نہیں۔ اس لیے تو اس نے اپنا سامان منگوایا ہے۔ اب وہ تنہا اس شہر میں رہنا چاہتی ہے اور اپنا علاج کرانا چاہتی ہے۔"

"میں اسے سمجھاؤں گا تو وہ میری نہیں سنے گی۔ آپ سمجھائیں یہ بہت مہنگا شہر ہے بہت مہنگا علاج ہے۔"

"میں اسے سمجھا چکا ہوں، وہ بہت ضدی ہے۔"

وہ سامان اٹھانے لگے۔ جمشید نے جلدی سے آگے بڑھ کر بڑا سا سوٹ کیس اٹھایا پھر دوسرا سامان بھی اٹھائے ہوئے باہر جانے لگا۔ وہ اسے دیکھتے رہے۔ جب وہ سامان باہر ڈگی میں رکھ کر واپس آیا تو انہوں نے کہا "دیکھو، ابھی وہ بہت غصے میں ہے۔ تم اس کے سامنے نہ جانا۔ میں اس کی رہائش کا انتظام کر رہا ہوں۔ ایک پارٹ ٹائم ملازمت بھی

اسے مل جائے گی لیکن یہ سب کچھ میں ان ڈائریکٹ وے میں کر رہا ہوں۔ اسے معلوم ہو جائے گا تو وہ ہماری یہ اخلاقی امداد بھی قبول نہیں کرے گی۔"

وہ رخسانہ کے سفری بیگ کو اٹھا کر جانے لگے۔ جمشید نے کہا "آپ تو اس سے مل سکتے ہیں۔ آپ میری طرف سے کوشش کر سکتے ہیں کہ کسی طرح اس کا دل صاف ہو جائے۔"

وہ کاریڈور میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں سے پلٹ کر کہا "اب دل کے صاف ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تمہیں یہ بری خبر سنا دوں کہ وہ شادی شدہ ہے۔"

جمشید نے چونک کر اپنے باپ کی طرف دیکھا پھر بے یقینی سے بولا "نہیں پاپا، میں آپ کی چالاکی سمجھتا ہوں۔ آپ مجھے اس سے دور کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔"

"میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ وہ صرف شادی شدہ نہیں بلکہ ایک بچے کی ماں بھی ہے۔"

"بس کیجیے پاپا! جھوٹ کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آپ صاف کہہ دیجیے کہ میں اسے دل سے نکال دوں۔"

"ہم جھوٹوں کی دنیا میں سچائی کبھی اچانک سامنے آتی ہے تو ہمیں یقین نہیں آتا جب تمہیں یقین آئے تو اسی وقت دل سے نکال دینا۔ ابھی مجھے جھوٹا ہی سمجھو۔"

"اتنا بتا دیجیے۔ اگر وہ شادی شدہ تھی تو اس نے یہ بات کیوں چھپائی؟"

"میں نے اس سے نہیں پوچھا کیونکہ وہ جھوٹ پر شرمندہ تھی۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے ہمیں دھوکا کیوں دیا۔ آپ کو پوچھنا چاہیے تھا۔"

"اگر کوئی اپنے کیے پر شرمسار ہو تو اس سے کچھ نہیں پوچھنا چاہیے۔ میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے پچھلی رات اتنی زیادہ کیوں پی تھی اور تم انسان سے شیطان کیوں بن گئے تھے؟"

جمشید کا سر جھک گیا۔ انہوں نے کہا "دیکھو بیٹے! اس وقت تم سر جھکائے میری باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ جب بھی کوئی خطاکار شرم سے سر جھکا لیتا ہے وہ اپنے اندر اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ دوسروں کو چاہیے کہ پھر اس سے کچھ نہ کہیں اس کا محاسبہ نہ کریں۔ اسے اس کے حال پر سوچنے کے لیے چھوڑ دیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے خاموش نظروں سے بیٹے کو دیکھا پھر پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہاں سے جانے لگے۔ جب بیرونی دروازے کے پاس پہنچے تو جمشید نے آواز دی "پاپا!"

وہ دروازے سے پلٹ گئے پھر پوچھا "اب کیا ہے؟"

"خواہ وہ شادی شدہ ہو۔ خواہ وہ ایک بچے کی ماں ہو۔ میں اسے چاہوں گا۔"

وہ غصے سے آگے بڑھتے ہوئے بولے "کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ کیا دنیا میں اس سے زیادہ حسین اور ذہین لڑکی کوئی نہیں ہے؟"

"ہو گی لیکن آپ نے اسے مکمل نہیں دیکھا ہے جب پلاسٹک سرجری کے بعد مکمل ہو گی تو......"

"تو کیا ہو گا؟ کیا وہ حسینہ عالم کہلائے گی؟"

"وہ میری ضد ہے۔"

"کیسی ضد؟"

"میں اپنے دوستوں کو فیس نہیں کر سکوں گا۔ پاکستان میں اور یہاں انگلینڈ میں میرے کالج کے ایسے کتنے ہی ساتھی ہیں جن کے سامنے شرط لگ چکی ہے کہ میں رخسانہ کو حاصل کر کے رہوں گا۔ اسے اپنی شریک حیات بناؤں گا۔ اگر میں یہ شرط ہار گیا تو۔"

"تم اپنے دوستوں کو آسانی سے سمجھا سکتے ہو کہ تم نے یہ بازی شروع کرنے میں دیر کر دی۔ اس وقت تک رخسانہ کی شادی ہو چکی تھی اور اب وہ ایک بچے کی ماں ہے۔ دیکھو بیٹے یہ سب کالج کا کھلنڈرا پن ہے' اس سے باز آجاؤ۔ اسے اپنی انا کا مسئلہ نہ بناؤ۔"

جمشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دروازے سے ٹیک لگا کر سر کو جھکا لیا۔ باقر علی وہاں سے پلٹ کر جانے لگے۔ دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ پھر بیٹے نے پکارا "پاپا! ایک بار کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

انہوں نے پلٹ کر پوچھا "کیسی کوشش؟"

"یہی کہ شاید وہ اپنے شوہر سے طلاق لے لے۔"

انہوں نے حیرانی اور پریشانی سے بیٹے کو دیکھا۔ بڑی دیر تک دیکھتے رہے پھر سر کو

جھٹک کر بڑے دکھ سے کہنے لگے۔ "ہم بوڑھوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی جوان نسل کو کس طرح سمجھائیں۔ اگر سختی کرتے ہیں تو الزام آتا ہے کہ ہم ظالم ہیں' سخت ہیں اور اپنے راستے پر چلانے کے لیے اپنی بات منواتے ہیں اور اگر پیار محبت سے سمجھایا جائے اپنی اولاد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں تو میرے بچے! تم لوگ اتنے ذہین ہو کہ ہمارے گھٹنے ٹیکنے کو بوڑھوں کی شکست سمجھ لیتے ہو۔ ہم کیا کریں' بتاؤ بیٹے ہم کیا کریں؟ کیا میں تمہارے سامنے سر پھوڑ لوں یا تمہاری غلطیوں کی تلافی کرنے کے لیے اس لڑکی کے پیچھے پریشان ہوتا رہوں جو پردیس میں آکر اپنی ضد کی وجہ سے تنہا بھٹکنا چاہتی ہے اور ہماری مدد لینا نہیں چاہتی۔ یہ ہمارے لیے کتنے شرم کی بات ہے' کیا تم اسے محسوس کر سکتے ہو۔ اگر کر سکتے ہو تو اس گھر سے باہر نہ نکلنا۔ اس لڑکی سے نہ ملنا میری یہ آخری التجا ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے دروازے کو کھولا پھر باہر جاتے ہوئے اسے ایک جھٹکے سے بند کر دیا۔ وہ چپ چاپ دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا سوچتا رہا۔ کوئی چیز آسانی سے مل جائے تو اس کی وہ قدر نہیں ہوتی۔ ذرا کوشش سے ملے تو قدر بڑھ جاتی ہے اور جب وہ نہ ملے تو ضد پیدا کر دیتی ہے۔ ایک چیلنج بن جاتی ہے۔ التجا سے نہیں مل سکتی تو دولت سے حاصل کرو۔ دولت سے نہیں مل سکتی تو زور بازو سے چھین لو۔ زور بازو سے بھی چھینی نہیں جا سکتی تو پھر قدموں میں سر پھوڑ دو۔ کوئی بات نہیں سر جائے مگر سودائی کی روایت رہ جائے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باتھ روم کے سامنے آیا پھر وہاں آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے چہرے کو انگلیوں سے چھو کر دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا مجھ میں کس بات کی کمی ہے' میں خوبرو ہوں' دولت مند ہوں' عزت دار ہوں پھر وہ میری طرف مائل کیوں نہیں ہوتی۔ اس کا شوہر کون ہے؟ مجھ سے زیادہ عزت دار ہے؟ مجھ سے زیادہ دولت مند ہے' مجھ سے زیادہ خوبرو ہے' آخر کون ہے وہ؟

اس کے دماغ نے سمجھایا۔ وہ جو کوئی بھی ہو گا' ایسا ہو گا کہ جس کے سامنے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی ہے۔ وہ کنواری بن کر آئی۔ اپنے شوہر کو مجھ سے چھپایا مگر اپنے شوہر کے اعتماد کو اتنا قائم رکھا کہ ایک بار میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔ گویا کہ وہ سر سے پاؤں تک صرف اور صرف اپنے مرد کے لیے ہے' کون ہے وہ شخص؟

اس نے دانت پیستے ہوئے آئینے میں دیکھا۔ ایک بات سمجھ میں آئی۔ وہ جو بھی ہے' غریب ہے' پلاسٹک سرجری کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا۔ حد تو یہ ہے کہ رخسانہ اس کی غریبی سے بھی پیار کرتی ہے۔ اس قدر محبت کرتی ہے کہ اس کی خاطر برسوں ٹھوکریں کھانے پر تیار ہے لیکن اب مجھ سے' پاپا سے مالی امداد لینا بھی گوارا نہیں کرتی ہے۔ آخر اس شخص میں کیا خوبی ہوگی؟

آخر وہ انسان کا بچہ ہے' اس میں کوئی کمزوری ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ لالچی ہو اور میں اسے خرید سکوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ عیاش ہو۔ کتنے ہی مرد اپنی بیویوں کو میکے بھیج کر دوسری عورتوں سے عشق کرتے ہیں۔ اس نے تو رخسانہ کو ہزاروں میل دور بھیج دیا ہے۔ معلوم نہیں وہاں کیا کررہا ہوگا۔ مجھے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہوں گی۔

لیکن کیسے معلومات حاصل کی جائیں؟

اس نے غصے سے آئینے کی طرف دیکھا پھر گھونسا دکھاتے ہوئے پوچھا "ابے کون ہے تو؟"

○☆○

وہ ٹیکسی کی اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھا کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ ہیڈلائٹس کی پوری روشنی کھڑکی پر پڑرہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید کھڑکی کھل جائے پھر اس نے ہیڈلائٹس کو بجھا دیا۔ ٹیکسی کو اسٹارٹ کرکے ذرا پیچھے کیا پھر اسے گھما کر سڑک کی دوسری طرف لے گیا تاکہ دوسرے یہ شبہ نہ کریں کہ وہ لیڈی ڈاکٹر سے عشق کرنے آیا ہے۔

فرزانہ دیوار کے ساتھ کھڑکی کے پاس دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ عجیب مشکل میں گرفتار تھی۔ کھڑکی کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ دعا کررہی تھی کہ جانی کو عقل آجائے اور وہ وہاں سے چلا جائے۔

پھر اس نے گاڑی کے دوبارہ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اب وہ گاڑی دور جارہی تھی۔ اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی' وہ جارہا تھا۔ جب اس بات کا یقین ہوا کہ وہ جارہا ہے تو دل میں عجیب سی بے چینی پیدا ہوئی۔ نہ اس کروٹ چین تھا' نہ اس کروٹ۔

اس نے آہستگی سے پردے کو ذرا سا سرکایا پھر کھڑکی کو تھوڑا سا کھول کر دیکھا' کھڑکی کی جالی کے اس پار ویران سڑک کے دوسری طرف ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رات وہیں گزارنے والا تھا۔ اپنی ضد پوری کرنے والا تھا۔ اس نے جلدی سے کھڑکی کو بند کردیا۔ پردے کو برابر کیا پھر گھبرائے ہوئے انداز میں اپنی دھڑکنوں پر ہاتھ رکھے بستر پر آکر بیٹھ گئی۔

پچھلی رات اس کی امی کی تجہیز و تکفین کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد وہ روتی ہوئی ساری رات اپنی امی کے بغیر جاگتی رہی۔ آج ایک مدت کی آنکھ مچولی کے بعد جانی سے سامنا ہوگیا تھا۔ اس نے ایسے زخم پہنچائے تھے' ایسی کاری ضربیں لگائی تھیں کہ آدھی جان نکل گئی تھی۔ دوپہر کو دواؤں کے اثر سے کچھ دیر سوتی رہی مگر دو تین بار چونک کر اٹھ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آرہا ہو۔

اور وہ آہی گیا۔ رات بھر جگانے کے لیے' اسے ستانے کے لیے اور تڑپانے کے لیے۔ حالانکہ وہ سامنے نہیں تھا۔ گھر کے اندر نہیں آیا تھا' دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھڑکی بھی بند تھی۔ نہ وہ اسے دیکھ سکتا تھا' نہ آکر ظلم کرسکتا تھا۔ نہ اپنی ضد منوا سکتا تھا۔ وہ خود کو تسلیاں دینے لگی۔

سونے سے پہلے وہ اپنے دوپٹے کو کھونٹی سے لٹکا دیتی تھی۔ اس وقت وہ دوپٹے سے سر کو اور سینے کو اچھی طرح ڈھانپ رہی تھی۔ رہ رہ کر دوپٹہ درست کررہی تھی۔ کبھی تصور اتنا سچا اور ناقابل انکار ہوتا ہے کہ نامعلوم آنکھیں چاروں طرف سے دیکھتی رہتی ہیں۔

کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ باورچی خانے سے تھوڑی سی روشنی آرہی تھی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ پہلے تو وہ بیرونی دروازہ بند تھا۔ اسکے بعد کمرے کا یہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ دونوں دروازے ڈھال کی طرح مضبوط تھے۔ وہ آہستہ آہستہ ڈری ڈری سہمی سہمی لیٹ گئی۔

رات الجھے الجھے جذبوں کی طرح پیچیدہ اور گہری تھی۔ وہ آنکھیں کھولے نیم تاریکی میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے کمرے کے ایک گوشے میں دیکھا تو وہاں اندھیرے میں جانی کے دانت چمک رہے تھے۔ وہ محبت سے مسکرا بھی رہے تھے اور اسے کچا بھی چبا رہے

تھے۔ اس نے پریشان ہو کر وہاں سے نظریں ہٹالیں۔ دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ادھر چند لمحوں تک دیکھتی رہی پھر جانے کیا محسوس ہوا کہ لیٹے ہی لیٹے اپنے پاؤں اپنی طرف سمیٹ لیے اور آپ ہی آپ سکڑنے لگی۔

کیسا بادل تھا، برستا بھی نہیں تھا، چھٹتا بھی نہیں تھا۔

وہ یوں تڑپ کر اٹھ گئی جیسے بھاپ بن کر اڑنے والی ہو۔ کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ وہ پلنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئی اسے باہر آنے کی پروا نہیں تھی۔ گھر کا آسیب سونے نہیں دے رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک ٹہلتی رہی پھر اس نے گلدان کو میز پر صحیح جگہ رکھا۔ ایک صافی لے کر سینٹر ٹیبل کو پونچھنے لگی پھر صوفوں کو بھی کپڑے سے جھاڑنا شروع کیا۔

دوسری صبح مرحوم ماں کا سوئم تھا۔ محلے کی عورتیں قرآن خوانی کے لیے آنے والی تھیں، اسی بہانے پورے گھر کی صفائی ہو جاتی تو بہتر ہی ہو جاتا۔ یہ سوچ کر اس نے سوئچ کو آن کیا اور کمرا روشن ہو گیا۔

سوئچ کے آن ہوتے ہی کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ وہ کھڑکی بھی روشن ہو گئی تھی۔ کچھ روشنی باہر کی طرف جھلک رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ اب کیا ہو سکتا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

وہ تھوڑی دیر گم صم کھڑی رہی پھر کمرے کی صفائی میں مصروف ہو گئی۔ ایک ایک چیز کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا اور انہیں سلیقے سے رکھا۔ فرش کو بھی صاف کیا اور صوفوں کو گھسیٹ کر ایک دیوار کی طرف لے گئی۔ بیچ کا حصہ خالی کر دیا پھر اسٹور روم سے بڑی سی دری لا کر بچھائی۔ اس کے اوپر سفید چادر بچھادی پھر ایک تکیے پر سفید غلاف چڑھا کر اسے چادر کے درمیان رکھا تاکہ صبح کلام پاک کے سپارے اس پر رکھے جائیں۔

اتنی محنت کے بعد بھی وقت نہیں گزرا۔ اس وقت ڈھائی بجے تھے۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر ڈسپنسری میں آئی۔ وہاں کی لائٹ بھی آن کی۔ اب تو شب بیداری کا بھید کھل ہی چکا تھا۔ وہ ڈسپنسری کی صفائی کرنے لگی۔ دواؤں کو ترتیب سے رکھنے لگی۔ کافی وقت گزر گیا پھر وہ وہاں سے باورچی خانے میں آئی اور وہاں کی صفائی کرنے لگی۔ تب بڑی دیر بعد اذان کی آواز سنائی دی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔

موذن مرحبا۔

تو صبح کی آواز ہے۔

جو رات میری عمر سے زیادہ تھی۔

تو نے اس کے گزرنے کی نوید دی۔

موذن شکریہ۔ صد شکریہ۔

تیری آواز کے اور مدینے۔

وہ باورچی خانے سے نکل کر کمرے میں آگئی۔ باہر سڑک پر گاڑیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں تھیں۔ وہ تھوڑی دیر تک وہیں کھڑی رہی پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس آئی۔ پردے کو ذرا سا سرکایا اور کھڑکی کو تھوڑا سا کھول کر دیکھا۔ باہر صبح کی ملگجی روشنی تھی۔ سڑک کے دوسری طرف وہ ٹیکسی نظر آئی۔ اس کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک دیکھتی رہی پھر اس نے کھڑکی کو بند کر دیا۔ پردے کو برابر کیا۔ کچھ سوچتے ہوئے کمرے سے نکل کر ڈسپنسری میں آئی۔ وہاں سے چلتے ہوئے بیرونی دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ جانی کے سامنے جا کر اس کا حوصلہ نہیں بڑھانا چاہتی تھی مگر دوسرے انداز میں جانا چاہتی تھی تاکہ اس کا حوصلہ پست ہو جائے۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ جانی سے سخت لہجے میں یہ کہنے کا ارادہ تھا کہ ساری رات برباد کر کے کیا فائدہ ہوا۔ میری بھی نیند خراب کی اور خود بھی جاگتے رہے۔

وہ سوچتے ہوئے سڑک کو پار کر کے جب ٹیکسی کے پاس پہنچی تو پچھلی سیٹ پر وہ خراٹے لیتا ہوا نظر آیا۔ اسے گہری نیند میں سوتے دیکھ کر وہ جھنجلا گئی۔ جی میں آیا کہ وہ اس کا منہ نوچ لے، کیسا ظالم ہے۔ کیسی سنگ دلی ہے کہ رات بھر اسے جگاتا رہا اور خود گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔

اس نے کھڑکی کے شیشے پر زور سے دستک دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا جیسے خواب دیکھ رہا ہو پھر اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ دوبارہ شیشے پر دستک ہوئی وہ باہر نکلتے ہوئے بولا "مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ ابھی میرے ہاں قرآن خوانی ہے۔"

"میں کیا کروں۔ میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔"

"میں تمہیں پڑھنے کے لیے نہیں' یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ ابھی تمہاری ساس بھی قرآن خوانی میں شریک ہونے کے لیے آئیں گی' انہوں نے تمہاری ٹیکسی یہاں دیکھ لی تو کیا ہو گا؟"

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا "ہاں' یہ تو میں نے سوچا نہیں تھا ٹھیک ہے' قرآن خوانی کب ختم ہو گی؟"

"جب بھی ختم ہو۔ تم سے کیا مطلب؟"

"مطلب ہے۔ اگر نہ ہوتا تو تم مجھے یہ کہنے نہ آتیں کہ میں ابھی چلا جاؤں یعنی تم مجھے میری ساس کی نظروں سے چھپا رہی ہو۔ نہیں چاہتیں کہ وہ ہم دونوں کو ایک جگہ دیکھے ٹھیک ہے میں قرآن خوانی کے بعد آجاؤں گا۔"

وہ حیران حیران سی اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی "کیا واقعی میں جانی کو رخسانہ کی امی سے چھپانے کے لیے یہاں آئی ہوں۔ مجھ سے پھر کیسی غلطی ہو گئی ہے۔"

وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا "میں جا رہا ہوں تمہیں بدنام نہیں کروں گا۔"

وہ کھڑکی پر جھکتے ہوئے بولی "جانی! کچھ تو سوچو کہ رخسانہ پردیس میں ہے' اسے تمہارے ایک ایک پیسے کی ضرورت ہے۔ تم اس طرح وقت ضائع کر رہے ہو۔ کیا کما رہے ہو اسے کیا بھیجنے والے ہو۔ کبھی تم نے سوچا ہے؟"

جانی کی نظریں جھک گئیں۔ فرزانہ نے اس کی دکھتی رگ پکڑلی تھی۔ وہ ذرا دیر تک سوچتا رہا پھر فرزانہ نے کہا "دیکھو مجھے میری بات کا جواب دو۔ میں یہاں کھڑی رہوں گی تو آس پاس کے لوگ شبے میں مبتلا ہو جائیں گے۔"

اس نے کہا "اچھی بات ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ دن بھر ٹیکسی چلاؤں گا۔ رخسانہ کے لیے کماؤں گا لیکن رات کے آٹھ بجے تک پھر یہاں پہنچ جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ فرزانہ کو شام تک کے لیے اطمینان ہو گیا۔ وہ وہاں سے گھوم کر اپنے کلینک کے اندر چلی گئی۔

جانی شام کو آیا تو رات بھر اسی جگہ ٹیکسی میں سوتا رہا۔ یہ معلوم ہو گیہ
ے فرزانہ کے چچا اور رشتے دار تعزیت کے لیے آئے ہیں۔ لہٰذا دال نہیں گلے گی سیلن

ضد کا پکا تھا۔ روز رات کو آتا تھا اور صبح گاڑی لے کر چلا جاتا تھا۔ فرزانہ ابھی دیکھ رہی تھی۔ آخر پانچویں دن صبح کے وقت وہ بال بکھرائے پریشان حال اس کے پاس آئی وہ بیدار ہو چکا تھا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ فرزانہ نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ جانی ایک دم سے خوش ہو کر باہر آیا پھر پچھلے دروازے کو بند کر کے اسٹیئرنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ نہ وہ بولی نہ یہ بولا۔ کچھ کہے سنے بغیر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھا دیا۔ وہ اورنگی کے علاقے سے نکل کر بنارس پہنچے اس وقت تک خاموشی رہی۔ جانی نے اس کی طرف دیکھے بغیر خوش ہو کر کہا "میں جانتا ہوں تم مجھے دل سے چاہتی ہو مگر اوپر سے غصہ دکھاتی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ جواب کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ جب بہت دیر تک جواب نہ ملا تو اس نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے سر جھکائے اونگھ رہی تھی۔

یک بارگی جانی کو ندامت کا احساس ہوا' کیا وہ تمام رات جاگتی رہی تھی؟ اس نے پھر آہستگی سے مخاطب کیا "فرزانہ! کیا تم سو رہی ہو؟"

وہ ایک دم چونک گئی پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولی "یہ تم کہاں لے جا رہے ہو؟ میں تمہارے گھر جانے کے لیے نہیں آئی ہوں تم سے دو ٹوک فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

وہ چند لمحوں تک خاموش رہا' پھر بولا "تمہیں نیند آرہی ہے فیصلہ کیا کرو گی؟"

"نیند تو آتی رہے گی اور میں اسے ٹالتی رہوں گی۔ تمہیں کچھ خیال ہے چھ دنوں سے میں کبھی رات کو پوری نیند سو نہیں سکی۔ ہمیشہ چونک کر اٹھ جاتی ہوں کبھی دن کو سونے کا موقع ملتا ہے تب بھی تم میرے حواس پر چھائے رہتے ہو۔"

"اسے محبت کہتے ہیں۔"

"فضول باتیں نہ کرو اسے خوف اور وحشت بھی کہتے ہیں۔ میں تمہارے ڈر سے سو نہیں سکتی۔ کبھی بدنامی کا خیال آتا ہے کبھی تمہاری درندگی یاد آتی ہے تو رونے لگتی ہوں اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ تم مجھے مار ڈالو گے تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا۔ اسی لیے آگئی ہوں' کہیں دور لے جاؤ اور مجھے قتل کر دو۔ جتنا انتقام لے سکتے ہو لے لو۔ مرنے

کے بعد تو میں بے خوف ہو کر سو سکوں گی۔"

"میں جانتا ہوں تمہارے غصے کے پیچھے پیار ہے۔"

"تم جانتے ہی رہو۔"

"انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں چھ راتوں سے تمہارے دروازے کے پاس دھرنا دیے بیٹھا ہوں۔ تم چاہتیں تو محلے والوں سے میری پٹائی کرا سکتی تھیں، پولیس والوں کو لا سکتی تھیں۔ میرے خلاف رپورٹ لکھا سکتی تھیں، قانونی کارروائی کر سکتی تھیں مگر تم نے نفرت ظاہر کرنے والا کوئی قدم نہیں اٹھایا۔"

"جانی! مشکل یہ ہے کہ تم صرف اپنے نقطۂ نظر سے سوچتے ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ میں اکیلی لڑکی ہوں۔ اگر ایسے اقدامات کروں گی تو بدنام ہو جاؤں گی لوگوں کی زبانیں ایک نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے اپنے طور پر بولنا شروع کر دیں گے۔ کچھ لوگ مجھے بے گناہ سمجھیں گے کچھ لوگ مجھے بدکار کہیں گے۔ کچھ لوگ طرح طرح کے قصے گھڑنا شروع کر دیں گے۔

پھر میں امی کی وفات کے بعد تنہا رہ کر جتنی پریشان ہوں وہ پریشانی میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ میری پریشانیوں کا خیال کرو مجھ اکیلی کو بدنام نہ کرو۔ تم میرے گھر کے پاس رہو گے تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ اگر تم یہ سب کچھ انتقام لینے کے لیے کر رہے ہو تو سیدھی سی بات ہے مجھے مار ڈالو۔"

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا "اگر میں بدمعاش اور قاتل ہوتا تو سب سے پہلے رخسانہ کو قتل کر دیتا۔ کیونکہ وہ جھوٹ کے راستے میری شریک حیات بن کر آئی تھی لیکن میں کیا بتاؤں کہ میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے پاربتی پور، سنتاہار اور ڈھاکا میں اپنی ماؤں کی لاشیں دیکھی ہیں۔ اپنی بہنوں کے برہنہ جسم پر چادر ڈالی ہے بچوں کو نیزوں پر دیکھا ہے۔ میں جب بھی غصے میں آتا ہوں۔ کسی سے انتقام لینا چاہتا ہوں تو وہ تمام منظر میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے ہیں۔"

وہ ونڈ اسکرین کے پار یوں دیکھنے لگا جیسے وہ منظر اب بھی اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا ہو پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"اب کوئی مجھ سے جھوٹ بولتا ہے، مجھے دھوکا دیتا ہے تو میں جلدی معاف کر دیتا ہوں۔ غصے میں آتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ نہیں دھوکا دینے والوں کو زندہ رہنے کا موقع دینا

چاہیے۔ معلوم نہیں، پھر کوئی ایسا ظالم وقت کب لوٹ آئے۔ کوئی درندہ تمہیں یا رخسانہ کو مار ڈالے تو زندگی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جائے گی پھر کچھ نہیں رہے گا۔ کیا فائدہ ہے ایسی درندگی سے۔ غصے میں معاف کرنا اور صبر کرنا بہت مشکل ہے اور یہ مشکل کام میں کر رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر وہ نیند سے بوجھل آواز میں بولی "کیا تم مجھے چاہتے ہو؟"

"یہ پوچھنے کی نہیں سمجھنے کی بات ہے۔ ویسے تمہیں نیند آ رہی ہے یہ باتیں بعد میں کر لینا۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ وہاں تم سکون سے سو سکتی ہو۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"تم جاؤ گی۔ دیکھو، اگر اپنے گھر میں سونا چاہو گی تو مریض آ کر پریشان کریں گے۔ یہاں تم میرے گھر چلو اور میرے کمرے میں جا کر دروازے کو اندر سے بند کر کے آرام سے سو جاؤ۔ جب دروازہ بند رہے گا تو میرا بھی ڈر نہیں رہے گا اور جب تم میری پناہ میں رہو گی تو نیند سے چونک کر نہیں اٹھو گی۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ اگر وہ اپنے گھر میں سونا چاہتی تو آنے والی مریض عورتیں اسے سونے نہ دیتیں۔ کیونکہ دس بجے سے کلینک کا وقت شروع ہوتا تھا لیکن یہ بات بھی غلط ہے کہ وہ تنہا کسی کے مکان میں جائے۔ خواہ وہ انسان فرشتہ ہی کیوں نہ بن گیا ہو۔ وہاں تو صرف تنہا جانے کی نہیں نیند پوری کرنے کی بھی بات تھی، اس نے کہا "میں نہیں جاؤں گی مجھے واپس پہنچا دو۔"

"یہ راستہ میرے گھر کی طرف جا رہا ہے اگر تمہیں انکار ہو اور احتجاج کرنا چاہو تو چیخنا چلانا شروع کر دو۔ لوگ میرے پیچھے آئیں گے اور مجھے پکڑ کر قانون کے حوالے کر دیں گے۔"

"تم جانتے ہو میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

"کیوں نہیں کر سکتیں؟"

"لوگ مجھ سے بھی طرح طرح کے سوالات کریں گے کہ میں تمہارے ساتھ گاڑی میں کیوں بیٹھی تھی۔"

"گاڑی میں کتنی ہی لڑکیاں بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہیں۔"

"وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر جاتی ہیں۔ میں اگلی سیٹ پر ہوں۔ پچھلی اور اگلی سیٹ کا فرق کیا ہوتا ہے' لوگ خوب سمجھتے ہیں۔"

"تم بھی سمجھتی ہو اور سوچ سمجھ کر میرے پاس بیٹھی ہوئی ہو۔"

وہ چپ ہو گئی۔ اس نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ اس کا جواب نہ بن پڑا۔ اس نے ایک جگہ گاڑی کو روکتے ہوئے کہا "ادھر دور ایک حلوائی کی دکان ہے۔ گرما گرم بھاجی، پوریاں ملیں گی۔ میں تمہیں بھوکا نہیں سونے دوں گا۔ یہاں انتظار کرو۔ ابھی لے کر آتا ہوں۔"

وہ ٹیکسی سے اتر کر تیزی سے چلتا ہوا حلوائی کی دکان کی طرف جانے لگا۔ وہاں جگہ ایسی تھی کہ وہ گاڑی پارک نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے بہت فاصلے پر فرزانہ کو چھوڑ کر آنا پڑا۔ دل میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید وہ اتر کر دوسری ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی نہ جائے۔ اس سے پہلے بھی وہ اس کی ٹیکسی سے اتر کر دوسری ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ حلوائی کی دکان میں بھیڑ تھی۔ واپسی میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ کسی کو فرار ہونے کے لیے پندرہ منٹ بہت ہوتے ہیں لیکن جب واپس آیا تو وہ اپنی جگہ موجود تھی۔ اس نے قریب آکر دیکھا اس کا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا ہوا تھا۔ گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی اور وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

جانی نے ناشتے کو ڈیش بورڈ کے اوپر رکھا پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر بڑی آہستگی سے دروازے کو بند کیا اور گاڑی کو دھیرے دھیرے اسٹارٹ کرنے لگا۔ خواہ گاڑی کتنی ہی آہستگی سے اسٹارٹ کی جائے۔ انجن کے چلنے کا شور تو ہوتا ہی ہے لیکن اس شور کے باوجود وہ سوتی رہی۔ وہ دھیرے دھیرے ڈرائیو کرتا ہوا گھر کی طرف جانے لگا۔

تقریباً چھ دنوں سے وہ پوری نیند کے لیے ترس رہی تھی۔ حالات عجیب موڑ پر لے آتے ہیں۔ جس دشمن سے وہ ڈرتی تھی۔ اب اسی کے سائے میں سو رہی تھی۔ وہ گاڑی کو اپنے مکان کے احاطے میں لے آیا۔ اب سوچنے لگا' اسے جگایا جائے یا نہیں۔ اس نے جگانے سے پہلے اس کے چہرے کو دیکھا۔ خوابیدہ چہرے پر تھکن' ایسی معصومیت اور مظلومیت تھی کہ اسے جگانے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

مکان کے احاطے کی چار دیواری اونچی تھی۔ باہر سے کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے ٹیکسی کے اگلے دونوں دروازے آہستگی سے کھول دیے تاکہ اسے ٹھنڈی ہوا لگتی رہے۔ وہ پوری بھاجی کا پیکٹ اٹھا کر مکان کے اندر چلا گیا۔ وہاں اس نے پہلے شیو کیا۔ پھر غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد لباس تبدیل کر کے ناشتا کیا۔ اس کے لیے چار پوریاں بچا کر رکھیں پھر پانی پینے کے بعد باہر آیا۔ ٹیکسی کے پاس پہنچ کر دیکھا وہ اس طرح بے سدھ ہو کر ساری دنیا سے غافل اور اپنے آپ سے بھی بے خبر سو رہی تھی۔

وہ اسے ایک ٹک دیکھنے لگا۔ اس نے آج تک ایسا خوابیدہ حسن نہیں دیکھا تھا رخسانہ کو دیکھا تھا۔ بے شک وہ بہت ہی حسین تھی لیکن آدھی تھی۔ آدھا چہرہ تھا آدھا حسن تھا۔ وہ جو ایک مکمل حسن کی طلب ہوتی ہے وہ نہیں تھی۔ رخسانہ کے ساتھ سوتے جاگتے یوں لگتا تھا جیسے وہ خواب دیکھتا ہو اور خواب کی ادھوری تعبیر ملتی ہو۔ اس وقت فرزانہ مکمل تعبیر بن کر اس کی نگاہوں کے سامنے آ گئی تھی۔

وہ اسے دیکھتے دیکھتے آہستگی سے اسٹیئرنگ کے پاس نیچے بیٹھ گیا۔ سیٹ پر بیٹھنے سے اس بات کا ڈر تھا کہ اس کی نیند ٹوٹ جائے گی۔ اس وقت یہی اچھا لگ رہا تھا کہ وہ سوتی رہے اور وہ دیکھتا رہے پھر وہ جانے کتنی دیر تک دیکھتا رہا۔ احاطے کے باہر اسے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ وہ اس سے ملنے آیا تھا۔

جانی جلدی سے اٹھ گیا کہ وہ ادھر نہ چلا آئے۔ تیزی سے چلتا ہوا احاطے کے گیٹ کے پاس گیا پھر اس نے پوچھا "تم اس وقت یہاں کیسے آ گئے؟"

"میری گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا ہے' میں نے سوچا تمہارے پاس ہو تو لے لوں۔"

"میرے پاس نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے گاڑی بند رکھی ہے وہ دیکھو وہاں کھڑی ہوئی ہے چلو میں تمہیں دوسری جگہ سے دلوا دوں گا۔"

وہ اسے باتوں میں لگا کر وہاں سے لے گیا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ اس کے ساتھ گھر سے دور چلا آیا تھا کیونکہ اسی وقت اس کے سسر فرید احمد ناگن چورنگی کے اسٹاپ سے چلے آ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی جانی نے گھور کر پوچھا "آپ ادھر کیوں آئے ہیں؟ میں نے آپ دونوں کو منع کیا تھا۔"

وہ جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالتے ہوئے بولے "مجھے یاد ہے' تم

نے کہا تھا کہ ہم تمہارے گھر کی طرف نہ آئیں لیکن یہ رخسانہ کا خط آیا ہے۔"

اس نے خط کو چھیننے کے انداز میں لیتے ہوئے کہا "میں کل سے آپ کے یہاں نہیں گیا' آج آجاتا۔ اتنی جلدی کیا تھی۔ میں وہاں آکر خط لے سکتا تھا۔ آئندہ کسی بھی بہانے میرے گھر کی طرف نہ آئیں ورنہ میں کامی کو لے کر کہیں دور چلا جاؤں گا۔"

وہ پریشان ہو کر انکار میں سرہلاتے ہوئے بولے "بیٹے میری بیگم سے ایک غلطی ہو گئی ہے میں نے تو کوئی جادو نہیں کیا۔ میں تو تمہارے پاس آسکتا ہوں۔"

"جی نہیں۔ جب آپ اپنی بیوی کو اپنے کنٹرول میں نہیں رکھ سکتے ہیں تو کسی دن اس کے بہکانے پر آپ بھی مجھ پر جادو کر سکتے ہیں۔ مجھ سے بحث نہ کریں واپس چلے جائیں۔"

انہوں نے بے بسی سے جانی کو دیکھا پھر واپس گھوم کر جانے لگے۔ جانی نے سڑک کے دوسری طرف دیکھا۔ اس کا ٹیکسی ڈرائیور دوست دوسری ٹیکسی والے کو روک کر پٹرول حاصل کر رہا تھا۔ وہ ان کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ دونوں ٹیکسیاں وہاں سے چلی گئیں تب وہ مطمئن ہو کر اپنے مکان کے احاطے میں آیا۔ فرزانہ اسی طرح سو رہی تھی۔

وہ اپنے برآمدے کے زینے پر بیٹھ گیا۔ لفافے کو چاک کر کے اس میں سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا پھر اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ رخسانہ کا خط بڑا ہی خوش خط تھا' اس نے لکھا تھا۔

"میرے سر کے تاج! میرے آسمان! میں لندن پہنچ گئی ہوں۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں۔ میں یہاں کے ایک فلیٹ میں تنہا ہوں۔ انکل کسی کام سے لندن سے باہر گئے ہیں۔ میں تنہائی میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ تم اور کامی بڑی شدت سے یاد آرہے ہو۔ میرے پاس تم لوگوں کی یادوں کے سوا اور ہے بھی کیا۔ لندن رنگا رنگ دلچسپیوں کا مرکز ہے لیکن تمہارے اور کامی کے بغیر یوں لگتا ہے جیسے میں اجاڑ بیابان میں آگئی ہوں اور جب تک میرا چہرہ مکمل نہیں ہو گا میں اس بیابان میں تنہا بھٹکتی رہوں گی۔

جانی! اتنی دور آنے کو تو آگئی ہوں مگر دل تمہاری طرف اٹکا ہوا ہے۔ سوچتی رہتی ہوں پھر ڈرتی رہتی ہوں۔ جانے کب تم اس سے مل بیٹھو' پھر میرا کیا ہو گا جانی! میں تو تمہیں روکنے ٹوکنے کے لیے نہیں آسکوں گی۔ میرا خدا ہی تمہیں دیکھتا رہے گا۔ کہیں ایسا

تو نہیں کہ میں ادھر آئی ہوں اور ادھر تم نے اسے ڈھونڈ نکالا ہو۔"

جانی نے پڑھتے پڑھتے سر گھما کر دیکھا۔ ٹیکسی مکان کی دیوار کے سائے میں تھی اس لیے برآمدے سے نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ پھر سر جھکا کر پڑھنے لگا' لکھا تھا۔

"دیکھو جانی! اگر تم اس سے مل رہے ہو تو مجھ سے نہ چھپانا یہ مجھ پر بڑا ظلم ہو گا۔ میں اپنی محبت آدھی تمہیں دینا چاہتی ہوں۔ آدھی کامی کو دینا چاہتی ہوں۔ آدھا تمہیں یاد کرنا چاہتی ہوں' آدھا کامی کو یاد کرنا چاہتی ہوں لیکن اپنے بچے کو کیسے یاد کروں۔ میرا سارا خیال سارا وہم اور سارے اندیشے تمہاری طرف چلے جاتے ہیں۔ تمہاری ہی طرف دھیان لگا رہتا ہے۔ کیا یہ مجھ پر ظلم نہیں ہے کہ میں تمہارے سلسلے میں ڈرتی رہوں اور مجھے اپنے بچے کو یاد کرنے کا موقع تک نہ ملے۔ جانی بیوی پر تو لوگ ظلم کرتے ہی ہیں' ایک ماں پر ظلم نہیں کرنا چاہیے۔"

جانی نے دونوں ہاتھوں سے خط کو دبوچ لیا۔ اپنی آنکھیں بند کرلیں کیونکہ اندر سے ایک انسان آنکھیں کھول رہا تھا۔ جب ایسا ہوتا ہے تو ساری دنیا سے اپنی آنکھوں کو سمیٹ کر بند آنکھوں کے پیچھے چھپالیتا ہے اور ان نظروں سے اپنے اندر کے جاگنے والے انسان کو دیکھتا ہے اپنا محاسبہ کرتا ہے وہاں وہ سوچ رہا تھا کہ اس خط کا جواب کیا دے گا۔ کیا جھوٹ لکھے گا کہ فرزانہ سے ملاقات نہیں ہوئی؟

اس کے دماغ نے سمجھایا۔ جھوٹ اور سچ کی بات نہیں ہے۔ اگر میں فرزانہ سے مل بیٹھا ہوں' اس کے پیچھے ابھی تک بھاگ رہا ہوں تو اس میں میری بیوی کا کیا نقصان ہے۔ بیوی پھر بیوی ہوتی ہے' اپنے بچے کی ماں ہوتی ہے۔ گھر' بیوی اور بچہ اپنی جگہ ہے۔ باہر جو محبت حاصل ہوتی ہے وہ ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسے آدمی گھر سے باہر کھلی ہوا میں سانس لینے جا رہا ہو۔ جیسے گھر کے گلدان کو دیکھتے دیکھتے باہر تازہ بہ تازہ نو بہ نو چمن میں نکل آیا ہو۔ میں اس پھول کو گھر کے گلدان میں نہیں سجا سکتا۔ کیونکہ ایک دن وہ پھول بھی باسی ہو جائے گا لہٰذا بیوی اپنی جگہ ہے اور باہر کی رنگین خوب صورتی اور خوشبو اپنی جگہ ہے میں دونوں میں سے کسی کو کسی کا حق نہیں دوں گا اور نہ ہی کسی کا حق چھینوں گا۔

وہ پھر خط کو کھول کر پڑھنے لگا "جانی! میں کل صبح اس ڈاکٹر سے پہلی بار ملنے جاؤں گی جو میرے چہرے کو مکمل کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد میرا چہرہ بن جائے گا مگر اصل

بنانے والے تو تم ہو۔ میں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا مانگتی رہتی ہوں کہ میری واپسی تک تم بہکنے نہ پاؤ۔ کوئی تمہیں اپنے پیچھے نہ دوڑائے۔ جب میں تمہارے پاس آجاؤں گی تو اس کے بعد تمہیں سنبھال لوں گی۔ تم مجھ سے کتنے ہی بڑے سہی لیکن ایک ایسے بچے ہو جو دنیا کے میلے میں حیرت اور مسرت سے ہڑبڑا کر اپنوں کی انگلی چھوڑ کر گم ہونے لگتا ہے۔ یہ میری غلطی ہے۔ تم نے میری انگلی خوب پکڑلی تھی میں ہی چھڑا کر چلی آئی۔

جی چاہتا ہے' میں تمہیں ایسے ایسے انداز میں خط لکھوں کہ تم میری غیر موجودگی میں بہکنا بھول جاؤ۔ جانی! میری گھبراہٹ کو اور میرے اندیشوں کو سمجھو۔ خدا کے لیے اپنے وعدے پر قائم رہو۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ فرزانہ کو تلاش نہیں کرو گے۔ اس سے نہیں ملو گے اور اگر کسی مجبوری سے مل بیٹھے ہو تو تمہیں اپنی زبان کا پاس رکھتے ہوئے کبھی دوسری شادی کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔ تم میرا انتظار کرو گے۔ کیوں' کرو گے نا؟

وہ پڑھتا جارہا تھا اور اندر ہی اندر بے چین ہو رہا تھا۔ تذبذب میں گرفتار ہو رہا تھا کیا کرے کیا نہ کرے۔ فرزانہ اتنی قریب آگئی تھی کہ اب ہاتھوں میں آنے ہی والی تھی۔ ادھر دونوں ہاتھوں میں وہ کاغذ رخسانہ کے سہمے ہوئے دل کی طرح کانپ رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک برآمدے کے زینے پر بیٹھا رہا پھر اس نے خط کو تہ کرکے جیب میں رکھا۔ وہاں سے اٹھ کر ٹیکسی کے پاس آیا۔ وہ اسی طرح گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی اسے اپنا ہوش بھی نہیں تھا۔ دوپٹہ شانے سے ڈھلک کر اس کی گود میں گر پڑا تھا۔ ایک خیال آیا کہ آہستگی سے جھک کر دوپٹے کو اٹھا کر اس کے چہرے کو اور بدن کے دوسرے حصوں کو ڈھانپ دے لیکن وہ بیدار ہو سکتی تھی اسے اپنے قریب دیکھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتی تھی۔

وہ وہاں سے کمرے کے اندر آیا۔ تھوڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ سوچتا رہا کہ رخسانہ کے خط کا جواب لکھ دے لیکن خط لکھنے کے دوران فرزانہ بیدار ہو جائے گی تو کیا ہوگا؟

یہی ہوگا کہ ادھر وہ لکھنے میں مصروف رہے گا' وہ ادھر وہ اٹھ کر چپ چاپ چلی جائے گی یا پھر اس کے پاس آئے گی' پوچھے گی کہ کیا لکھ رہے ہو؟ رخسانہ کو خط لکھ رہے ہو تو کیا اسے بتا رہے ہو کہ میں اس کے گھر تک آگئی ہوں؟ اور اگر نہیں بتا رہے ہو تو اس

سے کیوں چھپا رہے ہو؟ کیا میں کوئی گناہ ہوں یا ایسی غلطی ہوں جو دنیا والوں سے اور خصوصاً اپنی بیوی سے چھپائی جاتی ہو اگر میں کوئی ایسی غلطی ہوں تو اس غلطی سے باز کیوں نہیں آجاتے؟

وہ ٹہلتا رہا۔ سوچتا رہا پھر اس نے الماری کو کھول کر رخسانہ کے خط کو کپڑوں کی تہ کے نیچے چھپا دیا اور الماری کو بند کردیا۔ رخسانہ کی وہ تحریر ایک التجا تھی۔ ایک درخواست تھی اور درخواست کسی کی بھی ہو اور درخواست کیسی ہی کیوں نہ ہو وہ متعلقہ دفاتر میں اور مصلحت پسند لوگوں کی الماری میں معاملے کو ٹالنے کے لیے بند کردی جاتی ہے۔

وہ کرسی لے کر کمرے سے نکلا اور ٹیکسی کے پاس آکر ایسی جگہ بیٹھ گیا۔ جہاں سے فرزانہ کا چہرہ نظر آتا تھا۔ جس وقت اس کی آنکھ لگی تھی اس وقت سورج مشرق کی طرف تھا اب وہ سورج سر سے گزر گیا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ تھوڑی دیر تک جس حالت میں سیٹ پر پڑی ہوئی تھی' اسی حالت میں پڑی سوچتی رہی پھر ہڑبڑا کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ دور جانی کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھا تو اپنے بدن کا ہوش آیا۔ جلدی سے دوپٹے کو اٹھا کر اپنے آپ کو ڈھانپنے لگی۔

جانی اپنی جگہ سے اٹھ کر قریب آتے ہوئے بولا "تم سو گئی تھیں۔ میں نے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔"

وہ نظریں جھکائے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت دو بجنے والے تھے۔ اس نے حیرانی سے آنکھیں اٹھا کر پوچھا "کیا میں اتنی دیر تک سوتی رہی؟ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے جگانا چاہیے تھا۔"

"میں تمہیں چھ دن سے جگا رہا ہوں کیا آج بھی سونے نہ دیتا؟"

وہ منہ پھیر کر بولی "میں گھر جاؤں گی۔"

"پہلے گھر کے اندر جاؤ۔ وہاں منہ ہاتھ دھو لو۔ کنگھی کرو۔ اپنا حلیہ درست کرو پھر یہاں گاڑی میں آکر بیٹھو میں تمہیں پہنچا دوں گا۔"

"میں تمہارے گھر کے اندر نہیں جاؤں گی۔"

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں جب تک تم گھر میں رہوں گی' میں باہر رہوں گا۔

تمہارے پیچھے نہیں آؤں گا۔ جاؤ میری بات مان لو۔ اس حالت میں تم سڑکوں سے گزرو گی اور اپنے محلے میں پہنچو گی تو لوگ کیا کہیں گے؟"

اس نے چند لمحوں تک سوچا پھر ٹیکسی سے اتر کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے مکان میں چلی گئی۔ جب واپس آئی تو منہ ہاتھ دھونے اور چوٹی کنگھی کرنے کے باعث گلاب کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ آکر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جانی نے کرسی کو کمرے کے اندر رکھا۔ تمام کمروں کے دروازوں پر تالے لگائے پھر گاڑی میں آکر بیٹھ گیا اسے اسٹارٹ کرکے ڈرائیو کرتا ہوا مکان کے احاطے سے نکل کر بولا "اب ہم کسی ریستوران میں جائیں گے۔ وہاں تم دوپہر کا کھانا کھاؤ گی' اس کے بعد تمہیں گھر پہنچاؤں گا۔"

گاڑی آگے بڑھنے لگی' فرزانہ نے کہا "میں تمہارے ساتھ کسی ریستوران میں کھانا مناسب نہیں سمجھتی خدا کے لیے مجھے گھر پہنچا دو۔"

"میں نے گھر پہنچانے سے انکار نہیں کیا ہے۔ تم بھی میری بات سے انکار نہ کرو۔"

"تم میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا بہانا کب تک تلاش کرتے رہو گے؟ کیا اسی طرح ساری زندگی گزر جائے گی؟"

"تم چاہو تو ساری زندگی بھی گزر سکتی ہے۔"

"تم سوچے سمجھے بغیر بول رہے ہو۔ یہ مت بھولو کہ رخسانہ تمہاری بیوی ہے اور میری بہت اچھی سہیلی ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے اور میں بھی جاہل نہیں ہوں۔ بے شک ہمارے مذہب میں ایک کے بعد مرد کو دوسری تیسری شادی کی اجازت ہے مگر ان شادیوں کے لیے کڑی شرائط عائد ہیں جنہیں تم پورا نہیں کر سکو گے۔"

"وہ کون سی شرائط ہیں؟"

"پہلی بات یہ کہ جس عورت سے دوسری شادی کرو گے' اس عورت کی رضامندی ضروری ہے اور میں کسی کی سوتن بننے کے لیے کسی حال میں راضی نہیں ہو سکتی۔"

"ایک بات سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

ایسی محبت نہیں کرتی جو کسی عورت کا گھر جلا دے اور ایسی محبت نہیں کرتی جو بھرا پرا گلشن اجاڑ دے اور ایسی محبت نہیں کرتی جو گلے میں ہڈی کی طرح اٹک جائے نہ نگلتے بنے نہ اگلتے بنے۔"

وہ چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا اور سوچتا رہا۔ فرزانہ نے کہا "میں نے کہا تھا ناکہ تم یہ شرائط پوری نہیں کر سکو گے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دوسری شادی کے لیے اپنی پہلی بیوی میں کوئی کھوٹ یا کمی نکالنی پڑتی ہے' کوئی مجبوری بیان کرنی پڑتی ہے۔ کیا مجبوری ہے تمہاری؟ کیا رخسانہ ایک اچھی' گھریلو' وفادار بیوی نہیں ہے؟ کیا وہ دل و جان سے نہیں چاہتی ہے؟ اس میں صرف ایک ہی کمی ہے کہ چہرہ مکمل نہیں ہے۔ جب وہ واپس آئے گی تو وہ بھی مکمل ہو چکا ہوگا۔ تم ڈھونڈتے رہ جاؤ گے اس کے اندر کوئی عیب نہیں نکال سکو گے پھر کس بنیاد پر تم دوسری شادی کرو گی؟"

"اس بنیاد پر کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"انسان صرف سانسوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ باقی دنیا کی ہر چیز کے بغیر کچھ عرصے تک جی لیتا ہے۔"

"کیا آدمی محبت کی خاطر مرتا نہیں ہے؟"

"میں نے تو سنا ہے کہ آدمی صرف نفرت سے مرتا ہے۔ وہ محبت کی خاطر زندہ رہتا ہے اور دوسروں کو بھی زندہ رکھتا ہے۔ وہ محبت ہی کیا جو کسی کو مار ڈالے۔"

جانی نے بے بسی سے کہا "بڑی مشکل ہے۔ میں تمہارے جیسا پڑھا لکھا نہیں ہوں اور تمہاری جیسی باتیں نہیں بنا سکتا۔"

وہ ایک ریستوران میں پہنچے وہاں کھانا کھاتے رہے مگر خاموش رہے۔ جانی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کس طرح اپنی طرف مائل کرے ویسے مائل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات واضح تھی کہ فرزانہ کے دل میں اس کے لیے محبت ہے۔ نہ ہوتی تو وہ اس کے ساتھ ریستوران میں کھانا نہ کھاتی۔ وہ اس کے گھر کے پاس ٹیکسی میں رات بھر سوتا رہتا تھا۔ اسے سونے نہیں دیتا تھا لیکن اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس کی خاموشی اس کا حوصلہ بڑھاتی تھی اور خاموشی کے پیچھے کیا ہے' یہ جانی خوب سمجھتا تھا۔

کھانے کے بعد پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر اورنگی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک جگہ فرزانہ نے کہا "یہاں گاڑی روک دو۔ میں بس میں جاؤں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ محلے والے مجھے تمہاری ٹیکسی سے اترتے ہوئے دیکھیں۔"

اس نے گاڑی روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر جانے لگی۔ جانی نے کہا "اب میں رات کو تمہارے گھر کے پاس نہیں آؤں گا۔ میری وجہ سے تم رات بھر جاگتی رہتی ہو۔"

اس نے مطمئن ہو کر کہا "شکریہ۔"

جانی نے کہا "میں دن کے وقت آیا کروں گا۔"

فرزانہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر زور سے دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا "تعجب ہے اتنی دیر سے سمجھا رہی ہوں پھر بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"میں آؤں گا۔ خواہ تم کتنا ہی سمجھاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا پھر گول چکر کے دوسری طرف جا کر رک گیا وہ بس اسٹاپ پر اکیلی کھڑی ہوئی تھی جب ایک بس آئی اور وہ بیٹھ کر چلی گئی تب اسے اطمینان ہوا۔ اس کے بعد وہ سواریوں کو بٹھا کر ان کی منزلوں تک پہنچانے لگا۔ رات کے گیارہ بجے تک وہ ٹیکسی چلاتا رہا۔ آخری سواری کو بٹھا کر جب وہ جیل روڈ کی طرف گیا تو اچانک اسے یاد آیا کہ ایک بار مستری چاچا کسی راستے پر اتر گئے تھے۔ اس وقت فرزانہ برقعے میں چھپی ہوئی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ مستری چاچا کسی عالم صاحب کے پاس گئے تھے اور پھر کبھی واپس نہیں آئے، وہ کہاں گئے تھے۔

جانی کو بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ وہ یہ معلوم کرنے گئے تھے کہ جو شادی جھوٹ اور فریب کے ذریعے ہوئی ہے وہ جائز ہے یا ناجائز؟

جانی کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فرزانہ نے کہا تھا۔ رخسانہ کے اندر کوئی کھوٹ نہیں، کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ وفادار ہے محبت کرنے والی بیوی ہے تم کون سا عیب یا کمی نکالو گے اس میں؟

اب یہ بات سمجھ میں آرہی تھی۔ عورت کا جھوٹ سب سے بڑا جرم ہوتا ہے اور رخسانہ نے اس سے جھوٹ کہا تھا۔ اسے فریب دے کر شریک حیات بن کر آئی تھی جانی نے گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچا "تعجب ہے مستری چچا کی وفات کے بعد میں نے اس

بات کی تحقیقات کیوں نہیں کی؟ بے شک میں رخسانہ کو دل و جان سے چاہتا ہوں، اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا لیکن حقیقت کا علم تو ہونا چاہیے۔ سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے، جائز کیا ہے ناجائز کیا ہے، اس کا علم رکھنا ضروری ہے۔"

وہ رات کے ایک بجے گھر آکر سو گیا۔ اچھی نیند آئی لیکن کچھ ایسے خواب دیکھے جو جاگنے پر یاد نہیں آئے۔ اندر سے کچھ بے چینی تھی۔ فرض کرو اگر نکاح ناجائز ہوا۔ رخسانہ کے ساتھ گزاری جانے والی زندگی بھی ناجائز ہوئی تب کیا ہوگا؟

دن کے آٹھ بج رہے تھے۔ جانی نے دانت مانجھتے اور کلی کرتے ہوئے سوچا نکاح ناجائز ہوگا تب بھی میں رخسانہ کو نہیں چھوڑوں گا۔

جب اسے چھوڑنا ہی نہیں تو پھر جائز اور ناجائز کے سلسلے میں معلومات کیوں حاصل کی جا رہی ہیں؟

"میں معلومات حاصل کروں گا۔ اگر رشتہ غلط ہوا تو میں دوسری بار نکاح پڑھاؤں گا۔"

جب ایک رشتہ ختم ہو جائے گا۔ جو بیوی ہے وہ بیوی نہیں رہے گی اور جب دوسری شادی کی نوبت آئے گی تو شادی کے لیے دو ہستیاں نگاہوں کے سامنے ہوں گی۔ ایک رخسانہ، دوسری فرزانہ، ایک وہ جو حاصل ہو چکی ہے دوسری وہ جو اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود حاصل نہ ہو سکی۔ کشش کس میں ہوگی؟ انسان فطرتاً اس کی طرف مائل ہوتا ہے جو حاصل نہیں ہوتی، جو بالکل نئی ہوتی ہے۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد جھورے پینٹر کے پاس پہنچ گیا۔ جھورے نے اسے دیکھتے ہی پوچھا "استاد! تم حوالات سے باہر ہو؟"

جانی نے ناراضی سے کہا "تم بہت ہی بزدل ہو۔ دوستی کے قابل نہیں ہو مجھے چھوڑ کر چلے آئے تھے۔"

"میں تمہارے ساتھ جیل جانا نہیں چاہتا تھا۔ کیا ہوا۔ کیا عامل بابا کا کوئی کمال دیکھا؟"

"بہت کمال دکھایا ہے، دراصل وہ جو بال میرے پاس تھے۔ وہ میری محبوبہ کے نہیں بلکہ میری ساس کے تھے۔"

"اچھا!" جھورے نے حیرانی سے کہا "جبھی تو ہم بال جلا رہے تھے تو تمہاری ساس پہنچ گئی تھی۔"

"بہرحال چھوڑو۔ میں دوسرا مشورہ لینے آیا ہوں۔"

"کیا اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے؟"

"میں وہ معلوم کرنا چاہتا ہوں جو مستری چاچا معلوم کرنا چاہتے تھے۔"

"اور مستری چاچا کیا معلوم کرنا چاہتے تھے؟"

جانی نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ جھورے نے اسے تھوڑی دیر گہری نظروں سے دیکھا پھر کہا "استاد تم تھالی کا بینگن ہو۔ کبھی بھابی کی طرف لڑھکتے ہو' کبھی فرزانہ کی طرف اب فرزانہ مل گئی ہے تو تم جائز اور ناجائز کے پھیر میں پڑ گئے ہو کسی طرح کوئی ایسی بات ڈھونڈ رہے ہو کہ تمہیں فرزانہ سے شادی کرنے کا موقع مل جائے۔"

"محبت سے کسی کو حاصل کرنا جرم نہیں ہے اپنی گھر والی کو محبت سے سمجھایا جائے کہ دوسری عورت بھی میری ضرورت ہے تو وہ کبھی نہیں مانے گی۔ ہاں اگر عالم صاحب نے یہ فتویٰ دے دیا کہ نکاح جائز نہیں تھا تو میں تمہارے سامنے بھی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ رخسانہ کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس سے دوسری بار نکاح پڑھاؤں گا لیکن اس وقت رخسانہ میری احسان مند ہوگی۔ دوبارہ میرے نکاح میں آنے کے لیے وہ فرزانہ کو برداشت کرلے گی۔ میں دونوں کو برابر برابر چاہتا ہوں' دونوں سے برابر انصاف کروں گا مگر رخسانہ بیوی بن کر ایسا انصاف پسند نہیں کرے گی۔ جب بیوی کے رشتے سے خارج ہوجائے گی تو سب کچھ قبول کرلے گی۔"

جھورے نے قائل ہو کر کہا "درست کہتے ہو تمہاری بھی مجبوری سے دونوں ہی تمہارے لیے ضروری ہیں تو ہیرا پھیری بھی ضروری ہوگئی ہے۔"

"اب بتاؤ' کیا کسی عالم کو جانتے ہو؟"

"ہاں! ادھر بنوری ٹاؤن کے پاس ایک مسجد ہے جہاں بہت سے عالم فتویٰ دیتے ہیں۔"

"تو پھر چلو۔ وہیں چلتے ہیں۔"

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر بنوری ٹاؤن کی مسجد کے سامنے پہنچ گئے۔ ٹیکسی کو لاک کرنے

کے بعد وہ دونوں مسجد کے اندر پہنچے۔ وہاں بہت سے بچے' جوان اور بوڑھے دور دور تک مصروف نظر آئے۔ کچھ لوگ کلام پاک کے مختلف سپارے کھول کر انہیں پڑھ رہے تھے۔ کچھ لوگ آپس میں بیٹھ کر کسی دینی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ جھورے نے ایک مولوی صاحب سے کہا "جناب! ہم ایک مسئلے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"

اس مولوی نے ایک بڑے سے ہال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہاں تشریف لے جائیں آپ کو تمام معلومات حاصل ہوجائیں گی۔"

وہ دونوں اس ہال میں پہنچے۔ ہال کے دروازے پر دارالافتاء لکھا ہوا تھا۔ وہ اندر گئے۔ اس ہال میں چاروں طرف کتنے ہی عالم دین بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے شاید اپنے اپنے مسئلے پر کچھ باتیں کر رہے تھے وہ دونوں ایک عالم صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ جانی نے کہا "جناب عالی! ہمارا ایک مسئلہ ہے۔"

عالم صاحب نے ایک کاغذ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "جو بھی مسئلہ ہے اسے تفصیل کے ساتھ اس کاغذ پر لکھ دیں۔"

وہ دونوں کاغذ اور قلم لے کر ہال سے باہر آئے اور ایک جگہ بیٹھ گئے۔ جانی نے پوچھا "کیا لکھا جائے؟"

"وہی لکھو جو تم چاہتے ہو۔"

"یار! میں چاہتا ہوں کہ رخسانہ کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔"

وہ دونوں سوچنے لگے' پھر جانی نے لکھنا شروع کیا "محترم! مسئلہ یہ ہے کہ ایک لڑکی جس کا چہرہ تیزاب سے بگڑ گیا ہے' اس کے لیے کوئی رشتہ نہیں آتا تھا پھر اس لڑکی رخسانہ کو ہسٹیریا کا مرض لاحق ہوگیا۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ رخسانہ کی شادی کردی جائے مرض جاتا رہے گا۔ لہٰذا جب کوئی رشتہ نہیں آیا اور رخسانہ اس مرض کے حملوں سے ہوش و حواس کھونے لگی تو اس کے والدین نے جھوٹ اور فریب سے کام لیا۔ ایک لڑکے کو کسی قبول صورت لڑکی کی شکل دکھائی اور رخسانہ سے نکاح پڑھا دیا۔"

اتنا لکھنے کے بعد جانی نے جھورے سے پوچھا "یار پڑھ لو۔ رخسانہ کے خلاف تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں اسے مظلوم ظاہر کر رہا ہوں نا؟"

جھورے نے اسے پڑھنے کے بعد کہا "ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ آگے لکھو۔"

وہ لکھنے لگا "اس واقعے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ لڑکا شرابی ہے سہاگ کی پہلی رات کو اس نے یہ تو سمجھا کہ لڑکی بدل گئی ہے لیکن نشے کی حالت میں اس نے ازدواجی وظیفہ ادا کیا۔ دوسری صبح اس نے ہوش میں آکر اس نکاح پر اعتراض کیا۔

لڑکے نے ایک اور حماقت کی۔ نکاح سے پہلے دلہن رخسانہ کے نام اپنا مکان لکھ دیا۔ مہر کی رقم پچاس ہزار روپے منظور کرلی۔ اب وہ نکاح پر اعتراض کرنے کے باوجود رخسانہ کو طلاق دینے کی جرات نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ایک تو وہ بے گھر ہوجائے گا۔ دوسرے مہر کی رقم ادا نہیں کرسکے گا۔ ایسی ہی الجھنوں میں وہ لڑکا اور رخسانہ ایک بچے کے والدین بن گئے اور اب وہ لڑکا اپنی بیوی رخسانہ اور بچے کے ساتھ راضی خوشی زندگی گزار رہا ہے۔"

جھورے نے اسے پڑھتے ہوئے پوچھا "جب تم نے یہ لکھ ہی دیا ہے کہ راضی خوشی زندگی گزار رہے ہو تو پھر عالم دین سے کیا پوچھنے آئے ہو؟"

"بھئی میں آگے لکھ رہا ہوں، ذرا پڑھتے جاؤ۔"

پھر وہ لکھنے لگا "جناب عالی! سوالات یہ ہیں کہ لڑکے کو دھوکا دے کر جو نکاح پڑھایا گیا ہے کیا وہ جائز ہے؟ نکاح پڑھانے کے وقت رخسانہ کا نام اور ولدیت صحیح لکھائی گئی تھی۔

لڑکے سے جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے والے تین افراد ہیں دلہن رخسانہ اور اس کے ماں باپ۔ ان کا محاسبہ کیسے کیا جائے؟

کیا شریعت کی آڑ میں ایسے جھوٹ اور فریب کو برداشت کیا جاسکتا ہے؟

لڑکا اب دلہن رخسانہ سے راضی خوشی ہے اس کے باوجود کیا لڑکے کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اس نکاح کو فسخ کردے؟

اس مسئلے کا حل ہم یوں چاہتے ہیں کہ اب رخسانہ اور بچے کی زندگی برباد نہ ہو۔ رخسانہ کو معافی مل جائے اور وہ ازدواجی زندگی گزارتی رہے اور ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ جھوٹ بولنے والوں کو اور فریب دینے والوں کو سزا ملے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔"

اتنا لکھنے کے بعد انہوں نے وہ کاغذ مولوی صاحب کے حوالے کردیا پھر مسجد سے باہر آگئے۔ جانی نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا "کیوں جھورے! میں نے ٹھیک لکھا ہے نا؟"

"ہاں، بالکل ٹھیک۔"

"میں نے کہیں رخسانہ کو الزام تو نہیں دیا؟"

"ہاں، نہیں دیا۔"

"میں تو رخسانہ کی بھلائی کے لیے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔"

"ہاں ہمارا فرض ہے۔"

اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔ بیشک فرض ادا کرنا چاہیے اور جو حقیقت ہے، اس کا علم رکھنا چاہیے لیکن حقیقت کا علم رکھنے کے پیچھے نیت کیا تھی؟ نیت یہ تھی کہ رخسانہ کی گردن پر چھری چلانے کا کوئی موقع ہاتھ آجائے۔ جب موقع مل جائے گا تو وہ اس کی گردن سے چھری ہٹا کر اسے نئی زندگی دے گا پھر اس کے صلے میں چاہے گا کہ دوبارہ اس کے نکاح میں آنے سے پہلے وہ اسے ایک اور شادی کی اجازت دے دے۔ بات محض علم اور آگہی کی نہیں، نیت کی بھی ہوتی ہے۔

○☆○
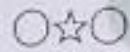
رخسانہ اسپتال کے ایک بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ پٹیوں سے چھپا ہوا تھا۔ آنکھیں کھولنے کے لیے تھوڑی سی جگہ رکھی گئی تھی۔ کھانے کے لیے منہ اور سانس لینے کے لیے نتھنے کھلے ہوئے تھے۔ حلق کے پاس جہاں ایک دو جگہ تیزاب کے چھینٹے پڑے تھے وہ ابھی نظر آرہے تھے۔ وہاں پلاسٹک سرجری نہیں ہوئی تھی ویسے وہ سرجری کے سب سے بڑے مرحلے سے گزر چکی تھی۔ ابھی چند چھوٹے چھوٹے مراحل باقی تھے۔

ڈاکٹر لوکیس مارکو نے آپریشن تھیٹر میں کہا تھا "بے بی! یو آر لکی۔ میرے پاس جتنے بھی کیس آتے ہیں، میں دو چار ماہ تک صرف ان کے چہرے کی اسٹڈی کرتا رہتا ہوں اور ابتدائی تیاریوں میں وقت صرف کرتا ہوں۔ تم پہلی لڑکی ہو جو ایک مہینے کے بعد ہی آپریشن کے مرحلے سے گزر رہی ہو۔ یہ محض اس لیے کہ تم پاکستان میں رہ کر میرے ابتدائی طریق کار کے مطابق عمل کرتی رہی تھیں اور اپنی تصویروں اور دیگر میڈیکل رپورٹ کے ذریعے میری مدد کرتی رہی تھیں۔"

بہرحال وہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کررہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ایک ہفتے کے بعد اسے اسپتال سے چھٹی مل جائے گی لیکن چہرے کی پٹیاں اسی طرح رہیں گی۔ رفتہ رفتہ

وہ پٹیاں ہٹائی جائیں گی۔ چہرے کی اسٹڈی کی جائے گی یعنی چہرہ ایک ہی وقت میں پٹیوں سے آزاد نہیں ہوگا۔ اس کے لیے کافی عرصہ لگے گا پھر یہ کہ ٹھوڑی کے نیچے حلق کے پاس اور کان کے آس پاس بھی سرجری لازمی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس سلسلے میں ابھی اسے سات آٹھ ماہ تک لندن میں رہنا تھا۔

وہ بستر پر لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی۔ اللہ بڑا کارساز ہے اور ایک سہارا چھوٹ جاتا ہے تو دس سہارے بنا دیتا ہے' وہ اس وقت کی بات سوچ رہی تھی جب سید باقر علی کے ساتھ اسپتال سے نکل کر اپنے سامان سمیت ایک زنانہ سینٹر میں گئی تھی وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ ایک پاکستانی خاتون سلمیٰ قادر کا ذاتی اسپتال ہے اور اس خاتون کو ایک ایسی لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے جس کا تعلق ایشیا کے کسی ملک سے ہو۔

یہ سنتے ہی باقر علی نے مسکراتے ہوئے کہا "چلو بیٹے! میں تمہیں سلمیٰ قادر کے اسپتال تک ابھی پہنچا دوں۔"

وہ اسے اپنے ساتھ لے کر سلمیٰ قادر کے یہاں پہنچے۔ وہ انہی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں لیکن انجان بنی ہوئی تھیں۔ باقر علی نے اپنا اور رخسانہ کا تعارف کرایا پھر اپنی ضرورت کا اظہار کیا وہ اسی وقت رخسانہ کا انٹرویو لینے لگیں۔ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے' اس کے تمام سرٹیفکیٹ اور ضروری کاغذات دیکھنے کے بعد مطمئن ہو کر بولیں "مجھے تمہاری ہی جیسی لڑکی کی ضرورت تھی۔ میں تمہیں پچیس پاؤنڈ فی ہفتہ دے سکتی ہوں۔ تمہاری رہائش کے لیے یہاں ایک کمرا بھی مل سکتا ہے' کھانے کا انتظام بھی ہو جائے گا اور ڈیوٹی کے اوقات یوں مقرر کر دیے جائیں گے کہ تمہاری پلاسٹک سرجری میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔"

رخسانہ خوشی سے رونے لگی تھی اور ان کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ سلمیٰ قادر نے اس کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "تم میری بیٹی جیسی ہو۔ میں یہاں کی ایک میڈیکل ایسوسی ایشن سے تمہارے لیے مالی امداد حاصل کروں گی جس کی نصف رقم تمہیں واپس نہیں کرنی پڑے گی باقی آدھی رقم تم قسطوں میں ادا کر سکتی ہو۔"

رخسانہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ وہ چشم زدن میں خود کو مکمل دیکھتے ہوئے جانی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ تو پہلے ہی اس کا اسیر تھا۔ اب اس کے حسن سے اور زیادہ

سور ہو رہا تھا۔ رخسانہ نے خوشی سے باقر علی کا ہاتھ تھام کر کہا "پاپا! دیکھیے اللہ تعالیٰ کس طرح سہارے پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کو حوصلہ رکھنا چاہیے اور اپنی مدد آپ کے طور پر کسی بھی مرحلے سے گزرنا چاہیے۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھپتھپا کر کہا "ہاں بیٹے! تمہارے حوصلے بلند ہیں۔ میری دعا ہے کہ تم کامیاب ہو کر یہاں سے واپس جاؤ' اچھا میں چلتا ہوں۔"

وہ اس سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد پھر کبھی اس سے ملنے نہیں آئے۔ وہ اسپتال کے مقررہ اوقات میں ڈیوٹی انجام دیتی تھی پھر اپنی پلاسٹک سرجری کے سلسلے میں اسپتال جایا کرتی تھی۔ نئی رہائش گاہ میں پہنچتے ہی اس نے اپنی امی کو اور جانی کو خط لکھ دیا تھا۔ سلمیٰ قادر کا پتا اور اس کا پوسٹ بکس نمبر بھی لکھ دیا تھا تاکہ وہ لوگ آئندہ اس پتے پر خط لکھیں۔

وہ اپنے والدین کو خصوصاً جانی کو اپنا دکھڑا سنا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا جب واپس جائے گی تو روبرو تمام باتیں تفصیل سے بتائے گی۔ فی الحال خط کے ذریعے پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ دوسری طرف جانی اور اس کی ساس نے بھی اپنے آپس کے جھگڑوں کا ذکر خط میں نہیں کیا۔

جس ادارے سے اسے مالی امداد ملنا تھی وہاں ابھی کاغذی کارروائیاں جاری تھیں۔ امید تھی کہ امداد مل سکتی ہے۔ فی الحال وہ اپنے پلے سے رقم خرچ کر رہی تھی۔ اسی دوران ڈاکٹر لوکیس مارکو نے کہا۔

"بے بی! تم نے مجھ سے ملازمت کے سلسلے میں کچھ کہا تھا۔ تم پلاسٹک سرجری کے اخراجات اپنی ملازمت کے ذریعے پورے کرنا چاہتی ہو۔ کیوں یہی بات ہے نا؟"

"یس ڈاکٹر! میں رقم کے سلسلے میں کچھ پریشان ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں پردیس میں ہوں۔"

"مجھے تمہاری پریشانیوں کا احساس ہے میرے پاس اشتہاری کمپنیوں کے لیے ایجنٹ آتے ہیں انہیں نئے چہروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاسمیٹکس بنانے والی کمپنیاں خصوصاً مجھ سے رابطہ قائم کرتی ہیں۔ تم جانتی ہو کہ نئے چہرے تو وہی ہوتے ہیں جو پہلی بار جنم لیتے ہیں لیکن وہ بچے ہوتے ہیں اور ان کمپنیوں کو جوان مردوں یا جوان عورتوں کی

ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت صرف میرے ذریعے پوری ہو سکتی ہے کیونکہ میں کسی کی جوان العمری میں اس کا چہرہ نیا بنا دیتا ہوں۔ جیسا کہ تمہارا چہرہ بن رہا ہے۔ کیا تم ماڈل گرل بننا پسند کرو گی؟"

رخسانہ نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے کہا "یہ ہمارے ہاں برا سمجھا جاتا ہے اگرچہ ماڈل بننے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے مگر ہمارے یہاں کا ماحول اور سوسائٹی عجیب ہے۔"

"میں تمہارے ہاں کی سوسائٹی کے متعلق زیادہ نہیں جانتا۔ میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ معاوضے کے طور پر بہت بڑی رقم دیتے ہیں اتنی رقم کہ تمہاری پلاسٹک سرجری کے اخراجات بھی پورے ہو جائیں گے۔ تم یہاں سے دنیا جہاں کی شاپنگ کر کے جاسکو گی اور اپنے ساتھ کچھ رقم بھی لے جاسکو گی۔"

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بیٹھے بٹھائے آمدنی کی صورت نکل آئے گی لیکن جانی کی طرف سے ڈر تھا۔ وہ شاید اس کام کو پسند نہ کرتا۔ اس نے پوچھا "ڈاکٹر! آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اشتہاری کمپنی والے مجھے ماڈل کے لیے پسند کریں گے؟"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "میں نے تمہارے تمام گراف اسکیچ اور وہ تصاویر دکھائی ہیں جنھیں میں نے اپنے طور پر فوٹوگراف کیا ہے۔ وہ لوگ تصویر دیکھ کر تمہارے حسن سے بے حد متاثر ہیں اور تمہیں بڑی سے بڑی قیمت دے کر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ انہیں کاسمیٹکس کے لیے مشرقی لڑکی کی ضرورت ہے جو پاکستانی یا انڈین لباس پہنتی ہو۔ یہ لوگ اپنے آئیٹمز کو مشرقی ممالک میں پہنچانا چاہتے ہیں۔"

"وہ مجھے زیادہ سے زیادہ کتنا معاوضہ دیں گے؟"

"یہ میں کہہ نہیں سکتا۔ تم ان سے ملاقات کرنا چاہو تو اپنا پتا اور ملاقات کا وقت نوٹ کرا دو۔ میں انہیں اطلاع دے دوں گا۔ وہ تمہارے پاس آکر معاملات طے کر لیں گے۔"

دوسرے دن صبح اس کی رہائش گاہ پر چار افراد ملنے آئے ان میں ایک انگریز عورت اور دو انگریز مرد تھے۔ چوتھا ایک پاکستانی شخص تھا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "مجھے حسن مراد کہتے ہیں' یہ مسز ہاک اور یہ مسٹر ڈیوڈ ہاک اور یہ مسٹر رچرڈ ہیں۔"

رخسانہ نے صرف مسز ہاک سے مصافحہ کیا۔ باقی تعارف کے دوران وہ اپنے سر پر آنچل سنبھالتی ہوئی اک ادائے ناز سے ان لوگوں کو آداب عرض کرتی رہی۔ مسٹر ڈیوڈ ہاک نے خوش ہو کر کہا "کیا خوب انداز ہے۔ ہمیں ایسی ہی مشرقیت کی ضرورت ہے۔"

رخسانہ نے سب کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ ان کے بیٹھتے ہی سلمیٰ قادر نے کافی کی پیالیاں بھجوا دیں۔ وہ رخسانہ کا بہت خیال رکھتی تھیں اور یہ جانتی تھیں کہ کچھ لوگ اشتہاری معاملات میں رخسانہ سے بات کرنے آرہے ہیں۔ حسن مراد نے رخسانہ سے کہا "آپ بہت ہی خوش قسمت ہیں کہ لندن کی اتنی بڑی کاسمیٹکس کمپنی آپ میں دلچسپی لے رہی ہے اور آپ کو ماڈل کے طور پر پیش کرنا چاہتی ہے ورنہ یہاں ایک سے ایک حسین لڑکیاں پڑی ہیں۔"

رخسانہ نے مسکرا کر کہا "آپ میری خوش قسمتی کی بات نہ کریں۔ اگر میں اتنی خوش قسمت ہوں تو آپ لوگ اس کمپنی سے کہیے کہ وہ میرے موجودہ چہرے کی ماڈلنگ کریں۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ حسن مراد نے جھینپ کر کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ آئندہ آپ خوب صورت بننے والی ہیں۔ اس کی ماڈلنگ کی جائے گی۔ اس وقت آپ خوش قسمت ہوں گی۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کمپنی کو میری خوش قسمتی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صرف میرے اس چہرے سے تعلق ہے جو ابھی بننے والا ہے۔"

"ہاں بات تو ایک ہی ہوئی۔"

"بات ایک کہاں ہوئی۔ آپ لندن کی ایک بہت بڑی کاسمیٹکس کمپنی سے مجھے مرعوب کرنے کے لیے خوش قسمت کہہ رہے ہیں اور میں عرض کر رہی ہوں کہ میں خوش فہمی میں مبتلا ہونے والی عورت نہیں ہوں۔"

حسن مراد نے اردو زبان میں کہا "بہتر ہے ہم اپنی زبان میں کچھ اہم باتیں کر لیں۔"

رخسانہ نے پوچھا "وہ اہم باتیں کیا ہیں؟"

"یہی' اس ماڈلنگ کے سلسلے میں۔"

"مجھے یہ تو معلوم ہو کہ آپ کا اس کمپنی سے کیا تعلق ہے؟"

"میں ماڈل تلاش کرتا ہوں اور کمپنیوں سے ان کا رابطہ قائم کراتا ہوں۔"

"آپ ایک درمیانی آدمی ہیں۔ جب کہ کمپنی کے لوگ براہ راست میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، تو کیوں نہ میں ان سے ہی بات کروں؟"

حسن مراد نے کہا "دیکھیے، آپ کی ذہانت کا تو میں قائل ہوگیا ہوں لیکن میں آپ کو تھوڑی سی ذہانت اور دے دوں اور وہ یہ کہ ہم ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں۔ جو بھلائی میں آپ کے لیے کرسکوں گا۔ وہ پرائے دیس کے لوگ نہیں کرسکیں گے۔"

"چلیں اچھی بات ہے کہ آپ میری بھلائی کرنا چاہتے ہیں۔ فرمائیے۔"

"آپ ہزاروں میل دور تنہا آئی ہیں۔ یہاں آپ کے اخراجات بہت زیادہ ہیں میں نے ڈاکٹر سے معلوم کیا ہے۔ آپ کی پلاسٹک سرجری کے سلسلے میں کم از کم پاکستانی ایک لاکھ خرچ ہوں گے۔ یعنی آپ کو یہاں ساڑھے پانچ یا چھ ہزار پاؤنڈ کی ضرورت ہے۔ میں چھ ہزار پاؤنڈ میں آپ کا معاہدہ کرادوں گا۔ میرا کمیشن بعد میں طے ہو جائے گا۔"

"بعد میں کیوں؟ ابھی طے کرلیں۔ میں پوری طرح اس معاملے کو سمجھنا چاہتی ہوں۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے بولا "یہ ہماری آپس کی بات ہے، آپ میری ہم وطن ہیں۔"

وہ بولی "آپ مجھے ہم وطن نہ کہیں۔ اگر کہتے ہیں تو آپ کو مجھ سے ایک پنس بھی نہیں لینا چاہیے بلکہ مزید امداد پہنچانا چاہیے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں بھی لندن میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے اپنے بھی اخراجات ہیں۔ میں کچھ اسی طرح کماتا ہوں۔"

"بے شک آپ کماتے ہوں گے لیکن میرا آپ کا تعلق کیا ہے۔ میں آپ کو اپنے درمیان کیوں لاؤں۔ آپ کا کمیشن خواہ ایک پنس بنتا ہوں یا ایک ہزار پاؤنڈ بنتا ہو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے معاملات میں آپ کی ضرورت کیا ہے؟"

وہ فخریہ انداز میں مسکرا کر بولا "میرے بغیر یہ معاملات طے نہیں ہوسکیں گے۔"

"ٹھیک ہے آپ اپنے لوگوں کو یہاں سے لے جائیں۔"

وہ پریشان ہو کر بولا "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا آپ چھ ہزار پاؤنڈ جیسی رقم چھوڑ

دیں گی جب کہ آپ کو یہاں قدم قدم پر ایک ایک پنس کی ضرورت ہے۔"

"میں اپنی ضرورت کو خوب سمجھتی ہوں۔ میں نے ڈاکٹر لوئیس مارکو سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں ماڈلنگ میں دلچسپی نہیں رکھتی ہوں۔"

پھر اس نے اپنے انگریز مہمانوں کی طرف منہ کرکے کہا "مسز ہاک! مجھے افسوس ہے کہ یہ حسن مراد صاحب جو معاملات طے کرنا چاہتے ہیں میں ان سے بالکل متفق نہیں ہوں اور میں یہ بات آگے نہیں بڑھانا چاہتی۔"

مسز ہاک اور دوسرے مہمانوں نے تعجب سے حسن مراد کی طرف دیکھا۔ حسن مراد بوکھلا گیا، جلدی سے بولا "یہ مس رخسانہ کچھ ناراض ہوگئی ہیں۔ ابھی انہیں منالیتا ہوں۔"

مسز ہاک نے کہا "آپ اپنی زبان میں کیوں منا رہے ہیں۔ انگریزی میں گفتگو کیوں نہیں کرتے؟ ہم سب معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ باتیں کیا ہو رہی ہیں؟"

رخسانہ نے کہا "آپ درست کہتی ہیں ہمیں اسی زبان میں گفتگو کرنی چاہیے۔"

مسٹر رچرڈ نے کہا "دراصل ہم مسٹر حسن مراد کو اس لیے لائے ہیں کہ آپ ایک پاکستانی خاتون ہیں۔ ہم نے سوچا شاید آپ ہماری زبان اچھی طرح بول نہیں سکیں گی لیکن آپ تو فرفر بول رہی ہیں۔"

مسز ہاک نے کہا "بہتر ہے کہ ہم بات شروع کریں۔ ہم آپ کو اپنے اشتہارات کے سلسلے میں انگیج کرنا چاہتے ہیں۔ انگیج منٹ کی صورت یہ ہوگی کہ ہم معاوضہ طے کرلیں گے اس کے بعد آپ ہمارے اختیار میں ہوں گی۔ ہم آپ کو کیمرے کے ذریعے جس طرح ڈسپلے کرنا چاہیں گے کریں گے۔"

رخسانہ نے انکار میں سر ہلا کر کہا "اول تو میں ابھی ماڈلنگ کے لیے راضی نہیں ہوں پہلے اپنے شوہر سے اجازت لوں گی۔ اس کے بعد ہاں کروں گی اور ہاں کرنے کے لیے چند شرائط ہوں گی۔ وہ شرائط آپ پہلے سے سن لیں۔ میں کیمرے کے سامنے کوئی ایسا لباس نہیں پہنوں گی جس سے بے حیائی ظاہر ہو اور فوٹوگراف کے لیے کوئی ایسا پوز نہیں دوں گی جس سے میں خود اپنی نظروں سے گر جاؤں۔ تیسری بات یہ کہ میرا فوٹوگراف کسی مرد کے ساتھ ہو تو میں اس کے ساتھ بیٹھ کر، کھڑے ہو کر، چلتے پھرتے تصویریں اتروالوں گی

لیکن اسے اپنی انگلی پکڑنے کی بھی اجازت نہیں دوں گی۔ آپ لوگ غور کرلیں منظور ہو تو بات آگے بڑھے گی ورنہ یہیں ختم ہو جائے گی۔"

حسن مراد نے کہا "شاید ڈاکٹر لوئیس مارکو نے آپ کو پہلے ہی یہ بتادیا ہے کہ کمپنی والے آپ کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں' اسی لیے آپ ایسی شرائط پیش کررہی ہیں۔ کچھ تو سوچیے لباس کے ذریعے مختلف پوز کے ذریعے اور ایکشن کے ذریعے اگر ماڈلنگ میں دلکشی نہ پیدا کی جائے تو ماڈلنگ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔"

"مسٹر حسن مراد! دل کشی سے آپ کی مراد کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق مغرب میں ماڈلنگ کا انداز عریانیت کی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔"

"دیکھیے مس رخسانہ!....."

"میں نے کہا ہے کہ میں اپنے شوہر سے اجازت حاصل کروں گی اس طرح سمجھ لینا چاہیے کہ میں مس نہیں مسز ہوں۔"

سوری مسز رخسانہ! جسے آپ عریانیت سمجھتی ہیں وہ نئے دور کے تقاضے ہیں' ایک آرٹ ہے۔ دقیانوسی قسم کے لوگ اسے عریانیت سمجھتے ہیں۔"

"اچھا۔ تو یہاں آنے والی پاکستانی لڑکیوں کو آپ یہی سمجھتے ہیں اور ہمارے ہم وطن بھی بنتے ہیں۔"

"دیکھیے آپ کی باتوں میں طنز ہے۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ آپ سے گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔ آپ ہمارے درمیان مداخلت نہ کریں۔ میں کمپنی کے لوگوں سے براہ راست گفتگو کررہی ہوں۔"

ڈیوڈ ہاک نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں آپ سے بات کرتا ہوں۔ ڈاکٹر لوئیس مارکو نے آپ کا فوٹو گراف دکھایا ہے اور اس بات کا یقین دلایا ہے کہ آپ فوٹو گراف سے بھی زیادہ حسین نظر آئیں گی۔ اتنا اندازہ ہمیں بھی ہو چکا ہے۔ ہم آپ کو معاوضے کے سلسلے میں مایوس نہیں کریں گے۔ آپ ہمیں مایوس نہ کریں۔ آپ کی شرائط اگرچہ سخت ہیں لیکن مشرق کی ایک آئیڈیل بیوی کو پیش کرنے کے لیے ہم نے جو اسکرپٹ تیار کیے ہیں اس کے مطابق عریانیت تو نہیں ہے لیکن ہیرو کے ساتھ فری مکسنگ ہے۔"

"میں ایسا کوئی رومانی سین نہیں کرسکتی جس میں ہیرو میرا ہاتھ پکڑے۔ میرے شوہر

نے ایسا کوئی سین دیکھ لیا تو وہ مجھ کو قتل کردیں گے اور ہیرو کو تلاش کرتے ہوئے لندن پہنچ جائیں گے پھر یہ کہ میں اس وقت تک اگری منٹ سائن نہیں کروں گی جب تک اپنے شوہر سے اجازت نہ لے لوں۔"

"یعنی آپ پاکستان خط لکھیں گی' پھر جواب آئے گا۔ اس کے بعد معاہدے پر دستخط ہوں گے اس میں تو بڑا وقت لگے گا۔"

رخسانہ نے پوچھا "اس میں وقت کا کیا سوال ہے۔ میری پلاسٹک سرجری میں کم از کم آٹھ دس مہینے لگ جائیں گے۔ آپ اتنا تو انتظار کریں گے؟"

"وہ تو ہم ضرور کریں گے لیکن جب معاہدہ ہو جائے گا تو ہم آپ کے چہرے اور قدو قامت کے مطابق اسکرپٹ میں تبدیلیاں کریں گے۔ اس کے مطابق بہت سی تیاریاں ہوں گی۔ آپ کے لباس تیار کرائے جائیں گے۔ جب تک آپ کے چہرے سے آخری پٹی نہیں ہٹائی جائے گی اس وقت تک آپ کے لیے ایسے لوگوں کو اور عورتوں کو مقرر کیا جائے گا جو آپ کو اٹھنے' بیٹھنے اور چلنے کے دل فریب انداز سکھائیں گے' آپ کے بولنے کا انداز بھی بدلا جائے گا اور بھی بہت سی ابتدائی تیاریاں ہوں گی۔"

"کچھ بھی ہو' مجھے شوہر سے اجازت لینی ہوگی۔"

"کیا آپ کے پاکستانی گھر میں ٹیلی فون ہے؟"

"میرے گھر میں نہیں ہے لیکن ایک پڑوسی کے گھر ٹیلی فون ہے اس کا نمبر مجھے یاد ہے۔"

"وہ نمبر آپ ہمیں دیں۔ ہم یہاں سے ٹرنک کال کے ذریعے آپ سے رابطہ قائم کراتے ہیں۔ آپ اپنے شوہر سے اجازت لے لیں۔"

"میرے شوہر گھر میں موجود نہیں رہتے۔ پہلے ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع دینی ہوگی۔ پھر وہ کسی وقت آئیں گے تو اس کے بعد باتیں ہوں گی۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ٹرنک کال کے جو بھی اخراجات ہوں' آپ جتنی دیر چاہیں گفتگو کریں اور جتنی بار چاہیں گفتگو کریں لیکن دو چار روز میں اس معاملے کو طے ہو جانا چاہیے اور معاہدے پر دستخط ہو جانے چاہئیں۔"

وہ بولی "آپ جلدی بولتے بھی ہیں اور جلدی معاملات بھی طے کرلینا چاہتے ہیں

معاوضے کا کیا ہو گا؟"

ہم آپ کو مڈل ایسٹ اور فار ایسٹ کے تمام معاملات میں اپنے آئیٹمز کی پبلسٹی کے لیے پیش کریں گے اس کے لیے زیادہ سے زیادہ چھ ہزار پونڈ دے سکتے ہیں۔"

رخسانہ نے حسن مراد کی طرف دیکھا اور پھر انگریزی میں کہا "شاید آپ لوگ اردو کی تھوڑی بہت گنتی جانتے ہیں' اسی لیے حسن مراد نے جو پیشکش کی وہ آپ بھی کر رہے ہیں مجھے یہ منظور نہیں ہے۔"

"آپ اپنا معاوضہ بتائیں۔"

"میں کم از کم بارہ ہزار پاؤنڈ لوں گی۔"

"مسٹر ڈیوڈ ہاک ایک گہری سانس لے کر سیدھے بیٹھ گئے پھر مسکراتے ہوئے کہا "یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"میرے لیے بہت کم ہیں۔ آپ حساب لگائیں مڈل ایسٹ اور فار ایسٹ میں کتنے ممالک ہیں۔ ہر ملک میں سیکڑوں شہر اور قصبے ہیں۔ آپ کا مال ہر جگہ میرے چہرے کی پبلسٹی کے ذریعے بکتا رہے گا۔ اگر آپ یوں حساب نہیں کرنا چاہتے تو یوں کیجیے کہ میں پاکستان سے یہاں آئی ہوں۔ میرے رہنے سہنے' کھانے پینے' گھومنے پھرنے کے اخراجات ہیں۔ اس لحاظ سے کیا بارہ ہزار پونڈ زیادہ ہیں؟"

اسی شام رخسانہ کے بتائے ہوئے فون نمبر پر ٹرنک کال بک کرائی گئی۔ اسی نمبر پر پہلے یہ پیغام ارسال کیا گیا کہ جانی کو فون پر بلایا جائے۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد دوبارہ رابطہ قائم کیا گیا۔ اس بار جانی کی آواز سنائی دی' وہ بہت خوش تھا۔ رخسانہ سے کہہ رہا تھا "مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اتنی دور سے تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ تم کیسی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں بہت مزے میں ہوں۔ تمہیں اور کامی کو یاد کرتی رہتی ہوں۔ جانی! ٹرنک کال کے ذریعے اتنی دور سے باتیں کرنے کے اخراجات بہت ہوتے ہیں۔ میں ایک کمپنی کے ذریعے تم سے باتیں کر رہی ہوں۔ اس سلسلے میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ اگر تم ناراض نہ ہو اور مجھے صحیح مشورہ تو دو میں اس پر عمل کروں گی۔"

پھر وہ اس معاہدے کے متعلق بتانے لگی۔ جانی چپ چاپ سنتا رہا پھر اس نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اجازت دینا چاہیے یا نہیں اپنی گھر والی کی تصویریں رسالوں

میں چھپیں اور فلموں میں آئیں تو اچھا نہیں لگتا ہے لیکن مجھے اچھا لگتا ہے اب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچھا کیوں لگتا ہے اور اچھا کیوں نہیں لگتا۔"

رخسانہ نے کہا "تم یہ سوچتے ہو گے کہ فلموں میں دوسرے لوگ مجھے دیکھیں گے یا میں کسی غیر مرد کے ساتھ نظروں آؤں گی شاید اسی لیے اچھا نہیں لگتا۔"

"ہاں' یہی بات ہے۔"

"اگر مجھے اجازت دو گے تو میں کسی مرد کے ساتھ فلم میں نظر تو آؤں گی لیکن اسے اپنا ہاتھ بھی نہیں پکڑنے دوں گی۔ میں سر سے پاؤں تک صرف تمہاری ہوں۔"

"پھر تو کوئی بات نہیں۔ تم شوق سے فلم میں آؤ۔ میں سینہ ٹھونک کر دوستوں کو بتاؤں گا دیکھو میری بیوی کتنی حسین ہے لیکن ذہین ہے' کتنی پڑھی لکھی ہے کیسی باتیں کرتی ہے۔ اور اس کی شہرت دور دور تک ہے۔"

رخسانہ نے خوش ہو کر کہا "جانی! تو میں سمجھوں کہ تمہاری طرف سے اجازت ہے؟"

"ابھی میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اجازت دے کر اچھا کر رہا ہوں یا غلطی کر رہا ہوں مگر اتنا جانتا ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہو' کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جس سے بعد میں مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔"

"میں بہت سوچ سمجھ کر معاہدے پر دستخط کروں گی۔ تم ذرا امی سے بات کراؤ۔ اس کے بعد میں پھر تم سے بات کروں گی' وہیں فون کے پاس رہنا۔"

چند لمحوں کے بعد اسے اپنی امی کی آواز سنائی دی۔ سلام دعا کے بعد اس نے کہا "امی مجھے میرے بیٹے کی آواز سنائیے۔"

انہوں نے کہا "بیٹا! یہ میری گود میں ہے مگر چپ ہے۔ مسکرا رہا ہے' اپنے آپ کو دیکھ رہا ہے۔"

پھر ان کی آواز ایسی آنے لگی جیسے نواسے کو بولنے پر مجبور کر رہی ہوں۔ رخسانہ نے پوچھا "امی سب خیریت تو ہے؟ آپ جانی سے لڑائی تو نہیں کرتی ہیں؟"

"کیا' میں ہی لڑائی کرتی ہوں! اتنی دور جا کر بھی مجھے الزام دے رہی ہو ویسے تم فکر نہ کرو۔ میں اور جانی بہت اچھی طرح میل ملاپ سے رہتے ہیں۔"

"امی! اس بات کا جواب ہاں یا نہیں میں دیجیے۔ کیا وہ فرزانہ سے مل رہے ہیں؟"
تھوڑی دیر تک خاموشی رہی' پھر آواز آئی "میں ہاں یا نہ میں جواب نہیں دے سکتی
میں نے آنکھوں سے دیکھا نہیں ہے تو جواب کیا دوں؟"

دوسری طرف سے رخسانہ نے جانی کی آواز سنی۔ وہ ریسیور کے پاس ہی کھڑا ہوا
تھا۔ اس کی امی سے بول رہا تھا "یہ ہاں اور نہ والی کیا بات ہے؟ آپ نے آنکھوں سے کیا
نہیں دیکھا ہے! اتنی بڑی بڑی تو آنکھیں ہیں آپ کی۔ کیا اب اپنی بیٹی سے کہیں گی کہ میں
آپ کے لیے عینک بنوا دوں۔"

"امی آپ ریسیور جانی کو دیجیے۔"

جانی نے ریسیور لے کر ہیلو کہا۔ رخسانہ نے پوچھا "تم ابھی امی سے لڑائی کر رہے
تھے؟"

تینوں وقت گھر میں کھانا کھاتا ہوں۔ تمہاری امی کی خدمت کرتا ہوں' ان کے سر
سے جوئیں نکالتا ہوں تمہیں یقین نہیں ہے تو پوچھ لو۔"

"میں کسی سے نہیں پوچھوں گی' تم سچ سچ بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟"

"کیا فرزانہ سے ملتے ہو؟"

ایک لمحے کی خاموشی رہی' پھر وہ جھجکتے ہوئے بولا "نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں کیسے
ملوں گا۔ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔ وہ کہاں رہتی ہے مجھے کیا معلوم ہے؟"

"جانی' تم کبھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولتے ہو نا۔"

"ہاں' نہیں بولتا ہوں۔"

"میری قسم کھا کر بولو۔"

"تمہاری قسم! میں فرزانہ سے نہیں ملتا ہوں۔"

"ہم دونوں کے کامران کی قسم کھا کر بولو۔"

"خواہ مخواہ قسم کھلا رہی ہو میں فرزانہ سے نہیں ملتا۔ میری بات کا یقین کر لو۔"

"نہیں جانی! کامران کی قسم کھاؤ۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "میں کامران کی قسم کھا کر بولتا ہوں کہ میں اس سے مل ہی

نہیں سکتا۔ اس کے دروازے پر تو تالا...."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ رخسانہ نے جلدی سے کہا "ہاں فرزانہ کہیں گئی ہوگی۔ گھر
میں اس کے چچا رہتے ہیں اسی لیے دروازے پر تالا پڑا ہوگا۔"

"نہیں' میں فرزانہ کی بات نہیں کر رہا تھا۔ دراصل وہ جو تالا...."

"ہاں' اب جھوٹ بولو۔ دیکھو جانی میں رو رو کر جان دے دوں گی۔ اگر تم نے اسے
پالیا ہے' اسے اپنا بنانا چاہتے ہو تو مجھے صاف صاف بتا دو۔ میں اتنی دور ہوں' اپنی جان
دے کر تمہارے لیے دوسری شادی کا راستہ ہموار کر دوں گی۔ تم پر الزام نہیں آئے گا
اور میں مر جاؤں گی۔"

"رخسانہ! ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہاری زندگی چاہتا ہوں' تمہاری خوشی میں خوش
ہوں۔ تم اتنی دور رہ کر اپنے آپ کو ذرا بھی نقصان پہنچاؤ گی تو سوچو کہ ہمارے کامران کا
کیا ہوگا؟ کیا وہ اپنی ماں کے بغیر رہے گا؟ نہیں رخسانہ! ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔ میں تمہارا
ہوں اور تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔"

"تم میرے ہو تو سچ بول دو۔"

"پہلے وعدہ کرو کہ پردیس میں اپنی حفاظت کرو گی' اپنی صحت کا خیال رکھو گی اور
ہنسی خوشی واپس آؤ گی۔ وعدہ کرو میں سچ بولوں گا تو ناراض نہیں ہو گی۔"

"میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا تو سنو' فرزانہ سے ملاقات ہو گئی ہے لیکن تین ہفتے سے اس کے دروازے پر
تالا پڑا ہوا ہے۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی ہے۔"

"کیا تم نے اسے پریشان کیا تھا؟"

پھر ایک لمحے کی خاموشی رہی' اس کے بعد بولا "نہیں۔ معلوم نہیں کیوں وہ چلی
گئی۔"

"میں جانتی ہوں وہ کیسی لڑکی ہے۔ تم سے ملنا نہیں چاہتی ہو گی اور تم اسے مجبور
کر رہے ہو گے۔"

"تم مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہو۔ وہاں بیٹھے بیٹھے ساری باتیں اندازے سے معلوم
کر لیتی ہو۔ بات اصل میں یہی ہے۔ وہ مجھ سے کترا رہی تھی۔ میں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

اس کے دروازے کے پاس چھ راتوں تک ٹیکسی میں بیٹھا رہا۔ تب وہ پریشان ہو گئی اور ایک دن مجھ سے ملاقات کی دوسرے دن غائب ہو گئی۔"

"جانی! یہ بہت بری بات ہے۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے اس نے جان بوجھ کر تمہیں دھوکا نہیں دیا ہے اگر دیا بھی ہے تو سوچو کہ یہ دھوکا کتنا خوب صورت ہے۔ اس نے ہمیں ملا دیا۔"

"ٹھیک ہے' اب میں اس کے گھر کی طرف نہیں جاؤں گا۔ اسے پریشان نہیں کروں گا۔"

"ہاں جانی! میرا انتظار کرو۔ اپنے بچے کی خاطر سوچو۔ کوئی غلط قدم اٹھاؤ گے تو ہمارے بچے کے مستقبل پر اثر پڑے گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک سمجھاتی رہی پھر اس نے کہا "ٹرنک کال پر زیادہ باتیں کرنا مناسب نہیں ہے میرے روئیں روئیں کا پیار قبول کرو اور ریسیور امی کو دے دو' میں اب ریسیور رکھنے ہی والی ہوں۔"

اس کی امی کی آواز سنائی دی تو اس نے کہا "امی! مجھے سب پتا چل گیا ہے آپ بہت سی باتیں چھپا رہی ہیں۔ فون پر باتیں کرنے کا وقت بھی نہیں ہے اور جانی بھی وہاں کھڑے ہوئے ہیں لہٰذا آپ فوراً ہی خط میں سچی سچی باتیں لکھیں۔ کوئی بات مجھ سے نہ چھپائیں۔ میرے کامی کو میرا بہت سا پیار دیں اور ابو کو میرا اسلام کہہ دیں' خدا حافظ۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ دوسرے دن معاہدے پر دستخط ہوئے۔

کمپنی والوں نے رخسانہ کی تمام شرائط منظور کر لیں۔ اپنی طرف سے یہ لکھوا لیا کہ فی الحال ایک ہزار پونڈ پیشگی دیے جا رہے ہیں۔ اگر ڈاکٹر لوئیس مارکو کی پیش گوئی کے مطابق وہ حسن کا شاہکار نہ بن سکی تو یہ معاہدہ منسوخ ہو جائے گا۔ پیشگی رقم ناقابل واپسی ہے البتہ چہرہ خاطر خواہ مکمل ہو گا تو معاہدے کی آدھی رقم ماڈلنگ سے پہلے ادا کر دی جائے گی۔ باقی آدھی رقم وہ کام کے دوران حاصل کرے گی۔ معاہدے کا انحصار چہرے کی تکمیل پر تھا۔

اور اب وہ پلاسٹک سرجری کے پہلے مرحلے سے گزر کر اسپتال کے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اس کا چہرہ ڈاکٹر لوئیس مارکو کی پیش گوئی کے مطابق مکمل ہو گا یا نہیں' یہ خدا ہی جانتا

تھا۔ ڈاکٹر کو اپنے آپ پر بڑا اعتماد تھا۔ بہرحال آنے والا وقت ہی اسے آئینہ دکھا سکتا تھا۔

ابھی وہ سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ جانی اور فرزانہ کی ملاقاتوں کا کیا کیا جائے؟

یہ تو اچھا ہی ہوا کہ ٹرنک کال پر گفتگو ہو گئی تھی اور جانی کا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔ اگرچہ اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ فرزانہ کے پیچھے نہیں جائے گا لیکن وہ یقین نہیں کر سکتی تھی وہ ہزاروں بار وعدے کر چکا تھا اور بار بار اس کے پیچھے بھاگتا رہا تھا۔ اب تو اس نے فرزانہ کا گھر بھی دیکھ لیا تھا۔

ویسے رخسانہ کو فرزانہ پر بڑا پیار آیا۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ فرزانہ تین ہفتے سے اپنے گھر کے دروازے پر تالا ڈال کر یقیناً سکھر گئی ہو گی۔ ورنہ بے چاری اور کہاں جا سکتی تھی۔ جانی اسے پریشان کر رہا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ فرزانہ بھی یہاں چلی آتی اور اسے ملازمت مل جاتی وہ سلمیٰ قادر کے ہاں جو ملازمت کر رہی تھی وہی ملازمت فرزانہ کو دے سکتی تھی' اب اسے اپنی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ ایک بڑے معاہدے پر دستخط کر چکی تھی۔

وہ سوچ میں گم تھی' اچانک جمشید کی آواز سنائی دی۔ اس نے جلدی سے اپنے اوپر چادر ڈال لی۔ سر گھما کر اس کی طرف نہیں دیکھا جمشید نے کہا "میں بہت شرمندہ ہوں۔ تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ یوں تو بہت پہلے آ جاتا لیکن پاپا نے منع کیا تھا کہہ رہے تھے کہ تم بہت غصے میں ہو مجھے تمہارے پاس نہیں جانا چاہیے۔ میں نے بہت دنوں تک برداشت کیا۔ شاید ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر رخسانہ نے آہستگی سے کہا "میں تمہیں معاف کرتی ہوں تم مجھے معاف کر دو۔ میں نے بھی تم سے جھوٹ کہا تھا۔ میرے جھوٹ کو سچ سمجھ کر تم نے مجھ سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔"

"جو کچھ ہوا' اسے ہم دونوں ہی بھول جائیں تو بہتر ہے۔"

"میں بھول چکی ہوں۔"

"میں تمہارے کام آنا چاہتا ہوں جو غلطی کی ہے اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔"

"جب ہم بھول ہی چکے ہیں تو پھر کس غلطی کی بات کر رہے ہو؟ کس بات کی تلافی کرو گے؟"

"وہ بات ختم ہو چکی ہے۔ میں نئے سرے سے تمہارے کام آنا چاہتا ہوں۔"

"شکریہ۔ اب میں کسی کی محتاج نہیں رہی۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر جمشید نے کہا "میں پاکستان جا رہا ہوں۔"

وہ چونک گئی۔ ایک دم سے اسے جانی کا اور فرزانہ کا خیال آیا۔ اس نے پوچھا

"کب جا رہے ہو؟"

"شاید اگلے ماہ جاؤں گا۔ وہاں کچھ عرصے تک رہوں گا۔"

رخسانہ نے پوچھا "تم فرزانہ کو اچھی طرح جانتے ہو؟"

"کون فرزانہ' تمہاری سہیلی؟"

"ہاں' کیا وہ خوب صورت نہیں ہے؟"

"ہاں' وہ بھی خوب صورت ہے۔"

"کیا تم اس سے شادی کرو گے؟"

اس نے چونک کر رخسانہ کو دیکھا پھر کہا "یقیناً وہ خوب صورت ہے۔ ڈاکٹر بن چکی ہوگی۔ کیا اس کی شادی نہیں ہوئی ہے؟"

"نہیں۔ میں چاہتی ہوں اس کی شادی ہو جائے یا پھر وہ پاکستان چھوڑ کر یہاں آجائے۔ اگر تم اسے اپنی طرف مائل نہ کر سکو تو کیا میری خاطر اسے یہاں ملازمت دلا سکتے ہو؟"

وہ الجھے ہوئے ذہن سے سوچنے لگا اور رخسانہ کو دیکھنے لگا' اس نے پوچھا "میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں تمہاری خاطر سب کچھ کر سکتا ہوں مگر یہ کیا بات ہوئی' تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ وہ یہاں آکر ملازمت کرے یا شادی کر لے۔"

"جمشید! ابھی تم نے کہا ہے کہ میرے کام آنا چاہتے ہو۔"

"ضرور۔ میں اسے ملازمت دلاؤں گا۔ اگر تم چاہتی ہو اور وہ راضی بھی ہو جائے تو شادی بھی کرلوں گا مگر قصہ کیا ہے؟"

"میں بعد میں بتادوں گی۔"

"رخسانہ! جب میں پاکستان جاؤں گا تو وہاں کسی نہ کسی طرح معلوم کرلوں گا۔ بہتر

ہے کہ تم ابھی بتادو۔"

رخسانہ نے سوچا۔ یہ وہاں جائے گا تو جانی اور فرزانہ کا عشق چھپا نہیں رہے گا' وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "میرا چہرہ بگڑ گیا تھا جانتے ہو میری شادی کیسے ہوئی؟"

جمشید نے انکار میں سر ہلا کر کہا "تم نے بتایا ہی نہیں تھا۔ میں یہ بھی پوچھنا چاہوں گا کہ تمہارا شوہر کون ہے۔"

رخسانہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی پوری داستان سنانے لگی۔ جمشید توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ بظاہر بہت سنجیدہ تھا مگر دل ہی دل میں خوشی سے کھل رہا تھا۔ اچھا! تو وہ ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ بڑا خوش قسمت ہے کہ فرزانہ اس پر مرتی ہے۔ بڑا خوش نصیب ہے کہ یہ بھی اس پر جان دیتی ہے۔ دو ہیروئن کا ایک ہیرو۔ ٹھیک ہے' میں پاکستان تو جا ہی رہا ہوں' دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔ میں جو کچھ بھی کر سکا' کروں گا۔ رخسانہ تمہارے لیے کروں گا۔ فرزانہ خواہ کتنی ہی حسین ہو میرا مطالبہ حسن نہیں ہے۔ میرا مطالبہ جوانی بھی نہیں ہے۔ میرا مطالبہ تم ہو۔ تم میری ضد ہو۔ میری انا کے لیے ایک چیلنج ہو۔ میں تمہیں حاصل کیے بغیر دوستوں کے درمیان سر اٹھا کر نہیں چل سکوں گا اور کتنی توہین آمیز بات ہے کہ تم مجھ پر ایک ٹیکسی ڈرائیور کو ترجیح دے رہی ہو۔ ٹھیک ہے' میں پاکستان جا رہا ہوں تمہارے لیے رخسانہ! تمہارے لیے۔

○☆○

جانی کلینک کے سامنے پہنچا تو خوش ہو گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے ٹیکسی کو سڑک کے دوسری طرف روکا پھر وہاں سے چلتا ہوا کلینک کے دروازے پر آیا۔ مریض عورتوں اور بچوں کی بھیڑ نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ فرزانہ بہت عرصے تک غائب رہی تھی۔ اس کے پاس آنے والے کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس جانے لگے تھے۔

وہ دروازے کے پاس ہی دیوار سے لگ کر سگریٹ سلگانے لگا' انتظار کرنے لگا۔

ایک عورت اپنے بچے کو لے کر کلینک سے باہر آئی۔ اس کے ہاتھ میں دوا کی شیشی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اندر سے فرزانہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کمپاؤنڈر کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہی تھی "ارشد! اور کوئی ہے تو بھیج دو۔"

"نہیں باجی کوئی نہیں ہے۔ آپ اتنے دنوں کے بعد آئی ہیں' عورتوں کو آپ کے

بارے میں معلوم نہیں ہوا ہے اب جس سے بھی ملاقات ہوگی' میں اسے بتادوں گا۔"

"ٹھیک ہے تم بھی جاؤ میں آرام کروں گی۔"

کمپاؤنڈر فوراً ہی نہیں گیا۔ شاید ڈسپنسری کی صفائی کرنے میں مصروف تھا۔ جانی کو بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ اس کے بعد دوسرا سگریٹ سلگانا پڑا۔ دوسرے سگریٹ کے ختم ہوتے ہی کمپاؤنڈر باہر نکلا پھر اس نے کہا "باجی! السلام علیکم۔"

دروازے کے پاس ہی فرزانہ کی آواز سنائی دی "وعلیکم السلام۔"

جانی نے آگے بڑھ کر کہا "میں بھی سلام کرنے آیا ہوں۔"

وہ ایک دم سے ساکت ہوگئی۔ اس نے نہ تو حیرانی کا اظہار کیا اور نہ ہی پریشانی کا۔ وہ جانتی تھی کہ سکھر سے واپس آئے گی تو جانی ضرور اس کے دروازے پر آئے گا۔

کمپاؤنڈر اسے دیکھ کر رک گیا۔ جانی نے اس کی موجودگی میں کہا "ڈاکٹر صاحبہ! میری بیوی بہت بیمار ہے' ہم مجاہد آباد میں رہتے ہیں۔ میری ٹیکسی حاضر ہے۔ آپ فوراً چلیں۔ میں آپ کو اسی ٹیکسی میں واپس پہنچادوں گا۔ آپ کی جو فیس ہوگی وہ ادا کروں گا۔"

فرزانہ نے پہلے تو کمپاؤنڈر کی طرف دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے کہا "میں باہر کسی مریضہ کو دیکھنے نہیں جاتی۔"

"ڈاکٹر صاحبہ انکار نہ کریں۔ حالات مجبور کریں تو جانا ہی پڑتا ہے۔ آپ نہیں جائیں گی تو۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر یوں دھمکی دینے کے انداز میں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "تو میں اندر چلا آؤں گا۔"

فرزانہ نے چند لمحوں تک سوچنے کے بعد کہا "اچھی بات ہے' انتظار کرو۔ میں دواؤں کا بیگ لے کر آتی ہوں۔"

وہ پلٹ کر اندر چلی گئی۔ کمپاؤنڈر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "باجی! آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کے ساتھ چلوں۔"

فرزانہ کی آواز سنائی دی۔ "میں چلی جاؤں گی تم فکر نہ کرو۔ پچھلی بار رات کے وقت مریضہ کو دیکھنے گئی تھی۔ اس لیے تمہیں ساتھ لے گئی تھی۔ اب تو دن کا وقت ہے' میں گاڑی میں جاؤں گی اور واپس آجاؤں گی۔ تم جاؤ۔"

جانی سڑک پار کرکے اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا پھر اسے اسٹارٹ کرکے کلینک کے سامنے لے آیا۔ فرزانہ دروازے پر تالا لگا چکی تھی۔ کمپاؤنڈر ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ جانی نے گاڑی کو آگے بڑھادیا۔

ٹیکسی چلتی رہی۔ ایک راستے سے دوسرے راستے پر مڑتی رہی۔ فرزانہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ جب اورنگی کا علاقہ پیچھے رہ گیا' تو اس نے پوچھا "یہ کیا تک ہے تم نے مجھے اس طرح کیوں مجبور کیا ہے؟"

جانی نے کہا "تم انکار کردیتیں۔"

"انکار کرتی تو پھر اور طرح مجھے پریشان کرتے۔ جانی ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ میں کب تک تم سے دور بھاگتی رہوں گی"

"بھاگنا چھوڑدو۔ پریشانی ختم ہوجائے گی۔"

اس نے ٹیکسی کو سڑک کے کنارے روک دیا پھر پچھلی سیٹ کی طرف پلٹ کر کہا "آؤ۔ آگے بیٹھ جاؤ۔"

"میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"ضد نہ کرو۔ مجھے تمہارے پاس بیٹھ کر سکون ملتا ہے۔ تمہیں بھی ملتا ہے۔ ملتا ہے نا؟"

"میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"جانی نے تھوڑی دیر تک ضد کی پھر گاڑی کو اسٹارٹ کرکے بڑھاتے ہوئے کہا "دو دن پہلے رخسانہ سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔"

"وہ کیسی ہے؟ کیا چہرے کی سرجری ہورہی ہے؟"

"اس نے سرجری کے بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن وہ ایک بہت بڑی اشتہاری کمپنی کے ساتھ معاہدہ کررہی ہے' اسے بہت بڑی رقم ملے گی' اس رقم سے وہ وہاں کے اخراجات پورے کرے گی۔"

"اس کا چہرہ تو بگڑا ہوا ہے' کمپنی والے اسے کس بات کی رقم دیں گے؟"

"یہ تو میں نے نہیں پوچھا۔"

"تم کیسے شوہر ہو' یہاں سے اپنی بیوی کو اتنی دور بھیج دیا لیکن اس کے اخراجات کے

لیے رقم پوری نہیں دی۔ اب وہ کسی کمپنی سے معاہدہ کر رہی ہے۔ تم نے یہ بھی معلوم نہیں کیا کہ معاہدہ کیسے ہو رہا ہے۔ اشتہاری کمپنی والے تو غیر معمولی حسین عورتوں سے معاہدہ کرتے ہیں۔ ان کے چہرے کی فوٹوگرافی کے ذریعے پوسٹروں اور فلموں کے ذریعے اپنی مصنوعات کی پبلسٹی کرتے ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے جب رخسانہ کا چہرہ بن جائے گا۔ تب وہ کمپنی والے اس کی فلم بنائیں گے۔"

"لیکن چہرہ تو بنا نہیں ہے۔ کمپنی والے کیا جانیں کہ رخسانہ مکمل ہونے کے بعد غیر معمولی حسین لڑکی نظر آئے گی یا ایک عام شکل صورت کی لڑکی ہوگی۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ ٹیلی فون پر اتنی باتیں نہیں ہو سکتیں۔ ہم دوسری باتیں کرتے رہے۔"

"کیسی باتیں؟ مجھے بتاؤ گے؟"

"وہ بہت چالاک ہے۔ باتوں باتوں میں اس نے میرے منہ سے یہ بات اگلوالی کہ میں تم سے مل چکا ہوں۔"

وہ سیدھی ہو کر سیٹ پر بیٹھ گئی پھر اس نے پوچھا "تم کیسے آدمی ہو؟ میرا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"زیادہ دلیری نہ دکھاؤ۔ یہاں ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ وہ ہزاروں میل دور پردیس میں ہے' اسے کسی طرح پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ اب وہ کیا سکون سے ہوگی؟ کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں ہے؟"

وہ پریشان ہو کر بولا "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"تم کبھی عقل کی بات سوچتے بھی ہو یا صرف جھگڑنا ہی جانتے ہو؟"

"میں اسے پریشان نہیں ہونے دوں گا۔"

"اب کیا کرو گے؟"

"میں آج ہی خط لکھ دوں گا کہ تم نے اپنا کلینک' اپنا مکان بیچ دیا ہے اور مجھ سے ملے بغیر کہیں چلی گئی ہو۔ مجھے تمہارا پتا نہیں معلوم اس طرح اسے اطمینان ہو جائے

گا۔"

"ویسے تم نے بہت برا کیا۔ فون پر میرا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"ایک نہ ایک دن تو یہ بات کھلے گی کہ ہم ملتے ہیں۔"

"ہم ملتے ہیں نہ کہو۔ تم ملتے ہو۔"

"بات ایک ہی ہے۔ میں ملتا ہوں تو تم ملتی ہو۔"

"میں نہیں ملتی' مجھے الزام نہ دو۔"

"کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

"نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں میرا پیچھا چھوڑ دو' مجھے پریشان نہ کرو۔"

"میں پریشان نہیں کروں گا' کہہ دو کہ محبت کرتی ہو۔"

وہ چپ رہی۔

"میں تمہارا پیچھا بھی نہیں کروں گا۔ بول دو۔"

"جو کہنا تھا' میں کہہ چکی ہوں۔"

"اچھی بات ہے تو پھر سنو۔ میں ایک عالم صاحب سے مل چکا ہوں' اس سے میں نے بہت کچھ پوچھا ہے۔"

فرزانہ نے حیرانی سے پوچھا "جب تمہیں رخسانہ سے محبت ہے اور وہ ایک اچھی وفادار بیوی ہے تو اس چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کیا حق بات کو نہیں جاننا چاہیے؟"

"میں بحث نہیں کروں گی مجھے بتاؤ عالم صاحب نے کیا کہا ہے؟"

جانی نے ڈرائیو کرنے کے دوران ایک ہاتھ بڑھا کر ڈیش بورڈ کے ایک حصے کو کھولا پھر اس میں سے تہ کیا ہوا کاغذ نکالتے ہوئے کہا "میں ایک ماہ پہلے عالم صاحب کے پاس گیا تھا' اپنے اور رخسانہ کے بارے میں بہت سے سوالات لکھ کر ان کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ دو دن بعد مجھے جواب مل گیا۔ لو اسے پڑھ لو۔"

فرزانہ نے اس کاغذ کو لے کر کھولا پھر اسے پڑھنے لگی۔ جانی نے جو مسئلہ پیش کیا تھا

اور اس سلسلے میں جو سوالات کیے تھے اس کے جواب میں لکھا تھا۔

"صورت مسئولہ میں لڑکی کے والدین نے دھوکا دہی سے جو نکاح کرایا ہے اس کا گناہ ان پر رہے گا اور دھوکا دہی کے تحت زر مہر سے زائد جو مکان لڑکی کے نام کر دیا گیا' وہ بھی ناجائز ہے۔

قانونی اعتبار سے تو یہ مکان لڑکی کو مل جائے گا لیکن قرآن و حدیث کی رو سے لڑکی کے لیے اس مکان کا لینا ناجائز ہو گا۔ حرام ہو گا کیونکہ شوہر کو اگر لڑکی کا حال معلوم ہوتا تو وہ مکان دے کر اس سے کبھی شادی نہ کرتا اس لیے لڑکی اور لڑکی کے والدین کی ذمے داری ہے کہ مکان شوہر کو واپس کر دے۔"

زر مہر پچاس ہزار روپے اگر لڑکے کی حیثیت سے زیادہ ہیں' دھوکے سے مہر زیادہ رکھا گیا ہے تو ضرورت سے زیادہ مہر بھی شوہر کو معاف کر دے اور اس کے ساتھ ساتھ لڑکی کے والدین' داماد سے معافی مانگیں ورنہ آخرت میں مواخذہ ہو گا۔

شوہر کو اختیار ہے کہ چاہے بیوی کو طلاق دے یا بہ حیثیت بیوی رکھ لے۔ نکاح فسخ کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کو رکھنے میں اجر ملے گا۔

دھوکا دہی' ناجائز حرام ہے اس کی تلافی کرنا ضروری ہے ورنہ دھوکا دینے والے' دھوکے کے تحت مال کھانے والے عذاب کے مستحق ہوں گے۔

لڑکے کو حق ہے کہ اسے طلاق دے' واجب نہیں۔ رکھ لینا بہتر ہے۔

اس کی تلافی کی صورت میں یہ لڑکی مکان اور اپنی حیثیت سے زائد مہر شوہر کو معاف کر دے اور لڑکی کے والدین دھوکا دہی کی معافی مانگیں اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں اور اس کے بعد شوہر بیوی کو اللہ' رسولؐ کی خوشنودی اور لڑکی کی دلجوئی کے لیے رکھ لے' طلاق نہ دے۔ فقط والسلام۔ فتویٰ محمد عبدالسلام۔"

اس کے نیچے مہر لگی ہوئی تھی۔

فرزانہ نے کاغذ کو اگلی سیٹ پر اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا "یہ درست ہے کہ حقیقت کا علم ہونا چاہیے۔ جائز اور ناجائز کو سمجھنا چاہیے مگر تمہیں سمجھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ جب تم نے رخسانہ کو نکاح کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھ کر قبول کر لیا تو پھر وہ نکاح قبول ہوا۔"

"یہ تو اس کاغذ سے بھی ظاہر ہے کہ نکاح قبول ہو گیا لیکن میں اس نکاح کو فسخ کر سکتا ہوں۔"

"مگر تم ایسا نہیں کرو گے۔"

"میں کر سکتا ہوں۔"

"میں یقین نہیں کر سکتی۔ تم رخسانہ کو بہت چاہتے ہو پھر یہ کہ تم ایک بیٹے کے باپ ہو۔ کیا تمہیں بچے سے محبت نہیں ہے؟"

"بات بچے کی نہیں ہے' اس عورت کی ہے جس سے تم نے نکاح پڑھوا دیا ہے۔ تمہارے دھوکا دینے سے ایسا ہوا۔ تم رخسانہ کی بھلائی چاہتی تھیں۔ اب میں تمہاری قربانی کو ضائع کروں گا۔"

"کیا تم میری وجہ سے ایسا کرو گے؟"

"جب تم رخسانہ کی بھلائی کے لیے مجھے دھوکا دے سکتی ہو تو میں بھی تمہاری بے مروتی اور بے حسی کے بدلے رخسانہ کو چھوڑ سکتا ہوں۔ آئندہ اگر اس کا چہرہ مکمل نہ ہو سکے اور وہ ادھوری لوٹ کر آ جائے تو تم کسی مرد کو پھر اپنا جلوہ دکھا کر پھانسنا اور رخسانہ کو اس سے بیاہ دینا۔ تمہارے فریب دینے کی مشق جاری رہے گی۔"

"مجھے طعنے نہ دو۔ عالم دین نے جو نصیحت کی ہے اس پر عمل کرو۔"

"اگر میں عالم صاحب سے تمہارے متعلق سوالات کروں تو اس کاغذ پر لکھا ہو گا کہ اپنا چہرہ دکھانے کے بعد تمہیں مجھ سے شادی کرنی چاہیے۔ اگر تہذیب و شرافت یہ کہتی ہو تو کیا تم مجھ سے نکاح کرو گی؟"

وہ چپ رہی۔ جانی نے سوال کیا۔ "تم میری محبت کا اقرار نہیں کرتی ہو تو نکاح کیسے قبول کرو گی۔ اپنی بات آتی ہے تو رخسانہ کی حمایت میں کہتی ہو۔ مجھے ایمان کی باتیں سکھاتی ہو اور جب میری بات آتی ہے تو ایمان کو بھول جاتی ہو' جھوٹ اور فریب یاد رہ جاتا ہے۔"

"کب تک مجھے طعنے دیتے رہو گے۔ جو غلطی میں نے کی اس کی سزا مجھے دے چکے ہو۔ دل نہ بھرا ہو تو مجھے مارو' جان سے مار ڈالو۔"

"ضرور ماروں گا مگر ایک تیر سے دو شکار کروں گا۔ ایک تم کو دوسری رخسانہ کو۔ میں

اسے چھوڑ دوں گا۔ وہ مجھ سے محروم ہو گی اور تمہاری قربانی بھی ضائع ہو گی پھر تم دونوں سہیلیاں مجھے دور سے دیکھتی رہنا۔"

وہ پریشان ہو کر سر جھکائے سوچ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

"جانی! کوئی ایسا راستہ نکالو کہ کسی کو کسی سے نقصان نہ پہنچے، ہم سب اپنی اپنی جگہ خوش رہیں۔"

"کیسے خوش رہیں؟ تم نے میرے دل میں اپنے لیے تمنا پیدا کر دی۔ میں تمہارے لیے تڑپ رہا ہوں۔ میں کیسے خوش رہ سکتا ہوں۔ تم مجھے مل جاؤ، میری بن جاؤ پھر مجھ سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں ہو گا۔"

فرزانہ نے بے بسی سے ایک گہری سانس لی پھر آہستگی سے کہا "گاڑی موڑ لو کافی دیر ہو چکی ہے مجھے واپس جانا چاہیے۔"

اگلے چوراہے پر اس نے گاڑی موڑ دی "تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تم مجھے ٹالنے کی کوشش کرتی جا رہی ہو مگر یاد رکھو، میں یہی کروں گا جو کہہ چکا ہوں۔"

"جو تمہاری مرضی ہے کرتے رہو۔ میں نے رخسانہ کے لیے ایک قربانی دی تھی تمہیں دھوکا دیا اس پر شرمندہ ہوں۔ تم اسے چھوڑ دو گے تو میری قربانی رائگاں نہیں جائے گی کیونکہ جو کرنا تھا، وہ میں کر چکی ہوں۔"

"تمہارے ایسا کہہ دینے سے بات ختم نہیں ہو گی۔"

"یہی تو معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ بات کیسے ختم ہو گی؟"

"ایسے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں، تم مل جاؤ۔"

"میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"نہ کرو مگر میری بن جاؤ۔"

"تم ہوش میں تو ہو۔ بغیر شادی کے تمہاری بن جاؤں؟ تم نے مجھے کیا سمجھا ہے؟ کیا میں کوئی بازاری لڑکی ہوں؟ یا سستے جذبات اور خیالات رکھنے والی ہوں کہ تم نے پیار کے دو بول بولے اور میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیا۔ نہیں جانی! میری نظروں میں میری ذات سب سے زیادہ اہم ہے میری ذات ہی میری دنیا ہے، میرا سرمایہ ہے۔ میرا دین ہے، میرا ایمان ہے۔ اگر میں نے اس ذات کو غلط ہاتھوں

میں دیا تو گویا اپنے ایمان سے گئی۔ میں اپنی نظروں سے گرنا کبھی پسند نہ کروں گی۔"

"تم نے کہا میں نے سن لیا اب میں جو کہتا ہوں، اسے اپنے آنچل سے باندھ کر رکھو۔ تم میری ایسی تلاش ہو کہ جسے میں پا کر بھی نہ پا سکا اور جب تک نہیں پاؤں گا میری تلاش جاری رہے گی۔ میں تمہارے پیچھے بھاگتا رہوں گا۔ سڑک کے اس پار تمہارا کلینک ہے، اس پار میری ٹیکسی رہے گی۔ تم جہاں جاؤ گی میں تم سے دور دور رہوں گا۔ تمہاری مرضی ہے۔ تم منہ پھیرتی رہنا۔ میری مرضی ہے میں تمہارا سایہ بنتا رہوں گا۔"

اس نے کلینک سے بہت دور گاڑی روک دی۔ وہ پچھلی سیٹ سے اتر کر دواؤں کا بیگ اٹھا کر سر جھکائے سڑک پار کر کے دوسری طرف چلی گئی۔ وہ پلٹ کر جانی کی طرف دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ بیگ اٹھائے آہستہ آہستہ جا رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اسے اپنے بدن میں جگہ جگہ اس کی نظریں چبھتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی، وہ جا رہا تھا۔

مگر شاید نہیں جا رہا تھا۔ سڑک کے ایک طرف وہ چل رہی تھی اور دوسری طرف گاڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اگر وہ جا رہا تھا تو گاڑی کی آواز دور ہو جاتی لیکن آواز پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے ذرا سا سر گھما کر دیکھا۔ دوسرے کنارے پر وہ ٹیکسی کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ لوگ راستے میں آ جا رہے تھے۔ مرد عورتیں بچے سب ہی دور دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں لیکن کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جانی ٹیکسی میں بیٹھا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ جلدی سے کلینک کے دروازے پر پہنچ کر تالا کھول کر اندر چلی گئی پھر دروازے کو ایک دھڑاکے سے بند کر دیا۔

جانی تھوڑی دیر ٹیکسی میں بیٹھا ادھر دیکھتا رہا۔ اس نے گاڑی کا ہارن نہیں سنایا نہ ہی ٹیکسی کا رخ اس کے دروازے کی طرف کیا۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ انہیں ان کی منزل تک پہنچانے چلا گیا پھر اس کے بعد تمام دن ٹیکسی چلاتا رہا۔ رات کو ٹھیک آٹھ بجے کلینک کے سامنے سڑک کے اس پار گاڑی کو لا کر کھڑا کر دیا۔

روز کا یہی دستور ہو گیا۔ رات کے آٹھ بجے ٹیکسی وہاں آ کر کھڑی ہو جاتی تھی اور صبح چھ سات بجے وہاں سے چلی جاتی تھی۔ کلینک کا دروازہ صبح دس بجے کھلتا تھا۔ مریض

عورتیں اور بچے علاج کے لیے آتے تھے۔ دن کے ایک بجے وہ دروازہ بند ہو جاتا تھا پھر شام کے چھ بجے کھلتا تھا اور نو بجے رات کو بند ہو جاتا تھا۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کے دوران بھی فرزانہ کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ کلینک کے اندر اپنے گھر کے اندر گم ہو گئی تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا پھر ایک مہینہ گزر گیا۔ اس کا کمپاؤنڈر اس کے لیے بازار سے سودا لے کر آتا تھا۔ گھر کا راشن بھی وہی پہنچاتا تھا۔ باہر کا جتنا بھی کام ہوتا تھا' وہ کرتا رہتا تھا۔

ایک صبح جانی نیند سے بیدار ہو کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ سے اٹھا پھر اس نے حسب عادت کلینک کے دروازے کی طرف دیکھا تو وہ خلاف توقع کھلا ہوا تھا۔

پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت دروازے کے کھلنے کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ اس وقت کوئی مریضہ بھی نہیں آسکتی تھی۔ وہ ٹیکسی سے اتر کر دروازے کو بند کرنے کے بعد آہستہ آہستہ سڑک پار کر کے کلینک کی طرف بڑھنے لگا۔ س کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے زبان دی تھی کہ کبھی اسے مخاطب نہیں کرے گا لیکن اب وہ اس کے کلینک کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔

اس نے چند لمحوں تک کچھ سوچا' فیصلہ کیا پھر دروازے کے اندر قدم رکھ دیا۔

فرزانہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف ہی تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ چونک گیا۔ عجیب حالت تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں ذرا اندر کو دھنس گئی تھیں چہرہ مرجھا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں کی بیمار ہے کپڑے بھی شکن آلود تھے۔

ادھر فرزانہ نے بھی جانی کو دیکھا۔ جانی کی آنکھیں بھی اندر کو دھنسی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ سر کے بال بھی ہپیوں کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ لباس بھی شکن آلود تھا۔ وہ مسلسل دو مہینے سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر سو رہا تھا۔ اس طرح نیند پوری نہیں ہوتی تھی پھر یہ کہ ہوٹلوں کا کھانا کھاتا تھا۔ اپنی صحت کی فکر نہیں تھی۔ وہ پہلے سے آدھا ہو گیا تھا۔ اس نے بے اختیار پوچھا "یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

جانی اس کی طرف پلٹ گیا۔ ایک دیوار کے روبرو ہو کر بولا "جب آدمی زبان کا پابند ہو اور کسی کو مخاطب نہ کر سکتا ہو تو وہ دیوانے کی طرح دیواروں سے باتیں کرتا ہے' اے

دیوار! میں تجھ سے بولتا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ جس کی محبت میں تڑپ رہا ہوں' جسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ میری وجہ سے اس قدر پریشان ہو گی کہ بیماروں جیسی حالت بنا لے گی۔"

فرزانہ نے اس کی باتیں سن کر پوچھا "تم نے بھی تو اپنی حالت ایسی ہی بنالی ہے۔ جانی! خدا کے لیے عقل سے کام لو۔ ہم ایسے مقام پر ہیں جہاں ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے۔ محبت ایک خوب صورت جذبہ ہے' اسے بدصورت نہیں بنانا چاہیے۔ محبت کا چہرہ نہیں بگاڑنا چاہیے۔ آج میں اپنی زبان سے اقرار کرتی ہوں۔ میں ہر لمحہ تمہارے لیے جیتی ہوں اور تمہارے لیے مرتی ہوں مگر تم سے یہی کہتی رہوں گی کہ محبت کو بدنام نہ کرو۔ اپنا گھر نہ بگاڑو۔ رخسانہ کا حق نہ مارو اور اپنے بچے کے مستقبل کا خیال کرو۔ دیکھو جانی! ہم انسان ہیں۔ انسانوں کی طرح بہت ہی اچھے انداز میں ہمیں اپنی زندگی کے متعلق سوچنا چاہیے۔"

جانی نے دیوار کو دیکھتے ہوئے پوچھا "اگر میں تمہارے مشوروں پر عمل کروں تو کیا تم اپنی صحت کا خیال رکھو گی؟"

"ہاں رکھوں گی۔"

"جب بھی میری ٹیکسی کی پچھلی سیٹ سے گلابوں کی مہک اٹھتی ہے تو میری نگاہوں کے سامنے تمہارا چہرہ کھلنے لگتا ہے۔ میں تمہیں اسی تازہ گلاب کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تم جیسا چاہتے ہو' میں ویسے ہی رہوں گی۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اب تم کبھی میری ٹیکسی کو اور مجھ کو نہیں دیکھو گی۔"

وہ جانے لگا۔ فرزانہ نے آواز دی "ٹھہرو جانی! پہلے میں تمہیں آنے سے روکتی تھی لیکن اب تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم نے اپنا حلیہ بدلا ہے کہ نہیں۔ کل تم ادھر آنا۔ میں کھڑکی سے دیکھوں گی۔ میں وہی پہلے والے صحت مند ہنستے کھیلتے جانی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اچھی بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کی خاطر انسانوں کے حلیے میں رہیں گے۔"

وہ کلینک سے باہر آیا پھر اپنی ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس دن کے بعد اس کا حلیہ بدل گیا۔ خیالات بھی بدلنے لگے' اسے عقل آگئی تھی کہ وہ فرزانہ کا پیچھا کرے گا تو بیمار پڑجائے گا۔ فکر اور پریشانیوں میں مبتلا رہے گا۔ اگر محبت ہے تو پھر فرزانہ کو محبت سے زندہ رکھنا چاہیے۔

وہ اپنا حلیہ بدلنے کے بعد ایک بار پھر فرزانہ کے سامنے آیا پھر اس نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اس کی کلینک کی طرف پھر نہیں گیا۔ اپنے دھندے میں مصروف ہو گیا۔ وہ صبح سے شام تک ٹیکسی چلاتا تھا۔ وہ وقت اپنے بچے کے پاس جاتا تھا۔ اسے گود میں لے کر کھلاتا تھا۔ خوب پیار کرتا تھا' رخسانہ کو یاد کرتا تھا۔ کبھی اسے خط لکھتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ مہینے میں ایک آدھ ٹرنک کال کے ذریعے گفتگو کرتی تھی۔ اسے بتاتی رہتی تھی۔ چار ماہ کے بعد اس نے بتایا کہ چہرے کی سرجری ہو چکی ہے۔ چھ ماہ کے بعد اس نے بتایا کہ چہرے کی بہت سی پٹیاں ہٹادی گئی ہیں اور جہاں سے پٹیاں ہٹائی گئی ہیں' وہاں کا چہرہ بالکل ہی بے داغ نظر آرہا ہے۔

وہ خوش ہو جاتا تھا۔ بڑی محبت سے اسے حوصلہ دیتا تھا۔ "رخسانہ! میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

ادھر فرزانہ کی محبت کسی طرح مٹائی نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ اس محبت کو اپنے اندر چھپا کر رکھے گا۔ وہ اپنے من کو مار رہا تھا۔ ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود اس سے دور رہنے پر خود کو مجبور کرتا جارہا تھا۔ بعض حالات میں انسان کوششوں کے باوجود ناکام رہتا ہے' کبھی خود کو بنانا چاہتا ہے تو تقدیر بگاڑنے لگتی ہے۔
ایک دن اس کی ٹیکسی بگڑ گئی' اس نے گاڑی کو گیراج میں کھڑا کیا' اسے مرمت کے لیے چھوڑ کر ایک بس میں بیٹھ کر ناظم آباد کی طرف چلا آیا۔ وہ تھوڑا وقت اپنے بیٹے کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ جب وہ سسرال کے قریب پہنچا تو اسے ایک سفید رنگ کی کار فرید احمد کے گھر کے سامنے رکتی ہوئی دکھائی دی' جانی قریب پہنچ گیا۔ کار کا اگلا دروازہ کھول کر ایک نوجوان باہر آیا۔ اس نے جانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "مسٹر! ذرا ایک منٹ! کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ یہاں مسٹر فرید احمد کا مکان کون سا ہے؟"
جانی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا "بتا سکتا ہوں۔ آپ کون ہیں؟

کہاں سے آئے ہیں؟"
"میرا نام جمشید علی ہے۔ میں لندن سے آیا ہوں۔ فرید احمد صاحب کی بیٹی کی کچھ چیزیں لے کر آیا ہوں۔"
جمشید کا نام سنتے ہی جانی کو یاد آیا کہ رخسانہ اپنے کسی انکل جمشید کے ہاں رہنے کے لیے لندن گئی ہے۔ اس نے جمشید سے پوچھا "آپ فرید احمد کی صاحب زادی کو لندن میں کیسے جانتے ہیں؟"
جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ جاننے کی بات پوچھ رہے ہیں۔ جناب وہ تو لندن میں میرے ہی ہاں رہنے کے لیے آئی تھی۔ بائی دی وے آپ مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ میں تو آپ سے صرف فرید احمد صاحب کا پتا پوچھ رہا ہوں۔"
جانی نے کہا "آپ نے صحیح جگہ گاڑی روکی ہے۔ یہ سامنے والا مکان فرید صاحب کا ہے۔"

یہ کہہ کر جانی آگے بڑھ گیا۔ ذرا آگے جاکر ایک گلی میں مڑ گیا پھر وہاں سے پلٹ کر دیکھنے لگا۔ جمشید دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ چند لمحے بعد ہی فرید احمد نے دروازہ کھولا۔ جمشید سے کوئی سوال کیا۔ جمشید نے کوئی جواب دیا۔ دونوں میں کچھ اور باتیں ہوئیں جیسے ایک دوسرے کا تعارف ہو رہا ہو۔ اس کے سسر کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ وہ اب دروازے کو پوری طرح کھول کر جمشید کو اندر بلا رہا تھا۔
جمشید جیسے ہی اندر گیا۔ جانی تیزی سے چلتا ہوا دوسری گلی میں آیا۔ وہ فرید احمد کے مکان کی پچھلی گلی تھی۔ مکان کا پچھلا دروازہ اتفاق سے کھلا ہوا تھا۔ بیگم آنگن کی صفائی کررہی تھیں۔ اسی وقت فرید احمد نے آکر کہا "بیگم! جلدی آؤ' بہت بڑی خوش خبری ہے۔ وہ جمشید آیا ہے ہماری بیٹی نے بہت سا سامان بھیجا ہے' جلدی آؤ۔"
بیٹی کے متعلق سن کر بیگم نے جھاڑو ایک طرف پھینک دی۔ پچھلا دروازہ بند کرنا بھول گئیں۔ ایک دم کھنچی ہوئی ادھر چلی گئیں۔ جانی اس کھلے ہوئے دروازے سے اندر آگیا۔ اس کے اندر ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اسے ایک ایسا نوجوان جمشید نظر آیا تھا جو کسی طرح بھی رخسانہ کا انکل نہیں ہو سکتا تھا اور اگر انکل تھا بھی تو وہ ایک نوجوان کے پاس رہنے کے لیے کیوں گئی تھی؟

وہ دبے پاؤں آنگن سے گزرتا ہوا ایک کمرے میں آیا۔ وہاں ایک پلنگ پر اس کا بیٹا سو رہا تھا۔ وہ چلتا ہوا اس کمرے کے دروازے کے پاس آیا جس کے دوسری طرف نوجوان انکل جمشید بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اپنی ساس کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"ہائے بیٹا جمشید! تم ہی جمشید ہو۔ رخسانہ تمہاری بڑی تعریفیں کرتی رہتی تھی جب وہ یہاں تھی اور تم لندن سے خط لکھا کرتے تھے تو میں نے بھی وہ خط پڑھے ہیں۔ ماشاء اللہ بہت خوب لکھتے ہو۔ بہت ذہین ہو۔ تم نے ہماری بیٹی کے لیے جو کچھ کیا ہے، ہم اسے کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔"

جمشید کی آواز سنائی دی "آنٹی! آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں کس قابل ہوں ذرا ٹھہریے، میں کار کی ڈگی سے وہ سوٹ کیس لے آؤں جو رخسانہ نے آپ لوگوں کے لیے بھیجا ہے۔"

بیگم نے خوش ہو کر پوچھا "ہائے اللہ! کیا ہے سوٹ کیس میں؟"

"آپ لوگوں کے لیے کچھ کپڑے ہیں، بچے کے لیے بہت سارے کھلونے ہیں اور اس نے اپنے شوہر کے لیے بھی کچھ بھیجا ہے، میں ابھی آتا ہوں۔"

جمشید باہر گیا اور جانی دانت پیس کر سوچنے لگا۔ اچھا! تو لندن سے رخسانہ کو یہی نوجوان خط لکھا کرتا تھا اور میری اس چڑیل ساس نے پہلے بھی اس انکل جمشید کو نہیں دیکھا تھا۔ یعنی پہلے سے کوئی انکل وغیرہ کا رشتہ نہیں تھا۔ مجھے بے وقوف بنایا گیا تھا۔

دوسرے کمرے سے فرید احمد کی آواز سنائی دی "بیگم! یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ وہ اتنی دور سے آیا ہے کچھ چائے وغیرہ بناؤ۔ ناشتے کا انتظام کرو۔"

"ارے ٹھہریے بھی۔ میں ذرا دیکھ تو لوں میری بیٹی نے کیا بھیجا ہے۔ آپ بازار جا کر کھانے کا کچھ سامان لے آئیں۔"

"یوں کہو کہ میں باہر جا کر پہرہ دیتا رہوں۔ کہیں وہ جانی ادھر نہ آ جائے۔ کہیں اس نے جمشید کو دیکھ لیا اور اسے پتا چل گیا کہ یہ وہی جمشید ہے جسے ہم نے رخسانہ کا انکل بتایا ہے تو وہ ہم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

بیگم کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی "ہائے! میں اس کمبخت کو بھول ہی گئی تھی۔ اس کا جمشید سے سامنا ہوگا تو بڑی مشکل ہوگی۔ ادھر جمشید کو بتایا گیا ہے کہ رخسانہ کنواری

ہے، وہ شوہر کی حیثیت سے آئے گا تو کیا ہوگا؟"

جانی کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ خلا میں تک رہا تھا اور اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا "کیا رخسانہ جیسی بیوی ایسی بے وفا ہو سکتی ہے؟ ایک بار جھوٹ بول کر ہزار بار معافیاں مانگ کر پھر اتنا بڑا جھوٹ بول سکتی ہے؟ بیاہتا ہو کر اپنے آپ کو کنواری ثابت کرتی رہی ہے کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں کہ وہ لندن میں جا کر کسی کے سامنے مجھے اپنا شوہر نہیں کہہ سکتی؟ مجھے شوہر کہنے سے اس کی بے عزتی ہوتی شاید۔"

سامنے والے کمرے میں جمشید سوٹ کیس لے کر آ گیا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "آنٹی میں اب سے تین ماہ پہلے ہی آنے والا تھا لیکن کاروباری مصروفیات اتنی بڑھ گئیں کہ نہ آ سکا۔ بہرحال یہ لیجیے آپ کی بیٹی کا سامان اور یہ رہا اس کا خط۔"

وہ خط لینے جا رہی تھیں، اتنے میں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئیں۔ انہیں جانی کمرے میں داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ فرید احمد بھی سہم کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ جانی مکان کے اندر کیسے آ گیا جب کہ بیرونی دروازے کے پاس وہ خود کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑی شفقت سے پوچھا "کیا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا؟"

جانی نے انہیں گھور کر دیکھا تو وہ نظریں پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگے پھر اس نے ساس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک طرف کھڑی آہستہ آہستہ کانپ رہی تھیں۔ جمشید نے انہیں دیکھا پھر جانی سے کہا "مسٹر! آپ تو وہی ہیں، ابھی آپ نے اس گھر کا پتا بتایا تھا مگر آپ کون ہیں؟ یہ لوگ آپ سے اتنے سہمے ہوئے کیوں ہیں؟"

جانی نے غصے سے کہا "جھوٹ ہمیشہ سہما ہوا رہتا ہے اور جب وہ ظاہر ہو جائے تو پھر جھوٹ کی موت آ جاتی ہے۔ اب ان دونوں کے سامنے موت کا فرشتہ کھڑا ہوا ہے۔"

جمشید نے اسے غور سے دیکھا پھر پوچھا "اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو آپ مسٹر بادشاہ جانی ہیں۔"

"مسٹر نہیں ہوں۔ صرف بادشاہ جانی بولو، مجھے آواز دو، اے ٹیکسی والے! رک جاؤ۔ مجھ سے کہو، ابے کدھر جاتا ہے، اس راستے پر چل۔ مجھے بولو کہ میں ایک سواری اٹھانے والا جانور ہوں جو گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کھینچ کر ان کے گھروں تک پہنچاتا

ہے۔ میں ایک گرا ہوا ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ مجھے مسٹر کیسے کہہ سکتے ہو جب کہ میری بیوی مجھے اپنا مسٹر نہیں سمجھتی۔"

بیگم نے ڈرتے ہوئے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "ضرور فرزانہ نے میری بیٹی کے خلاف تمہیں بھڑکایا ہے۔"

جانی نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا "بڑھیا بکواس مت کر' نہیں تو میں تیرا گلا دبا دوں گا۔ جس لڑکی نے تیری بیٹی کے لیے قربانیاں دیں تو اس کے خلاف زہر اگل رہی ہے۔ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ۔ میں دوسرے کمرے میں کھڑا ہوا تم دونوں بڈھے اور بڈھی کی باتیں سن رہا تھا۔ جو کچھ میں نے سنا ہے اور سمجھا ہے تم لوگوں کی زبان سے سمجھا ہے۔"

جمشید نے جانی اور بیگم کے درمیان آکر کہا "مسٹر! ذرا سہولت سے کام لیں' مجھے بھی سمجھنے کا موقع دیں کہ آخر آپ کو غصہ کیوں آرہا ہے؟"

جانی نے فرید احمد کی طرف پلٹ کر کہا "اے جورو کے چمچے! اسے جواب دے۔"

فرید احمد نے سہمے ہوئے انداز میں کہا "بیٹے! ذرا عزت سے بات کرو' دیکھو اتنی دور سے ایک مہمان ہمارے ہاں آیا ہے۔"

"میں تم لوگوں کی عزت کروں' ایسا کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ مجھے کتنی بار دھوکا دیا ہے؟ کتنی بار جھوٹ کا سہارا لیا ہے اور خود تمہاری بیٹی نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ کیا میں نے تمہاری بیٹی کو اپنا گھر' اپنی جائداد نہیں دی؟ کیا اپنا سب کچھ اس کے نام نہیں لکھ دیا؟ کیا اپنی محبت نہیں دی؟"

بیگم نے کہا "جھوٹ بولتے ہو۔ تم فرزانہ کے پیچھے بھاگتے رہتے ہو۔"

"یہ بات اپنی بیٹی سے پوچھو' فرزانہ کے پیچھے بھاگنے کے باوجود میں کس پر جان دیتا ہوں؟ کس کے لیے میں دن رات محنت کرتا ہوں تمہاری بیٹی کے لیے۔ ہاں تمہاری بیٹی کے لیے میں نے تم لوگوں کے جھوٹ اور فریب کو بھی معاف کر دیا تھا مگر اب نہیں کروں گا۔ اب میں تمہاری بیٹی کو طلاق دے دوں گا۔"

فرید احمد نے چیخ کر کہا "نہیں بیٹے نہیں' ایسی بات زبان پر نہ لاؤ۔ شریف آدمی ایسا نہیں کرتے۔"

وہ کسی کی بات سنے بغیر تیزی سے پلٹ کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ بیگم اور فرید احمد آگے بڑھ کر اس کمرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جب وہ کمرے سے واپس باہر آیا تو اس کی گود میں بچہ تھا۔ "آج سے میرا اور میرے بیٹے کا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اسے لے جا رہا ہوں۔"

بیگم چیخیں مارتے ہوئے اس کے پاس آئیں اور اسے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہنے لگیں "میں اپنے منے کو یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔ تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اس پر میری بیٹی کا بھی حق ہے۔ اسے آنے دو پھر فیصلہ ہوگا۔"

جانی نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا "بکواس مت کرو۔ یہ میرا بیٹا ہے' جاؤ تھانے میں رپورٹ لکھواؤ' عدالت میں بتاؤ۔ اتنا قانون تو میں بھی جانتا ہوں کہ بیٹا باپ ہی کو ملتا ہے۔"

وہ جانے لگا۔ فرید احمد اس سے لپٹ گئے' گڑگڑانے لگے۔ "بیٹا اس طرح رشتہ نہ توڑو۔ ذرا صبر کر لو۔ رخسانہ کو آجانے دو۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں' میری بیٹی معصوم ہے' اس نے تمہیں جان بوجھ کر دھوکا نہیں دیا۔ اس عورت کے بہکانے سے وہ کنواری بن کر گئی بخدا وہ تمہیں اتنا چاہتی ہے' اتنا چاہتی ہے کہ خداوند کریم اگر اجازت دے تو فوراً تمہارے سامنے سجدہ کر لے۔"

"میں نے ایسے سجدے دیکھے ہیں جن کے پیچھے دغابازی ہوتی ہے۔ لوگ تو خدا کو بھی دھوکا دیتے ہیں اور میں تو پھر ایک معمولی انسان ہوں۔"

اس نے فرید احمد کو ایک زوردار دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے کرسی کے پاس جا گرے۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اپنے بچے کو لے کر باہر نکل گیا۔ بیگم فریاد کرتے ہوئے اس کے پیچھے جا رہی تھیں۔ جمشید نے ان کا راستہ روک لیا "آنٹی! ذرا صبر سے کام لیں۔ ایک باپ اپنے بیٹے کو لے گیا ہے' وہ کوئی دشمن تو نہیں ہے۔ وہ غصے میں ہے۔ بعد میں سمجھا لیا جائے گا۔"

وہ جانی کو گالیاں دینے لگیں اور کوسنے لگیں۔ فرید احمد نے ناگواری سے کہا "اب کوسنے اور بددعائیں دینے سے کیا ہوتا ہے' اپنے اعمال کو دیکھو تم نے جو کیا' اپنی بیٹی کو جو سکھایا اس کا نتیجہ ایک دن سامنے آنا تھا' سو آگیا۔"

وہ غصے سے بولیں "میری قسمت تو اسی دن پھوٹ گئی تھی جس دن آپ سے شادی ہوئی۔ آپ جیسا بزدل میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ وہ ہمارے گھر سے بچے کو اٹھا کر لے گیا اور آپ نے کچھ نہیں کیا۔"

"میں کرتا کیا' تماشا بن جاتا؟ وہ غصے میں آگیا ہے' اسے اپنا ہوش نہیں ہے' نہ وہ ہماری عزت رکھتا' نہ اپنی عزت کا خیال کرتا۔ دنیا والوں سے چیخ چیخ کر کہہ دیتا کہ ہم شروع سے ہی اسے دھوکا دیتے آرہے ہیں۔ دنیا والوں کو جب حقیقت معلوم ہوگی تو سب اس کا ساتھ دیں گے اور سب ہمارے منہ پر تھوکیں گے۔"

جمشید نے کہا "آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیں۔ میں مہمان ہوں لیکن اپنے میزبانوں سے بیٹھنے کی درخواست کرتا ہوں۔"

بیگم نے کہا "بیٹا' تم بھی بیٹھو۔ تم اتنی دور سے آئے ہو اور ہمارے گھر میں ایسا تماشا ہو گیا۔ ہم کیا بتائیں بیٹا! یہ جانی ہے نا' ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ بالکل ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ ہماری بیٹی کی تو قسمت پھوٹ گئی ہے۔"

جمشید نے بیٹھ کر مسکراتے ہوئے کہا "مجھے رخسانہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ چہرہ کس کا دکھایا گیا اور شادی کس کے ساتھ ہوئی ہے۔ رخسانہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ وہ وہاں جا کر شوہر کے لیے محبت اور بیٹے کے لیے ممتا کو نہ چھپا سکی۔ مجھے اور میرے پاپا کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ کہتی ہیں کہ وہ ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور ہے لیکن میں نے آپ کی بیٹی کی آنکھوں میں' اس کی زبان میں' اس کے دل میں' اس کے دماغ میں اور اس کی روح کی گہرائیوں میں اسی جانی کو دیکھا ہے۔"

بیگم اور فرید احمد نے سر جھکا لیا۔ جمشید نے کہا "میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ آپ لوگوں کو داماد پسند نہیں ہے۔ سچ پوچھیے تو مجھے بھی یہ شخص بالکل پسند نہیں ہے۔"

بیگم اور فرید احمد نے سر کو اٹھایا۔ بیگم نے خوش ہو کر کہا "بیٹا! جو برا ہوتا ہے' اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ سونا آخر سونا ہوتا ہے۔"

"میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو آپ نے اپنی بیٹی کو کنوارا بنا کر شاید اسی لیے بھیجا تھا کہ میں سونا ہوں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بے بسی سے بولیں "میں تو بہت کچھ چاہتی ہوں۔ اس کا

ایک بڑا سا گھر ہو' ایک بڑی سی کار ہو۔ میں اپنی بیٹی کو بہت خوش حال دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ ہنستی کھیلتی ہوئی زندگی گزارے لیکن معلوم نہیں یہ جانی اس کی تقدیر میں کیسے لکھا گیا۔"

"آنٹی! ہم چاہیں تو تقدیر کو بدل سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ اب تقدیر بھی ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ جانی کہہ گیا ہے کہ وہ رخسانہ کو طلاق دے دے گا۔"

فرید احمد نے کہا "بیٹے! تم خود جانتے ہو کہ رخسانہ اسے کتنا چاہتی ہے۔ وہ طلاق نہیں لے گی۔"

"جب جانی طلاق دے ہی دے گا تو رخسانہ کیا بگاڑ لے گی' وہ کچھ عرصے تک ماتم کرے گی' روئے گی' بلبلائے گی پھر خاموش ہو جائے گی۔"

بیگم نے پوچھا "لیکن ہمارا نواسا؟ اسے تو وہ لے گیا ہے رخسانہ اپنے بیٹے کے بغیر کیسے رہے گی؟"

"زندگی میں چاہے کتنے ہی گہرے زخم لگیں' وہ آہستہ آہستہ بھر جاتے ہیں۔ طلاق نامہ تو رخسانہ کے پاس پہنچ ہی جائے گا۔ اگر اس سے پہلے ہم یہ اطلاع دے دیں کہ اس کا بیٹا اللہ کو پیارا ہو گیا ہے تو....."

بات پوری ہونے سے پہلے ہی بیگم چیخ مار کر کھڑی ہو گئیں "نہیں' ایسی بات منہ سے نہ نکالو' میرے کامی کو کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"دیکھیے آنٹی! جذبات میں آنے کی ضرورت نہیں ہے موت تو ایک دن سب کو آنی ہے۔"

بیگم نے کہا "اس کی آئی مجھے آجائے۔ موت آئے گی تو میں اس کے پاؤں پکڑ لوں گی۔"

"بے شک آپ موت کا راستہ روک سکتی ہیں مگر جانی کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ وہ اپنے بیٹے کا حقدار ہے اور اسے لے جا چکا ہے۔ آپ سر پٹکتی رہیں' قانونی کارروائیاں کرتی رہیں لیکن نتیجہ کیا ہو گا۔ یہ آپ اور ہم سب جانتے ہیں۔ بیٹا جانی کا ہے جانی کو ملے

گا۔ آپ لوگ میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک ماں سے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس کا بیٹا مر گیا ہے تو وہ رو رو کر برا حال کرلے گی لیکن ایک وقت اسے صبر آجائے گا اور جب وہ دیکھے گی کہ بیٹا زندہ ہے اور اس سے چھین لیا گیا ہے اور اس کے شوہر کے پاس ہے تو وہ جیتے جی مرتی رہے گی اور اسے چاہے سونے کا نوالا کھلاؤ' تب بھی وہ خوش نہیں رہے گی' کیا آپ اتنی سی بات نہیں سمجھتی ہیں؟"

فرید احمد نے کہا "بیٹے! تم بہت اچھی باتیں سمجھا رہے ہو۔ جانی اپنے بیٹے کو لے گیا ہے' وہ رخسانہ کو بہت تڑپائے گا۔ وہ جیتے جی مرتی رہے گی یہ تو ہماری سمجھ میں آگیا ہے۔"

"جب پوری بات سمجھ میں آگئی ہے تو اس سے پہلے ہی رخسانہ کو ایک بڑا صدمہ پہنچایا جائے۔ وہ اپنے بیٹے کی موت کو رفتہ رفتہ برداشت کرلے گی۔"

"لیکن کیسے؟ جب وہ یہاں آئے گی تو اسے معلوم ہو جائے گا۔"

"رخسانہ چار پانچ ماہ سے پہلے نہیں آسکے گی۔ چلیے ہم سب لندن چلتے ہیں۔ میں آپ دونوں کے اخراجات برداشت کروں گا۔ وہاں جا کر ہم اسے بتائیں گے کہ کامی بہت بیمار تھا اور بیماری کی حالت میں اللہ کو پیارا ہو گیا یا پھر کہیں گے کہ جانی اپنے بیٹے کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا اور وہاں اس کی غفلت سے بیمار رہ کر ختم ہو گیا۔ اس طرح رخسانہ کے دل کے کسی گوشے میں جانی کے لیے نفرت پیدا ہو جائے گی۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کا یہ ظلم برداشت نہیں کرے گی پھر جانی کا طلاق نامہ پہنچے گا۔ وہاں ہم سب رخسانہ کو سمجھاتے مناتے رہیں گے۔ آخر ایک دن وہ مان ہی جائے گی۔ حالات کے سامنے جھک جائے گی۔ میں اسے اتنی دولت دوں گا' اتنا خوش رکھوں گا کہ آپ دونوں اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور وہ بھی میری محبت کو محسوس کرے گی۔"

وہ کہہ رہا تھا' یہ سن رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ ان کی بیٹی ایک ٹیکسی والے کے مقابلے میں ایک کار والے کے پاس زیادہ خوش حال رہ سکتی ہے اور اس کی تمام آرزوئیں تمنائیں پوری ہو سکتی ہیں۔ سوسائٹی میں اونچا مقام مل سکتا ہے۔ یہ ساری باتیں سمجھ میں آرہی تھیں۔ جمشید جانے کے لیے کھڑا ہو گیا "بیٹے' کہاں جا رہے ہو۔ ہم تمہیں کچھ کھائے پیئے بغیر جانے نہیں دیں گے۔"

"آنٹی! یہ میرا ہی گھر ہے۔ ابھی میں ضروری کام سے جا رہا ہوں کل آؤں گا تو آپ

لوگوں کو کسی اچھے ہوٹل میں لے جاؤں گا۔ کل میری طرف سے ڈنر ہے۔"

فرید احمد نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے پہلے ہمارے ہاں دعوت ہوگی۔ کل رات تم ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ گے لیکن شام ہی سے چلے آنا تاکہ موجود حالات پر گفتگو ہو سکے۔"

"آپ کہیں تو میں سارا دن یہاں گزار دوں اور آپ کو سمجھاتا رہوں۔ ویسے آپ والدین ہیں' اپنی بیٹی کی بہتری مجھ سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ کل تک آپ لوگ اچھی طرح غور کرلیں۔ میرا مشورہ قابل عمل ہو گا تو ہم فوراً ہی عمل کریں گے۔ میں آپ لوگوں کو لندن لے جانے کے انتظامات کروں گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے مکان سے باہر آئے۔ بیگم نے سفید رنگ کی ائرکنڈیشنڈ کار کو دیکھ کر خوشی سے کہا "ہائے یہ تمہاری گاڑی ہے؟ کتنی خوب صورت ہے' بیٹے وہاں کیا کاروبار ہے؟"

جمشید نے کہا "آنٹی! کاروبار اتنا پھیلا ہوا ہے کہ میں چلتے پھرتے نہیں بتا سکتا۔ کل اطمینان سے بتاؤں گا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ یہاں سے لندن تک کتنے ہی ملکوں کے بینکوں میں ہماری بڑی بڑی رقمیں جمع رہتی ہیں۔ رخسانہ جس ملک میں جائے گی' میری دولت سے کھیلے گی۔"

بیگم سن رہی تھیں اور خوشی سے کھل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ نواسے کو بھول گئی تھیں۔ جب جمشید ان سے رخصت ہو کر وہاں سے چلا گیا اور جب سناٹا چھا گیا تب نواسا ان کی گود میں ہمکنے لگا۔ انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ دور خلا میں تکنے لگیں۔ فرید احمد نے پوچھا "کیا ہر ملک کے بینک میں رہنے والے داماد کا چیک کیش کرا رہی ہو؟"

انہوں نے چونک کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں خالی خالی سی تھیں۔ وہ صرف اپنے نواسے کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کے طنز پر بھی دھیان نہیں دیا۔ چپ چاپ پلٹ کر مکان کے اندر آگئیں۔ فرید احمد نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ نیچ لوگوں سے رشتہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ اپنے ماحول کے مطابق نیچے کی سطح پر کمینگی دکھاتے ہیں' ہمارا اپنا تجربہ یہ ہے کہ ہم اونچے لوگ

اونچی سطح پر کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"

بیگم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے "جانی! ہمارے مقابلے میں اعلیٰ ظرف ہے اس نے ہماری ایک غلطی اور دھوکے کو برداشت کر لیا تھا۔ رخسانہ کو معاف کر دیا تھا۔ اب دوسری بار اس کے سامنے رخسانہ کا جھوٹ کھل گیا۔ باپ اپنے بچوں کو برے ماحول سے الگ رکھتے ہیں' وہ بھی اپنے بچے کو ہمارے ماحول سے الگ لے گیا ہے۔ اس نے کوئی ظلم نہیں کیا ہے۔ یہ اس کا حق تھا' ابھی وہ غصے میں ہے' ذرا صبر سے کام لینا ہو گا۔ کل ہم اس کے پاس جائیں گے' اسے سمجھائیں گے' اس سے معافی مانگیں گے' اس سے پہلے کہ وہ طلاق نامہ لکھے اگر ہم کسی طرح سمجھا بجھا کر اسے روک دیں تو بہتر ہے۔"

بیگم نے صوفے کے ہتھے پر ہاتھ رکھا پھر سر جھکا کر بازو میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

فرید احمد نے قریب آ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟ مجھے دیکھو میں نے زندگی کے تیس برس تمہارے ساتھ گزارے ہیں اور ہمیشہ ہر معاملے میں تمہارا ساتھ دیا ہے خواہ وہ جھوٹ ہو' سچ ہو' اچھائی ہو' برائی ہو۔ میں نے تمہیں کسی بات سے نہیں روکا لیکن آج صاف صاف کہہ دیتا ہوں۔ اگر تم نے جانی کو رخسانہ سے چھڑانے کی کوشش کی یا وہ الگ ہوتے رہے اور تم خاموش تماشائی بن کر رہنا چاہو گی تو میں اسے برداشت نہیں کروں گا۔ میں اب جانی کا ساتھ دوں گا اور اس کے لیے تم سب کو چھوڑ دوں گا۔ آج فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ اگر تمہیں جمشید پسند ہے' تم چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی اس سے منسوب ہو جائے اور پرانے رشتے ٹوٹ جائیں تو پھر تمہیں تمہاری چالبازیاں مبارک ہوں۔"

وہ ایک دم سے سر اٹھا کر بولیں "مجھے کچھ نہیں چاہیے' مجھے میرا کامی چاہیے۔ کامی نہیں ملے گا تو میں مر جاؤں گی۔ اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔"

فرید احمد نے اطمینان کی سانس لے کر اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ نظریں جھکائے کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا "بیگم جب اچھائی کا ساتھ دیا جائے' اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لیا جائے تو اچھائی کے راستے سجھائی دیتے ہیں۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے' ہمارا کامی ہمیں مل سکتا ہے۔"

وہ جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں "کیسے مل سکتا ہے؟"

"دیکھو' میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' اس پر غصہ نہ دکھانا۔ پہلے صبر اور تحمل سے میری تدبیر پر غور کرنا۔ تدبیر یہ ہے کہ ہم پہلے فرزانہ کے پاس جائیں۔ فرزانہ ہی ایک ایسی لڑکی ہے جو جانی کا غصہ ٹھنڈا کر سکتی ہے۔ اسے سمجھا سکتی ہے اور کامی کو واپس لا سکتی ہے۔"

بیگم ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

○☆○

دن کے دو بج رہے تھے۔ فرزانہ کھانے کے بعد بستر پر لیٹنا چاہتی تھی اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے چونک کر کمرے کے دروازے کو دیکھا۔ تیزی سے چلتے ہوئے' دروازے کو کھولتے ہوئے ڈسپنسری میں آئی۔ بیرونی دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اس وقت کمپاؤنڈر نہیں آ سکتا تھا۔ محلے پڑوس کی کوئی عورت آ سکتی تھی لیکن جب بھی دستک ہوتی تھی تو اس کا گمان ہوتا تھا اور وہ بے اختیار بیرونی دروازے کی طرف کھنچی چلی آتی تھی۔ اس نے دروازے کے پاس پہنچ کر پوچھا "کون ہے؟"

بند دروازے کے دوسری طرف سے یقیناً بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گئی کہ کوئی مریضہ بے وقت آئی ہے' یقیناً اس کے بچے کو کوئی تکلیف ہے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ اس نے بے دلی سے دروازے کی چٹخنی گرائی اور اس کے پٹ کھول دیے لیکن دروازہ کھولتے ہی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

جانی بچے کو گود میں لیے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اسے توقع تھی کہ وہ آئے گا۔ پھر وہ توقع ختم ہو گئی تھی مگر وہ خلاف توقع نظر آ گیا۔ کبھی حالات بڑے ستم ظریف ہوتے ہیں۔ سوچو تو وہ نہیں آتا' نہ سوچو تو چلا آتا ہے۔

وہ اندر آ گیا پھر اس نے ایک ہاتھ سے دروازے کو بند کرتے ہوئے سختی سے کہا "تم نے مجھے انسانیت کا سبق پڑھایا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ میں محبت کو بدنام نہ کروں۔ تمہارے کہنے پر میں نے کتنے مہینوں سے تمہیں اپنی صورت نہیں دکھائی۔ آج بھی نہ دکھاتا لیکن جانتی ہو' آج میں اپنے بچے کو لے کر کیوں آیا ہوں؟"

فرزانہ اس کے پاس سے گھوم کر اپنی میز کے پاس جاتے ہوئے بولی "کیوں آئے ہو؟"

"اس لیے کہ محبت اور خلوص پر سے میرا ایمان اٹھ گیا ہے۔"

فرزانہ نے پلٹ کر پوچھا "کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟"

"نہیں مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے رخسانہ کی پہلی غلطی معاف کر دی۔ اگر میں اسے ٹھوکر مار کر پہلے ہی دن گھر سے نکال دیتا تو آج اس قدر نہ پچھتاتا۔ میری ایسی توہین نہ ہوتی جیسی آج ہوئی۔"

"آخر کیا ہو گیا ہے؟"

"یہ ہوا ہے کہ وہ کنواری بن کر لندن گئی ہے۔ اس نے میرے رشتے سے انکار کیا ہے۔ جب انکار کیا ہے تو میں اس کا کچھ نہیں ہوا۔ میرا بچہ بھی اس کا نہیں ہوا۔ میں اسے لے کر تمہارے پاس آ گیا ہوں۔"

فرزانہ نے حیرانی اور پریشانی سے کبھی اسے کبھی بچے کو دیکھا پھر سمجھانے کے انداز میں کہا "جانی! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولا "کیا اب بھی میں نے اچھا نہیں کیا؟ کیا اب بھی وہ اچھا کر رہی ہے؟ جو لوگ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں' جھوٹ بول رہے ہیں' دھوکا دے رہے ہیں۔ وہ سب اچھا کر رہے ہیں اور میں اپنے بچے کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں تو میں نے برا کیا ہے۔ یہ تمہاری کیسی دنیا ہے؟ تم لوگوں کا کیسا انصاف ہے؟ تم لوگ کیسے پڑھے لکھے ہو جو ایک غریب ٹیکسی ڈرائیور کو بے وقوف بناتے چلے آ رہے ہو۔"

"جانی یہ بات نہیں۔ میں۔ نے یہ تو نہیں کہا کہ رخسانہ نے اچھا کیا ہے۔ اگر اس نے خود کو کنواری کہا ہے تو یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہے لیکن تمہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے' وہ آئے گی اور اپنی صفائی پیش کرے گی۔"

"کوئی صفائی پیش نہیں کرے گی۔ جمشید ایک دولت مند نوجوان ہے' میں ٹیکسی والا ہوں' وہ کار والا ہے۔ میں آج تک اپنی محبت سے اسے خرید نہیں سکا۔ ہمیشہ خوش فہمی میں مبتلا رہا لیکن یہ میرا بچہ ہے۔ یہ میری محبت کو سمجھے گا۔ وہ میری ہو یا نہ ہو' یہ تو میرا ہمیشہ رہے گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے' جب عالم دین نے کہا ہے کہ میں اس نکاح کو فسخ کر سکتا ہوں تو پھر میں ایسا ضرور کروں گا۔"

فرزانہ نے آگے بڑھ کر کہا "نہیں جانی! تم ایسا نہیں کرو گے۔ تم غصے میں کوئی ایسا

قدم نہیں اٹھاؤ گے کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔ یہ بچہ صرف تمہارا نہیں ہے' رخسانہ کا بھی ہے اسے دونوں کی محبت چاہیے۔ اگر تم آپس میں جھگڑا کرو گے اور ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ گے تو بچے کی زندگی پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔"

"تم بہت زیادہ تعلیم یافتہ بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم نے آج تک مجھے بہت کچھ سمجھایا ہے۔ تم نے بھی محبت سے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ میں آج تم سے دو ٹوک فیصلہ کرنے آیا ہوں۔ میں تنہا اس بچے کی پرورش کر سکتا ہوں مگر بڑی مشکلیں پیش آئیں گی۔ کیا تم میرا ساتھ دو گی۔ کیا میرے بچے کو پالو گی' اپنے پاس رکھو گی؟"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی "یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں محلے' پڑوس والوں کو کیا جواب دوں گی کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ کس رشتے سے تمہارے بچے کو پال رہی ہوں؟ پھر یہ کہ رخسانہ کی امی وغیرہ آئیں گی تو الگ جھگڑا کریں گی۔ میری مجبوریوں کو سمجھو۔ مجھ پر ایسے ایسے الزامات عائد کیے جائیں گے کہ میرا جینا دوبھر ہو جائے گا۔"

بچہ پھر رونے لگا فرزانہ نے اسے جانی کی گود سے لیتے ہوئے کہا "چلو ابھی ہم اسے اس کی نانی کے پاس پہنچا دیں۔ یہ وہیں حفاظت سے رہے گا۔"

"نہیں' میں اسے اس گھر میں نہیں لے جاؤں گا۔ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"بچہ رو رہا ہے۔ ضد نہ کرو۔"

"یہ بھوکا ہے۔ میں اس کے لیے دودھ لے کر آتا ہوں۔"

وہ جانے لگا۔ فرزانہ نے کہا "ٹھہرو۔ اسے یوں میرے پاس چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میری مجبوریوں کو سمجھو۔ تم بار بار یہاں آؤ گے جاؤ گے تو لوگ کیا کہیں گے۔ کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں ہے؟"

اس نے پلٹ کر کہا "اب تو صرف تمہارا ہی خیال ہے۔ دیکھو فرزانہ' تم نے مجھے جس طرح سمجھایا' میں سمجھتا گیا۔ عالم دین نے بتایا کہ میں نکاح فسخ کر سکتا ہوں لیکن میں نے تمہارے سمجھانے پر ایسا نہیں کیا۔ میں پھر بھی رخسانہ کو قبول کرتا رہا۔ اب اس نے اتنا بڑا دھوکا کیا ہے' میری ایسی توہین کی ہے جسے کوئی مرد برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ عورت زندگی میں آئندہ بھی مجھے دھوکا دیتی رہے گی۔"

"نہیں جانی! رخسانہ آئندہ ایسا نہیں کرے گی۔"

"تم فضول باتیں نہ کرو۔ کیوں اس کی وکالت کرتی ہو؟ جب سارے ثبوت میرے پاس موجود ہیں۔ میرا اپنا تجربہ اس کے ساتھ ہے کہ میں نے اس کے ساتھ کیسی زندگی گزاری ہے کیسی محبت اور کیسا خلوص دیا ہے، کیسا اعتماد ہے اس پر اور وہ ہے کہ مجھے دھوکا دیتی جارہی ہے۔ اب میں تمہاری کچھ نہیں سنوں گا۔ میں نے آخری حد تک اسے اپنانے کی کوشش کی اپنی شرافت کا ثبوت دیا۔ اب میری برداشت سے باہر ہو چکا ہے میں اسے چھوڑ دوں گا۔ میں کل ہی عالم دین سے معلوم کروں گا کہ کس طرح نکاح فسخ کیا جاتا ہے اور اس پر عمل کروں گا اور اس کے بعد میں تم سے شادی کروں گا۔ تم میرے اس بچے کی ماں ہو اب تم ہی اس کی پرورش کرو گی۔"

بچہ رو رہا تھا۔ فرزانہ اسے سینے سے لگائے تھپک تھپک کر چپ کرانے کی کوشش کررہی تھی "تم جوش میں ہو اور میں ہوش میں ہوں۔ ہم دونوں کے فیصلے مختلف ہوں گے۔ دیکھو جانی! آج میں تمہیں یہ بتاتی ہوں کہ جس رات تم بہت نشے میں تھے اور میں تمہارے کمرے میں رات گزار کر آگئی تھی۔ اس رات میں نے تمہاری الماری کو کھول کر رخسانہ کی ڈائری پڑھی تھی۔ رخسانہ نے آخری صفحے پر لکھا ہے، جاکر تم پڑھ سکتے ہو کہ وہ تمہیں پھر ایک بار دھوکے میں رکھ کر یا جھوٹ بول کر پچھتا رہی ہے اور اگر کبھی اس کا جھوٹ تم پر کھل جائے تو تمہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ آکر اپنی صفائی پیش کرے گی۔ یہ بات میں بھی یقین سے کہتی ہوں کہ اس کے جھوٹ کے پیچھے کوئی گندگی، کوئی غلاظت نہیں ہے۔ جانی! وہ تمہارے سوا کسی دوسرے مرد کا بستر نہیں دیکھ سکتی۔ میں رخسانہ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم اس کے ساتھ اتنے عرصے زندگی گزار کر بھی اسے نہ سمجھ سکے۔"

وہ غصے میں مٹھیاں بھینچ کر بولا "تم اس کی حمایت نہ کرو۔ میں ایک سوال کرتا ہوں جس شوہر سے اسے سچائی ملتی ہے، اس نے جھوٹ بول کر اسے دھوکا کیوں دیا؟"

"اس نے دھوکا نہیں دیا۔ ایک عورت جب اپنے شوہر پر بہت مان کرتی ہے، بہت اعتماد کرتی ہے تو وہ سوچتی ہے کہ ایک آدھ بار جھوٹ بول کر گزر جائے گی۔ اس کا شوہر اسے کچھ نہیں کہے گا۔ اگر کہے گا تو وہ اپنی محبت سے، اپنے خلوص سے، اپنی وفاؤں سے

اسے سمجھائے گی۔ اسے موم کرلے گی۔ جانی! رخسانہ کو آنے دو۔ جیسے دوسری بیویاں اپنے شوہروں کا اعتماد حاصل کرلیتی ہیں۔ وہ ایک بار پھر تمہارا اعتماد حاصل کرلے گی۔ میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔"

جانی نے اس کی گود سے اپنے بچے کو چھین کر لیتے ہوئے کہا "میں بھی تمہیں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں، تم ہمیشہ اس کی حمایت کرتی رہو گی اور میری مخالفت کرتی رہو گی۔ تم نے اس کی خاطر مجھے دھوکا دیا۔ آج بھی اس کی خاطر محبت سے انکار کررہی ہو۔ اتنا اچھا موقع ہے کہ میں اس کے جھوٹ اور فریب کا ثبوت پیش کرکے اسے سزا دے سکتا ہوں لیکن تم کبھی میرا ساتھ نہیں دو گی۔ یہ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ ٹھیک ہے، آج میں جارہا ہوں اور آج کے بعد تم میری صورت کبھی نہیں دیکھو گی۔"

وہ یہ کہہ کر تیزی سے چلتا ہوا جانے لگا۔ اس نے آواز دی "جانی رک جاؤ۔ دیکھو غصے میں کوئی غلط قدم نہ اٹھانا۔"

اس نے نہیں سنا۔ دروازے سے باہر چلا گیا۔ وہ دوڑتے ہوئے آئی پھر اس نے کہا "تمہیں کاکی کی قسم ہے واپس آجاؤ۔"

اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑی ہوئی تھی اور اسے التجا آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر سر کے خفیف سے اشارے سے کہا "آجاؤ۔"

وہ آگیا۔ ایک بار پھر دروازے کو بند کرتے ہوئے بولا "تو تم میرا ساتھ دے رہی ہو؟"

"ساتھ دینے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ابھی میں تمہارے بچے کو سنبھالوں گی تو بدنام ہوجاؤں گی۔ میں جو کہتی ہوں کیا اس پر عمل کرو گے؟"

"اگر تم محبت سے میری بھلائی کے لیے سوچو گی اور کہو گی تو ضرور عمل کروں گا۔"

"پہلے یہ بتاؤ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟"

"میں یہ لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ بس اتنا کہتا ہوں کہ تمہیں نہ پایا تو پانے کے لیے آخری سانس تک بھاگتا رہوں گا۔"

"محبت پانے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ چاہنے کے لیے ہوتی ہے، ہم جسے چاہتے ہیں

اس کا گھر بسانے کے لیے ہوتی ہے۔ میں تمہارا گھر اجاڑ کر بھی تم سے محبت کا ثبوت نہیں دے سکتی بلکہ محبت کی توہین کروں گی اور میں ایسا نہیں کر سکتی۔ دیکھو میری بات مان لو۔ ایک شرط پر میں تمہاری بن جاؤں گی لیکن اس کے لیے انتظار کرنا ہوگا۔"

"میں انتظار کروں گا۔"

"تو پھر ابھی نکاح فسخ نہ کرنا۔ رخسانہ کا انتظار کرنا۔"

"وہ کیوں؟"

"جو میں کہہ رہی ہوں' وہ کرو۔ وہ آئے گی' اپنے طور پر صفائی پیش کرے گی۔ بڑے سے بڑے مجرم کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے تم اسے موقع کیوں نہیں دیتے؟ اگر نہیں دوگے تو یہ تمہاری زیادتی ہوگی۔"

"ہر معاملے میں میری زیادتی ہوتی ہے پھر مجھے الزام دے رہی ہو۔"

"میں تمہیں الزام نہیں دے رہی ہوں۔ تمہاری طرف سے ہونے والی زیادتی سے تمہیں بچا رہی ہوں۔ تم اپنے طور پر وہ کام کرو کہ بعد میں تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہ کرے۔"

"میں ایک عرصے سے اپنے ضمیر کے حکم پر چلتا آیا ہوں۔ آج بھی میرا ضمیر مطمئن ہے۔ تم اپنی تعلیم کے ذریعے' اپنی لچھے دار باتوں سے مجھے قائل نہ کرو کہ میں رخسانہ کو اب بھی اپنا لوں۔ یہ کبھی نہیں ہوسکے گا۔ میں کبھی اسے اپنے قریب برداشت نہیں کروں گا۔ چاہے تم مجھ سے شادی کرو یا نہ کرو۔ اب میں تم لوگوں کے فریب میں نہیں آؤں گا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر آ گیا۔ فرزانہ نے اسے پھر آواز دی لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا۔ اب وہ کسی آواز پر مڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اب اس کا اعتماد محبت پر سے اٹھ گیا تھا رخسانہ نے قریب آ کر چرکا لگایا تھا۔ فرزانہ دور سے محبت کے بہلاوے دے رہی تھی۔ دونوں خوب صورت بلائیں تھیں۔ دونوں خوب صورت فریب تھیں اور وہ اپنے اور بچے کے سلسلے میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ ایک ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ بچہ اس کی گود میں تھا اور وہ فیڈر سے دودھ پلا رہا تھا۔ اس کا سوٹ کیس اوپری برتھ پر پڑا تھا۔ ٹرین تیز رفتاری

سے بھاگی جا رہی تھی۔ ٹرین کہاں جا رہی ہے اور اس کی کوئی منزل ہوگی لیکن اس ٹیکسی ڈرائیور کی کوئی منزل نہیں تھی جو ہمیشہ دوسروں کو منزلوں تک پہنچاتا آیا تھا۔

○☆○
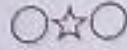
فرزانہ میز پر کہنیاں ٹیکے' دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس گہرا سناٹا تھا لیکن وہ اپنے اندر کے شور کو سن رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو آ کر پوچھ رہے تھے' بہہ جانا چاہیے یا تھم جانا چاہیے؟

وہ جانے والے جانی کو نہ روک سکی۔ بہنے والے آنسوؤں کو کیا روک سکتی تھی۔ وقت رخصت یہ آنسو بہتے تو جانی کے سامنے زبان بن جاتے' وہ کچھ نہ بولتی۔ آنسو بولتے "رک جاؤ۔"

وہ آنسو بھیگا ہوا رومال بن جاتے۔ آنکھوں کی دہلیز پر لہراتے تو جانی کے پاؤں میں زنجیر پڑ جاتی۔ وہ تو خود اسیر ہونے آیا تھا۔ اپنے بچے کو سسرال والوں سے چھین کر رخسانہ سے رشتہ توڑنے کے لیے آیا تھا۔ اگر وہ بچے کو گود میں لے لیتی' جانی کو سہارا دیتی تو رخسانہ کی خوش قسمتی اس کے گھر چلی آتی اور اس کی بدقسمتی رخسانہ کے گھر پہنچ جاتی۔

ایسا کرنے میں کیا حرج تھا؟ وہ خود جانی کو اپنے پاس نہیں بلا رہی تھی۔ رخسانہ نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی خود ماری تھی۔ اپنے مرد کا اعتماد کھویا تھا اور بدقسمتی کی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ وہ تو اسے طلاق دینے پر' اسے چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ بس ایک اس کے ہاں کہنے کی دیر تھی۔ اس نے ہاں کہنے میں دیر کر دی۔ وہ بچے کو لے کر چلا گیا۔

وہ ایسے گیا جیسے اندر سے روح کھینچ کر لے گیا ہو۔ بے جان کر گیا ہو۔ وہ گھنٹے بھر سے اسی جگہ بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ ہلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ سانس بھاری لگ رہی تھی۔ بیچ در بیچ محبت جینے پر مجبور کر رہی تھی۔ ورنہ جانی کو چھوڑا ہے تو سانس بھی چھوڑ دیتی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک گئی۔ سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ دل دھڑک دھڑک کر کہنے لگا وہ پھر آ گیا ہے۔ گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا۔ وہ وقت کو دہرانے آیا ہے کہ شاید اس کی محبوبہ کا فیصلہ بدل جائے۔

پھر دستک سنائی دی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ آگے بڑھنے لگی تو پاؤں کانپنے لگے۔

اندر ہی اندر فیصلہ کپکپا رہا تھا "میں جانی کی بات مان لوں تو دنیا میرا کیا بگاڑ لے گی؟ سارا قصور رخسانہ کا ہے۔ اس نے اسے پا کر کھو دیا۔ میں اسے کھو کر پا رہی ہوں۔"

وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی' انکار میں آپ ہی آپ سر ہلاتے ہوئے سوچنے لگی "نہیں' میں دنیا کی عدالت میں جانی کو جیت سکتی ہوں۔ رخسانہ کا کیس بہت کمزور ہو گیا ہے۔ ضمیر کی عدالت میں جیت نہیں سکتی۔ رخسانہ نے انسانوں جیسی غلطیاں کی ہیں۔ دوسرے انسان کو اسے معاف کرنا چاہیے۔ اس کے گھر کو آباد رکھنا میرا فرض ہے۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

وہ منہ اٹھا کر کہنا چاہتی تھی "جانی واپس چلے جاؤ' بچے کو اس کی نانی کے پاس پہنچا دو۔"

لیکن وہ کچھ بول نہ سکی۔ دروازے کے دوسری طرف سے رخسانہ کی امی کی آواز سنائی دی "بیٹی دروازہ کھولو۔ میں ہوں۔ رخسانہ کی ماں۔"

اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر چٹخنی گرا دی۔ دروازہ کھل گیا۔ بیگم اور فرید احمد کو دیکھتے ہی اس نے سلام کیا۔ وہ جواب میں دعائیں دیتے ہوئے اندر آئے۔ فرید احمد نے دروازہ بند کیا۔ بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا جانی یہاں آیا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"بچے کو لایا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"کہاں ہے بیٹی اسے مجھ سے نہ چھپاؤ۔ مجھے میرے نواسے کے پاس پہنچا دو۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

وہ جواب سنے بغیر بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ ادھر ادھر دیکھا پھر اندرونی دروازے کو کھول کر جھانکا۔ فرزانہ نے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ کھڑی رہی۔ فرید احمد نے کہا "بیٹی! مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گی؟"

"انکل آپ ہی لوگوں کا گھر ہے۔ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ بغیر اجازت میرے گھر کی تلاشی لینے چلی گئی ہیں۔ آپ کا جی چاہے تو ان کا ساتھ دے سکتے ہیں۔"

انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا پھر کہا "تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچہ یہاں نہیں ہے۔"

کمرے کے اندر سے بیگم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کامی کامی کہہ کر پکارتی جا رہی تھیں۔ فرید احمد نے کہا "یہ پاگل ہو جائے گی۔ نواسے کے بغیر مر جائے گی۔"

فرزانہ نے سرد لہجے میں کہا "کچھ لوگ چیخ چیخ کر مرتے ہیں۔ کچھ آواز بھی نہیں نکال سکتے۔"

فرید احمد نے ندامت سے سر جھکا کر کہا "میں تمہاری باتوں کو سمجھتا ہوں۔"

بیگم بڑبڑاتے ہوئے آ گئیں "ہائے بیٹی! کامی تو کہیں نہیں ہے۔ کیا تم مذاق کر رہی ہو؟"

"خالہ جان! مذاق تو آپ کر رہی ہیں۔ آپ نے کامی سے میرا کون سا رشتہ جوڑا ہے کہ میں اسے یہاں رکھ لیتی۔ محلے والوں کو کیا جواب دیتی۔"

"اے تو مجھے پہلے روک لیا ہوتا۔ خواہ مخواہ اندر جا کر ڈھونڈ رہی تھی۔"

"آپ کو روکنا مناسب نہیں تھا۔ آپ سے بہت پہلے ایک بار آپ کی بیٹی جانی کو یہاں تلاش کرتے ہوئے آئی تھی۔ اس نے بھی اسی طرح گھر کی تلاشی لی تھی۔ میں آپ لوگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔ میرے کہنے کے باوجود آپ کو بھی یقین نہ آتا۔ اس لیے میں نے اندر جانے دیا۔ اب تسلی ہو گئی۔"

"خوب جلی کٹی سنا لو میں سن لوں گی۔ آج ہماری بیٹی کی طرح ہمارا داماد بھی تعلیم یافتہ ہوتا تو ہمارے نصیب یوں نہ پھوٹتے۔"

فرزانہ نے چیخ کر کہا "تعجب ہے خالہ جان! اب بھی آپ کو اپنی غلطیوں کا احساس نہیں ہوا۔ جانی کو الزام دے رہی ہیں۔ کیا کیا ہے اس نے؟ کیا اس نے کبھی آپ لوگوں کو دھوکا دیا ہے؟ کیا وہ آپ کی بیٹی کو چھوڑ کر دوسری شادی کر رہا ہے؟ کیا وہ آپ کے بچے کو لے کر جا کر کسی سوکن کی گود میں ڈال رہا ہے؟ اس نے کیا کیا اور آپ لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔"

فرید احمد نے کہا "بیٹی! تم کتنا ہی احساس دلاؤ' ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ جن کے ذہنوں پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ ان تالوں کو تقدیر کی ٹھوکریں بھی نہیں کھول سکتیں۔"

اللہ تعالیٰ ہی کھولے تو کھولے۔"

پھر انہوں نے بیگم سے کہا "میں راستے بھر تمہیں سمجھاتا آیا ہوں کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔ اپنے نواسے کو حاصل کرنے کے لیے نرمی سے باتیں کرنا چاہیے۔ جانی کو الزام نہیں دینا چاہیے۔ اب میں یہ باتیں فرزانہ کے سامنے ہی تمہیں سمجھا رہا ہوں۔"

وہ جلدی سے نرم پڑ گئیں۔ اچانک ہی مسکرائیں پھر آگے بڑھ کر فرزانہ کا ہاتھ تھام کر بولیں "میری تو مت ماری گئی ہے۔ میں آگے پیچھے کچھ نہیں سوچتی جو زبان پر آتا ہے، بولتی جاتی ہوں۔ مجھ بڑھیا کو پاگل دیوانی سمجھ کر معاف کردو۔ میرا نواسا کیا گیا ہے، میری عقل ہی چلی گئی ہے۔"

"آپ کی عقل کام نہیں کرتی ہے تو دوسروں کے مشوروں پر عمل کریں۔ آپ لوگوں نے جو زیادتیاں جانی کے ساتھ کی ہیں، اس کا حساب کریں۔ اس پر نادم ہوں اور اس ندامت کا اظہار جانی کے سامنے بھی کریں۔ وہ بہت اچھے دل کا مالک ہے، آپ کے نواسے کو پھر آپ کی گود میں لا کر رکھ دے گا۔"

"جو کہو گی، وہی کروں گی۔ تم میرے ساتھ جانی کے پاس چلو اور ہماری طرف سے صفائی پیش کرو۔ میں تمہارے سامنے اس سے معافی مانگوں گی۔ ہم اسے بتائیں گے کہ رخسانہ نے اسے دھوکا نہیں دیا ہے۔ یہ سب کچھ میری حماقتوں سے ہوا ہے۔"

"میرا جانی سے سمجھنے اور سمجھانے کا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن میں اپنی بدنامی کے داغ کو دھونے جاؤں گی۔ ذرا ٹھہریے میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔"

وہ کمرے میں آئی۔ الماری کھول کر اپنے لیے لباس کا انتخاب کرنے لگی۔ ایسے وقت دماغ میں بات آئی کہ موسم کے مطابق شوخ رنگ کا کوئی لباس پہنے گی تو بیگم اور فرید احمد کی نظروں میں جانی کو لبھانے والی کوئی چیز بن جائے گی۔ وہ الماری کے تمام کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ جتنے لباس تھے، سب ہی پسندیدہ تھے۔ اسی لیے تو سلوائے گئے تھے۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس میں وہ کمتر نظر آتی۔

گھر سے نکلنے کے لیے منہ ہاتھ دھونا اور کنگھی چوٹی کرنا بھی لازمی تھا لیکن سادگی سے بننا سنورنا بھی نگاہوں میں کھٹکنے لگتا۔ اس نے سوچا، کیوں نہ اسی حال میں چلے۔ کسی کو کیا دکھانا ہے۔

اس نے آئینے کے سامنے آکر خود کو دیکھا۔ اس کا لباس کہیں کہیں سے شکن آلود تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں اداسیوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ چہرہ اگرچہ جانی کی طرف سے کوئی چغلی نہیں کھاتا تھا تاہم اس چہرے پر محرومیاں صاف پڑھی جاتی تھیں۔

اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ کیا مصیبت ہے۔ جانی دیکھے گا تو یہی سمجھے گا کہ محبت اور محرومیوں نے میرا یہ حال بنا رکھا ہے۔

وہ پریشان ہو کر کبھی الماری کو، کبھی آئینے کو، کبھی اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے۔ دنیا والوں کو کسی طرح قرار نہیں تھا۔ ہر طرح وہ بدنام ہوتی یا جانی کے دل میں خوش فہمی پیدا کر دیتی۔ آخر تھک ہار کر اس نے سوچا جو ہوتا ہے ہوتا رہے۔ دنیا والوں سے ڈرتے رہنے سے دنیا اور ڈراتی ہے۔ جب میرا دل صاف ہے تو میں کسی سے نہیں ڈروں گی۔

اس نے الماری کھولی۔ ایک جوڑا نکالا پھر باتھ روم میں چلی گئی۔ ڈسپنسری میں وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیگم بے چینی سے اندرونی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ کبھی اٹھ کر ٹہل رہی تھیں پھر وہ فرید احمد کے پاس آکر بیٹھ گئیں اور دھیرے سے کہنے لگیں۔ "دیکھ لینا، جانی کے پاس جا رہی ہے، خوب بن سنور کر نکلے گی۔"

فرید احمد نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "بیگم! تمہیں خدا کا واسطہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔"

"اے جب دیکھو زبان قابو میں رکھنے کی بات کرتے ہو۔ کیا زبان کاٹ کر پھینک دوں۔ کہنے والی باتیں بھی نہ کہوں۔ سانچ کو آنچ کیا ہے۔ ابھی وہ آتی ہوگی۔ خود دیکھ لینا۔"

پھر انہوں نے دیکھا اندرونی کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آئی۔ ہلکے گلابی رنگ کے شلوار سوٹ میں اس کی گوری رنگت گلاب کی طرح کھل رہی تھی۔ وہ بدستور سنجیدہ تھی مگر چہرہ میک اپ کے بغیر ہی مسکراتا ہوا لگ رہا تھا۔ سیاہ زلفیں کھلی ہوئی تھیں۔ کچھ شانے پر بکھری ہوئی تھیں۔ ان سیاہ بالوں کو دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ وہ سیدھے جانی پر جا کر ہی برسیں گے۔

بیگم کا دل ڈوبنے لگا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ فرزانہ نے آگے بڑھ کر

دروازے کو کھولا۔ سامنے ایک خوش پوش اسمارٹ سا نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ وہ اسے سر سے پاؤں تک ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے حیرت اور مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ فرزانہ نے اسے چند لمحوں تک سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔

"کیا تم جشید ہو؟"

وہ مسکرا کر بولا "بھئی خوب پہچانا۔ میں تو سمجھ رہا تھا تم نے مجھے بھلا دیا ہوگا۔ مجھے بھی دیکھو لندن سے تمہارے پاس چلا آرہا ہوں۔ رخسانہ نے تمہارا پتا دیا تھا۔ یہاں آکر بہت دیر سے بھٹک رہا ہوں۔ لوگوں سے پوچھ رہا ہوں۔ کوئی مجھے ادھر بھٹکا دیتا ہے کوئی ادھر بھٹکا دیتا ہے۔ بہرحال تمہارے دروازے پر کھڑا ہوں۔ کیا دروازے سے ہی واپس چلا جاؤں؟"

وہ ایک طرف ہٹ کر بولی "اندر آجاؤ۔ یہاں رخسانہ کی امی اور ابو بیٹھے ہوئے ہیں۔"

وہ خوش مزاجی سے نعرے لگانے کے انداز میں اندر آیا۔ "او مائی ڈیئر آنٹی اینڈ انکل! میں آپ لوگوں کو بتانا بھول گیا۔ ادھر آپ کے مسٹر جانی نے ایسا ہنگامہ کیا تھا کہ کچھ یاد نہیں رہا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ رخسانہ نے مجھے فرزانہ کا پتا دیا تھا۔ جانتی ہیں کیوں۔ فرزانہ کے لیے وہاں ایک بہت ہی عمدہ ملازمت کا بندوبست ہوگیا ہے۔ بہت اچھی تنخواہ ہے اور رہنے سہنے کا بھی معقول انتظام ہے۔"

پھر اس نے فرزانہ کی طرف پلٹ کر کہا "فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارا پاسپورٹ بنوا دوں گا۔"

"جشید! تم ہوش میں تو ہو؟"

جشید نے حیرانی سے پوچھا "کیا ہوا؟"

"کیا تم مجھے کوئی گری پڑی چیز سمجھتے ہو کہ یہاں آکر مجھے اٹھایا اور وہاں پہنچا دیا؟ میرا اپنا کوئی فیصلہ نہیں ہے؟ میری اپنی کوئی مرضی نہیں ہے؟ تم نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتی ہوں؟"

"سو سوری فرزانہ دراصل رخسانہ نے مجھ سے کہا تھا کہ تم وہاں ملازمت کرنا چاہتی ہو۔ جب میں یہ خوش خبری سناؤں گا تو تم فوراً وہاں چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ گی۔"

"بے شک میں یہی چاہتی تھی لیکن ہم کل جو چاہتے تھے آج نہیں چاہتے اور جو آج چاہتے ہیں وہ کل نہیں چاہیں گے۔ انسان کی مرضی اور اس کے ارادے بدلتے رہتے ہیں۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں بولا "تم دونوں سہیلیاں کالج میں بھی تیز تھیں۔ کوئی باتوں میں جیت نہیں سکتا تھا۔ میں آج بھی ہار مانتا ہوں بھئی آئندہ سوچ سمجھ کر بولوں گا۔"

بیگم نے کہا "بیٹے! تم نے دیکھا ہے جانی ہمارے ساتھ کیسی بدتمیزی کر رہا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد وہ بچے کو ہم سے چھین کر لے گیا ہے۔"

فرزانہ نے انہیں گھور کر دیکھا۔ جشید نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا "ایک ٹیکسی ڈرائیور سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔"

فرزانہ نے کہا "خالہ جان بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ پھر جانی کے خلاف بول رہی ہیں۔ اپنے داماد کی توہین کرنے کا موقع دوسرے کو بھی دے رہی ہیں اور مسٹر جشید! میں تم سے پوچھتی ہوں۔ اگر تمہاری بیوی ایک بار جھوٹ بول کر دوسری بار جھوٹ بولتی۔ ایک بار دھوکا دے کر دوسری بار دھوکا دیتی اور تم سے ہزاروں میل دور تمہارے جیسے کسی نوجوان کے پاس جاکر رہتی تو اس وقت تم کیا کرتے؟ میرا جواب یہ ہے کہ تم بھی ٹیکسی ڈرائیور بن کر سوچتا اور بولنا شروع کر دیتے۔ کچھ بولا کرو تو سوچ سمجھ کر بولا کرو۔"

فرید احمد نے کہا "بیٹی جانے بھی دو۔ جو سوتا ہے وہ سوتا ہی رہے گا۔ ہمیں یہاں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے فوراً جانی کے پاس چلنا چاہیے۔"

جشید نے اپنے ایک کان کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "میں کان پکڑتا ہوں۔ آئندہ بہت ہی سوچ سمجھ کر بولا کروں گا اور ابھی تمہارے ساتھ چل کر جانی کی حمایت کروں گا۔ بے شک اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ باہر میری گاڑی کھڑی ہے آؤ چلیں۔"

وہ سب باہر آگئے۔ فرزانہ نے دروازے پر تالا لگایا پھر بیگم کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ فرید احمد نے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا "جانی غصے میں تھا لیکن بچے کو نہیں لے جانا چاہیے تھا۔ وہ ماں کی اور نانی کی گود کو پہچانتا ہے۔ اس وقت رو رہا ہوگا۔"

جشید نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے عقب نما آئینے میں فرزانہ کو دیکھا پھر اس کے مزاج کو سمجھتے ہوئے کہا "انکل آج کل جسے غصہ دلایا جائے گا اور جس پر ظلم کیا جائے

گا وہ کسی کو قتل نہ کرے، کسی کو گالی نہ دے لیکن اپنے بچے کو انتقاماً چھین کر تو لے جا سکتا ہے۔"

بیگم نے کہا "وہ ہماری کمزوری کو پا گیا ہے۔ بچہ کسی طرح بھی مجھے مل جائے۔ ہمیشہ کے لیے ہمارا ہو جائے تو میں جانی کے نام پر خاک ڈالوں۔ میری بیٹی کے لیے کیا رشتوں کی کمی ہے۔ جانے وہ کتنی حسین بن کر آئے گی۔ اس کے ساتھ ایسے داماد کا نام لیتے ہوئے شرم آئے گی۔"

فرزانہ نے ناگواری سے کہا "جمشید! گاڑی روکو، مجھے جانے دو۔ میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔ یہ خالہ جان اپنی بیٹی کو طلاق دلوا کر ہی رہیں گی۔"

جمشید نے بدستور ڈرائیو کرتے ہوئے کہا "نہیں فرزانہ! آنٹی کہتی ہیں تو کہنے دو۔ ہمیں وہاں چلنا ہی ہوگا۔ رخسانہ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ اگر ہم دونوں میاں بیوی کے درمیان صلح کرادیں تو یہ بڑی نیکی ہوگی۔"

"میں پہلے بھی ایسی نیکیاں کر چکی ہوں۔ میری نیکی کے باعث رخسانہ سہاگن بنی، اس کا نتیجہ ابھی تک بھگت رہی ہوں۔ دوسری نیکی کرنے جاؤں گی تو یقین کرو، یہ بدنامی میرے سر آئے گی کہ جانی نے میری وجہ سے رخسانہ کو طلاق دے دی۔ کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ ایک ماں خود اپنی بیٹی کی دشمن بن گئی ہے۔"

فرید احمد نے کہا "میں اور جمشید اس بات کے گواہ ہیں کہ بات کس کی طرف سے بگڑتی جارہی ہے۔ کوئی تمہیں بدنام نہیں کرے گا۔ ہمیں وہاں چلنا چاہیے بلکہ بیگم کو گاڑی سے اتار دیا جائے۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولیں "بڑے آئے گاڑی سے اتارنے والے۔ میں اپنے نواسے کے پاس ضرور جاؤں گی۔ اسے کسی نہ کسی طرح لے کر آؤں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے جانی کے قدموں میں کیوں نہ گرنا پڑے۔"

فرزانہ نے کہا "خالہ جان! آپ سمجھ میں نہیں آتیں۔ کبھی تو جانی کو اتنا برا کہتی ہیں، اتنا نظروں سے گرا دیتی ہیں جیسے وہ انسان ہی نہ ہو اور کبھی اس کے قدموں میں خود گرنا چاہتی ہیں۔"

"بیٹی! یہ مینٹل کیس ہے تم انہیں نظرانداز کردو۔"

وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے جانی کے مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ گاڑی سے اتر کر احاطے میں داخل ہوئے پھر دروازے کے پاس آ کر دیکھا تو تالا لگا ہوا تھا۔ بیگم نے کہا "معلوم ہوتا ہے وہ بچے کو لے کر ادھر نہیں آیا ہے۔"

فرید احمد نے سوچتے ہوئے کہا "پھر وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

جمشید نے کہا "بھئی یہ اس کا گھر ہے۔ کہیں بھی جائے گا لیکن یہیں آئے گا، پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔"

بیگم نے کہا "پریشان ہونے کی بات کیسے نہیں ہے۔ جانی باپ سہی مگر بچے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کب دودھ کے لیے، کب سونے کے لیے اور کب گود میں کھیلنے کے لیے روتا ہے۔ اب تو وہ روتا ہی رہے گا۔"

فرزانہ نے کہا "آپ نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ اب تو وہ روتا ہی رہے گا۔ اپنے بڑوں کی غلطیوں پر۔"

"اے تم تو بولے جارہی ہو۔ بولے ہی جارہی ہو۔ طعنے کے سوا کوئی دوسری بات نہیں کر سکتیں۔ سچ سچ بولو۔ کیا جانی تمہارے پاس بچے کو لے کر نہیں آیا تھا۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ وہ آئے تھے میں نے بچے کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کردیا۔ وہ غصے میں چلے گئے۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولیں "اے ہے، کیا باتیں بنا رہی ہو۔ کیا سچ بولتے ہوئے منہ میں آگ لگتی ہے۔ تم نے اسے سکھایا پڑھایا ہے کہ وہ بچے کو لے کر کہیں چھپا دے پھر تم سے آکر شادی کرے اس کے بعد بچہ تمہارا اور اس کا اور میری بیٹی منہ دیکھتی رہ جائے۔"

فرزانہ مٹھیاں بھینچ کر، دانت پر دانت جما کر غصے کو برداشت کر رہی تھی۔ جی چاہتا تھا، جو منہ میں آئے بولتی چلی جائے، خوب باتیں سنائے لیکن کیسے سنائے، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سامنے ایک بزرگ خاتون تھیں اور ابر، کی امی سے ان کا اچھا تعلق رہا تھا۔ وہ اچھے پڑوسی رہے تھے۔ ان کی بیٹی ایک اچھی سہیلی رہی تھی۔ ان کے لیے اس نے بہت دکھ اٹھائے تھے اور ان کی خاطر دکھ اٹھا کر خوشی بھی محسوس کی تھی۔ اب وہ کس منہ سے انہیں باتیں سنائے۔ جب وہ کچھ نہ کر سکی تو بے اختیار رونے لگی۔

فرید احمد نے غصے سے کہا "بیگم لعنت ہے تم پر۔ میں نے تمہاری جیسی جاہل عورت

اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولیں "میں نے بھی آپ جیسا تھالی کا بینگن کہیں نہیں دیکھا' اب تک میری ہاں میں ہاں ملاتے رہے' اب اس چھوکری کی حمایت کر رہے ہیں۔ میری محبت کو تو کوئی سمجھتا ہی نہیں ہے۔ میں نواسے کے لیے مری جا رہی ہوں اور مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ کیا اکیلے میں نے ہی گھر بگاڑا ہے؟ اس میں جانی کا یا کسی اور کا کوئی قصور نہیں ہے؟ یہ اوپر سے رو رو کر تم لوگوں کے دلوں کو موم کر رہی ہے۔ ذرا اسے تو پوچھو' یہ بن سنور کر کسے دکھانے آئی ہے۔"

فرزانہ ایک دم سے پلٹ گئی۔ تیزی سے واپس جانے لگی۔ جمشید اس کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا "رک جاؤ! میں سمجھ رہا ہوں۔ آنٹی کی زیادتی ہے۔ ان کی باتیں ناقابل برداشت ہیں۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔ میں تمہیں پہنچا دوں گا۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے جا رہی تھی۔ نہ سن رہی تھی۔ نہ جواب دے رہی تھی۔ جمشید اس کی خوشامدیں کرنے لگا۔ "دیکھو فرزانہ! میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنے آیا ہوں لیکن یہ آنٹی اور انکل درمیان میں آ گئے۔ رخسانہ نے تمہارے متعلق بہت کچھ کہا ہے' مجھے تنہائی میں تھوڑا سا موقع دو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آؤ میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی "مجھے مجبور نہ کرو۔ میرا پیچھا نہ کرو۔ چلے جاؤ۔ میں اکیلی گھر چلی جاؤں گی۔"

"فرزانہ! اس طرح بات نہیں بنتی۔ تم اتنی سمجھ دار ہو مگر ایک بات نہیں سمجھ رہی ہو کہ آخر ساری بدنامیاں تم پر کیوں آتی ہیں؟"

وہ غصے سے بولی "کیوں آتی ہیں؟"

"ہم یہ بات سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر نہیں کر سکتے۔ میری گاڑی ہے۔ آؤ بیٹھو۔ ہم اطمینان سے باتیں کرتے ہوئے جائیں گے۔ اچھا ٹھہرو۔ وہاں جاؤ گی تو آنٹی پھر الٹی سیدھی باتیں کریں گی' میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔ دیکھو جانا نہیں' میں ابھی آیا۔"

وہ دوڑتا ہوا واپس مکان کے احاطے کے پاس آیا پھر گاڑی میں بیٹھ کر اسے واپس موڑ کر ڈرائیو کرتا ہوا فرزانہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں گاڑی روک کر اگلی سیٹ کا دروازہ

کھولا۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بیٹھ گئی۔ دروازے کو بند کر لیا پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔

تھوڑا فاصلہ خاموشی سے طے ہوا پھر جمشید نے کہا "رخسانہ نے مجھے بتایا ہے کہ شادی کیسے ہوئی۔ چہرہ تمہارا دکھایا گیا' دلہن اسے بنایا گیا۔ ان حالات میں اگر جانی تمہارے پیچھے بھاگتا ہے اور اگر تم جانی سے متاثر ہو گئی ہو تو یہ ایک قدرتی بات ہے۔ کیا میں تمہارے متعلق ایک ذاتی سوال کروں؟"

فرزانہ نے اسے دیکھا پھر پوچھا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ میں جانی سے محض متاثر ہوں یا محبت کرتی ہوں؟"

"کمال ہے۔ میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"اس میں کمال کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب سے رخسانہ کی شادی ہوئی ہے۔ جب سے جانی میرے پیچھے دوڑ رہے ہیں' تب ہی سے رخسانہ' اس کے والدین میرے سکھر والے رشتے دار یہاں تک کہ میری امی مرحومہ بھی یہی کہتی تھیں کہ میں جانی سے محبت کرتی ہوں۔"

"دنیا والوں کو رہنے دو۔ اپنی بات کہو۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار خلا میں کسی کو دیکھتی رہی پھر اس کی آواز جیسے دور' بہت دور سے آئی "ہاں محبت کرتی ہوں۔"

"مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اتنی صاف گوئی سے اعتراف کرو گی۔"

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ میں کوئی جرم نہیں کر رہی ہوں۔ محبت کے معنی اگر یہ ہیں کہ میں کسی کو کسی سے چھین لینا چاہتی ہوں تو یہ محبت نہیں حماقت ہے' محبت تو اسے کہتے ہیں کہ جسے ہم چاہیں اس کے گھر کو آباد رکھیں۔ اسے بگڑنے سے بچا لیں۔"

"تم نے اسے بچانے کے لیے کیا کیا؟"

"جو میری سمجھ میں آیا۔ کرتی رہی' جانی سے دور بھاگتی رہی۔"

"اس طرح اس کی دیوانگی بڑھتی رہی۔"

"میں کیا کروں۔ دیوانگی جانی کی ہے' میری نہیں ہے۔"

"نفسیاتی طریقہ کار پر غور کرو تو جو چیز حاصل نہیں ہوتی' ہاتھ آتے آتے رہ جاتی ہے اس کے لیے انسان ہر عمر میں للچاتا ہے۔ فرزانہ فراخ دلی سے اپنی غلطی کا اعتراف کرو۔

تم جانی کے عشق کو ہوا دیتی رہی ہو۔"

وہ جھنجلا کر بولی "تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیا میں اپنی جان دے دیتی؟"

"ہرگز نہیں۔ سیدھا سا صاف راستہ تھا۔ تم شادی کر لیتیں۔"

"شادی کرنا میری مرضی' میری پسند کی بات ہے۔ کوئی دوسرا یہ مشورہ نہیں دے سکتا۔"

"بے شک کوئی تمہیں مشورہ نہ دے' یہ تمہارے سمجھنے کی بات ہے۔ کسی کا شوہر تمہارا دیوانہ بنتا جا رہا ہے۔ اس کی دیوانگی بڑھتی جا رہی ہے تو کیا تم کسی کو پسند نہیں کر سکتی تھیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تمہارا جیون ساتھی بن سکے؟"

"مجھے جیون ساتھی کا ارمان نہیں ہے۔"

"کیا تم پورے سماجی شعور سے یہ بات کہہ رہی ہو' کیا ایسا کہتے وقت سمجھ رہی ہو کہ تمہاری جیسی نوجوان خوب صورت لڑکی تنہا زندگی گزارے جس کا آگے پیچھے کوئی رشتے دار نہ ہو۔ کوئی بزرگ نہ ہو تو دنیا والے اس پر کس طرح انگلی اٹھاتے ہیں۔ محلے پڑوس والے کیسی باتیں بناتے ہیں پھر یہ کہ رخسانہ کے گھر سے تمہاری بدنامی کا جو سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ وہ کب تک چلتا رہے گا۔ کیا تم نے اس کا حساب کیا ہے؟"

وہ خاموش رہی۔ کوئی جواب نہ دے سکی۔ جمشید نے کہا "تم دونوں سہیلیاں ذہین ہو لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو ذہین ہوں۔ وہ غلطیاں نہ کرتے ہوں ادھر رخسانہ کی غلطی ایک طرف ہے' تمہاری غلطی یہ ہے کہ رخسانہ کے لیے قربانی دینے کے باوجود اس کے شوہر کو اپنے پیچھے دوڑنے پر مجبور کرتی رہیں۔ اس نے اپنے شوہر کا ایک نفسیاتی تجزیہ کیا ہے جو بالکل درست معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جانی تم سے محبت نہیں کرتا بلکہ ضد کرتا ہے جو چیز اس کے ہاتھ آ کر چھین لی گئی ہے اس کے لیے ایک نادان بچے کی طرح مچل رہا ہے۔ اس نادان کو یہ یقین ہو جائے کہ تم پرائی ہو چکی ہو۔ کسی کی منکوحہ ہو تو وہ شریف آدمی پھر کبھی تمہاری طلب نہیں کرے گا۔"

"وہ دیوانہ ہے' دیوانگی سے باز نہیں آئے گا۔"

"ایک بیوی اپنے شوہر کو جتنی دور تک پہچانتی ہے' اتنی دور تک ایک محبوبہ پہچاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ جمشید نے کہا "یہ تو ایک الگ سی بات ہے کہ وہ دیوانہ باز آئے گا یا نہیں؟ اصل سوال یہ ہے کہ تم شادی کیوں نہیں کرتیں۔ اگر جیون ساتھی کے لیے کوئی اور پسند نہیں آتا ہے۔ اگر دلہن بننے کی خواہش نہیں ہے تو قربانی کے جذبے سے شادی کرو۔ ذرا غور کرو۔ تمہاری نیکیاں برباد ہو رہی ہیں اور بدنامیاں سر آ رہی ہیں۔"

جو بات سچی اور کھری ہوتی ہے' وہ دل پر اثر کرتی ہے اور انسان لاشعوری طور پر اسے مانتا ہے لیکن جس دل پر اثر کرتی ہے' وہ دل نہیں مانتا۔ فرزانہ چپ چاپ سن رہی تھی۔ اس میں اعتراف کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ جمشید نے کہا "ابھی تم نے کہا تھا کہ جس سے محبت کی جاتی ہے اس کے گھر کو بربادی سے بچایا جاتا ہے۔ تم اس کا عملی ثبوت دو۔ تمہاری شادی سے بہت سوں کی بگڑی بن جائے گی۔"

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی "مجھے پیاس لگ رہی ہے' گھر پہنچا دو۔"

جمشید نے ایک اسنیک بار کے سامنے گاڑی روک دی۔ ٹھنڈی بوتل لا کر اسے دی۔ "اسے پیو اور کچھ دیر میرے ساتھ رہو۔ میں اور بہت سی ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں بہت پریشان ہوں۔ اس مسئلے پر تمہارے ساتھ بحث نہیں کر سکوں گی۔"

"مسئلے سے فرار ہونے کی کوشش کی جائے تو وہ مسئلہ پہاڑ بنتا جاتا ہے۔ اسے حل کرنا چاہیے۔ آج فیصلہ کر لو کہ تمام پریشانیاں ختم ہوں گی یا پھر اسی طرح مسئلے کو روگ بنا کر پالتی رہو گی۔ آج کوئی فیصلہ ہو جائے۔"

وہ ٹھنڈا مشروب حلق سے اتارنے لگی۔ کلیجے میں ٹھنڈک پہنچ رہی تھی مگر دماغ جل رہا تھا۔ نیکی برباد ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جمشید بوتل واپس کر کے اپنی اسٹیرنگ سیٹ پر آیا پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ "میں جب کالج میں تھا اور تم دونوں سہیلیوں کو دیکھا کرتا تھا تو دوستوں میں شرط لگتی رہتی تھی۔ ہر لڑکا یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ تم میں سے کسی ایک کو اپنی طرف مائل کرے گا۔ میں بڑی بڑی شرطیں لگاتا تھا لیکن خود یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ تم دونوں میں کون بہتر ہے۔ کون مجھے پسند ہے' یہی وجہ ہے کہ جب میں نے گمنام محبوب بن کر خط لکھا تو تم میں سے کسی کو مخاطب نہیں کیا بلکہ تم دونوں کو الجھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ دور ہی دور سے تماشا دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ جو بھی میری

طرف مائل ہو گی' میں اسے اپنا لوں گا۔"

سامنے سرخ سگنل تھا۔ اس نے گاڑی روک دی پھر کہنے لگا "اس کے بعد وہ حادثہ پیش آیا۔ جب میری شرارت کی وجہ سے رخسانہ کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس وقت مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اس وقت مجھے رخسانہ سے محبت ہو گئی۔ میں نے سوچا' اچھا موقع ہے میں اپنی دولت کے ذریعے اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کراؤں گا اور اس کا دل جیت لوں گا۔"

سگنل سرخ سے پیلا ہو گیا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی پھر کہنے لگا۔ "رخسانہ رفتہ رفتہ میرے خواب و خیال میں بس گئی۔ میری ضد بن گئی۔ میں نے اس کے لیے وہاں کی تعلیم چھوڑ دی۔ پاپا کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے لیے لندن چلا گیا۔ دوستوں سے پھر شرط لگی تھی اور میں یہ دعویٰ کر کے گیا تھا کہ رخسانہ کو لندن بلاؤں گا۔ اس کا چہرہ بناؤں گا اور اس سے شادی کر کے دکھاؤں گا۔ میں نے پاپا کے سامنے ضد بھی کی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایک برس کے اندر حالات بدل جائیں گے۔ رخسانہ وہاں آئی تو میں نے اسے بن بیاہی سمجھ کر اپنانے کی کوشش کی۔ ایک بار نشے کی حالت میں شیطان بن گیا لیکن وہ بہت ذہین اور ہمت والی لڑکی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ اس کے بعد یہ بھید کھلا کہ وہ صرف شادی شدہ ہی نہیں ایک بچے کی ماں بھی ہے۔"

اس نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا "لیکن رخسانہ نے وہی غلطی کی جو تم نے جانی کے ساتھ کی۔ تم نے جانی کو اپنا چہرہ دکھایا اور اس کے لیے ایک چیلنج بن گئیں۔ رخسانہ نے خود کو بن بیاہی ظاہر کیا۔ میرے اعتماد سے کھیلا' مجھے بے وقوف بنایا۔ میرے سہارے آ کر پلاسٹک سرجری کے ذریعے خود کو مکمل کرنا چاہا۔ اس کا یہ رویہ' یہ مکر' یہ جھوٹ' یہ فریب میرے لیے ایک چیلنج بن گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کی کمزوری سے کھیل کر اس کے شوہر کو اپنی دولت سے خرید لوں گا یا پھر کوئی ایسا راستہ تلاش کروں گا کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کرنے پر مجبور ہو جائے۔"

وہ پھر ذرا دیر کے لیے چپ ہوا۔ اس کے بعد بولنے لگا "میں نے رخسانہ کو بتایا کہ میں پاکستان کچھ عرصے کے لیے جا رہا ہوں۔ تب اس نے مجھے تمہارے متعلق بتایا۔ اپنے شوہر کے متعلق بتایا۔ اپنی پوری داستان سنائی اور یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ تم نے شادی نہ کی

یا اس ملک کو نہ چھوڑا تو جانی ایک دن تمہیں تلاش کرلے گا اور ایک دن تمہیں حاصل کرلے گا۔"

"میں جانتی ہوں' رخسانہ میرے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتی ہے۔"

جمشید نے انکار میں سر ہلا کر کہا "ہو سکتا ہے کہ تم دونوں سہیلیاں آپس میں لڑتی ہو لیکن رخسانہ پیٹھ پیچھے کبھی برائی نہیں کرتی۔ کم از کم میرے سامنے ایسا نہیں کیا بلکہ تمہاری تعریفیں کی ہیں۔ بڑے اعتماد سے کہا کہ تم جانی سے دور رہنا چاہتی ہو۔ جانی ہی تمہارے پیچھے بھاگتا ہے۔ یہ سلسلہ ختم کرنے کے لیے ہم نے وہاں تمہاری ملازمت کا بندوبست کیا ہے۔ میں اس سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ تمہیں شادی پر راضی کروں گا یا لندن جا کر ملازمت کرنے کے لیے راضی کر لوں گا۔"

"اسی لیے تم اتنی دیر سے شادی کے لیے مجبور کر رہے ہو۔"

"کوئی برا تو نہیں کر رہا ہوں۔ آگے تو سنو کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟"

"میں سن رہی ہوں۔"

"جب رخسانہ نے ذکر کیا' تب مجھے یاد آیا کہ میں اسے حاصل کرنے کی ضد میں تمہیں بھلا چکا ہوں۔ جب کہ تم دونوں میں سے کسی ایک کو اپنانا چاہتا ہوں۔ بہر حال ابھی تمہارے دروازے پر آ کر میں نے تمہیں دیکھا تو اسی وقت دل نے کہا۔ تم میری بن جاؤ گی تو میں رخسانہ کو حاصل کرنے کی ضد چھوڑ دوں گا۔"

ایسا کہتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے فرزانہ کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی ہوئی ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔ جمشید نے کہا "مجھ میں کچھ برائی ہے۔ کچھ اچھائی ہے۔ جانی میں بھی کچھ برائی اور کچھ اچھائی ہو گی۔ کوئی بھی پورا کا پورا شیطان نہیں ہوتا اور پورا پورا انسان نہیں ہوتا۔ اگر شیطان ہوتا تو اسے راہ راست پر لایا جا سکتا ہے۔ تم میری شریک حیات بن کر مجھے بے جا ضد سے بچا سکتی ہو۔ جانی کو اپنے پیچھے بھاگنے سے باز رکھ سکتی ہو۔ تمہارے ایک فیصلے سے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔"

وہ بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی "جمشید' تم بہت اچھے ہو لیکن میں بہت اچھی نہیں ہوں۔ شادی کا موضوع ختم کرو۔"

"ہم سب کے مسائل کا حل شادی ہے۔ اگر تم میری شریک حیات نہیں بننا چاہتیں

"تو پھر جانی سے شادی کرلو۔"

فرزانہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے سرہلا کر کہا "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم جانی سے شادی کرلو گی تو میں رخسانہ کو اپنا لوں گا۔ دو میں سے کوئی ایک بات ہونی چاہیے۔ اگر تم نے مجھ سے شادی سے انکار کیا تو میں یہاں رخسانہ کے خلاف جانی کے دل میں ایسے شبہات پیدا کردوں گا جس کے بعد ان کے درمیان طلاق لازمی ہو جائے گی۔"

"تمہیں ایسی گری ہوئی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔"

"غصہ نہ دکھاؤ۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ جو گری ہوئی بات میں رخسانہ کے لیے کررہا ہوں، وہی گری ہوئی حرکتیں تم جانی کے ساتھ کررہی ہو۔ شادی نہ کرنا، کسی کے شوہر کو اپنے پیچھے لگائے رکھنا، کون سا شریفانہ طرز عمل ہے فرزانہ! کسی پر کیچڑ اچھالنا، کسی کی برائی دیکھ لینا بہت آسان ہے لیکن اپنے گریبان میں جھانک کر اپنی کمزوریوں کو سمجھنا اور اعتراف کرنا بڑے دل گردے کی بات ہوتی ہے۔ یہ حوصلہ اپنے اندر پیدا کرو۔"

"گاڑی روک دو۔ میں رکشے یا ٹیکسی میں چلی جاؤں گی۔"

"کیوں، حوصلہ نہیں ہے؟ میں آنٹی کو جاہل اور بدزبان سمجھ رہا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ جہاندیدہ خاتون ہیں۔ انہوں نے تم پر کیچڑ نہیں اچھالا بلکہ تمہاری حقیقت بیان کی اور تمہیں اس وقت رونا آگیا۔ میں گاڑی تمہارے گھر کی طرف لے جارہا ہوں۔ چپ چاپ بیٹھی رہو اور اگر اترنا چاہو تو اس سے پہلے اعتراف کرو کہ تم جانی کو دانستہ دیوانہ بنارہی ہو۔ رخسانہ پر ثابت کررہی ہو کہ اس کا شوہر ساری عمر تمہارے پیچھے بھاگتا رہے گا۔ اور تم اسے بھگاتی رہو گی۔ تم ایک ذہنی مریضہ ہو۔ دوسرے کو مسائل میں الجھا الجھا کر غیر شعوری طور پر خوشیاں حاصل کرتی ہو۔"

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔ اس وقت گاڑی پاپوش کے علاقے سے گزر رہی تھی۔ بے شمار لوگ آجارہے تھے۔ اس نے کہا "میں تمہارے ساتھ اپنے گھر تک نہیں جاؤں گی۔ محلے والے باتیں بنائیں گے۔ وہاں سامنے بس اسٹاپ پر روک دو۔"

جمشید نے گاڑی آگے لے جاکر روک دی اور پھر کہا "تم نے میری باتوں کا کوئی

جواب نہیں دیا۔"

اس نے جواب دیا "کسی عورت کو یقین ہو جائے کہ کوئی مرد اسے دیوانہ وار چاہتا ہے اور اس کی مٹھی میں ہے تو اس عورت کو دنیا جہاں کی خوشیاں مل جاتی ہیں۔ میں بھی شاید یہ خوشی حاصل کرتی ہوں لیکن جب تک وہ میری مٹھی میں ہے، اس وقت تم اسے رخسانہ کے خلاف بھڑکا نہیں سکو گے۔ بہکا نہیں سکو گے۔ اسے طلاق نہیں دلا سکو گے۔ میں رخسانہ کی حفاظت کروں گی۔ اب اس کے سہاگ کی سلامتی اس بات میں ہے کہ جانی دیوانہ وار میری بات پر اعتماد کرے اور رخسانہ کو معاف کردے اور وہ ایسا کرے گا۔"

یہ کہتے ہوئے فرزانہ نے دروازے کو کھولا۔ گاڑی سے باہر جانے کے لیے ایک قدم نکالا پھر رک کر بولی "اس مسئلے کا حل شادی نہیں ہے۔ کیونکہ مرد کی ہوس کہیں جاکر نہیں رکتی۔ رخسانہ شادی شدہ ہے مگر تمہاری ہوس یہاں تک اس کے لیے جال بچھانے آگئی ہے پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میرے شادی کرنے کے بعد جانی میرا پیچھا چھوڑ دے گا؟ جمشید! شادی پرابلم نہیں ہے۔ تم لوگوں کی ہوس پرابلم ہے۔ ایک لڑکی کسی کی بیوی بن جاتی ہے، کسی بچے کی ماں بن جاتی ہے، اس کے باوجود تم لوگ اسے حاصل کرنے کے لیے شرطیں لگاتے ہو۔ کیسے ہو تم لوگ؟ بہتر ہے کہ تم کسی کو اپنی شریک حیات نہ بناؤ، اگر بناؤ تو پہلے ہوس کے بازار میں حساب لگاؤ کہ تمہاری بیوی اور تمہارے ہونے والے بچے کی ماں پر کتنے لوگ شرطیں لگارہے ہیں۔ شاید تمہیں شرم آجائے۔"

اس نے کار سے باہر نکل کر دروازے کو زوردار آواز کے ساتھ بند کردیا۔ قریب ہی ایک منی بس کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں جاکر بیٹھ گئی۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ اپنے کلینک کے دروازے پر پہنچ کر تالا کھول رہی تھی۔ اس وقت کمپاؤنڈر نے آکر کہا "باجی! آپ کا خط آیا ہے۔ ڈاکیا واپس جارہا تھا۔ میں نے وصول کرلیا۔"

فرزانہ نے لفافے کو دیکھا۔ اس پر ایک طرف رخسانہ کا لندن کا پتا لکھا ہوا تھا۔ وہ ڈسپنسری میں آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ لفافے کو چاک کرکے اس میں سے ایک تہ کیے ہوئے کاغذ کو نکالا پھر اسے کھول کر دیکھا۔ رخسانہ کی جانی پہچانی تحریر تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

"میری پیاری اور بہت پیاری بہن!

یہ خط لکھتے ہوئے مجھے خوشی بھی ہو رہی ہے اور شرمندگی بھی۔ شرمندگی اس لیے کہ تم سے بہت لڑتی ہوں اور خوشی اس لیے کہ لڑنے کے باوجود تمہاری چاہت ایک خوشبو کی طرح میرے چار سو پھیلی رہتی ہے کیونکہ میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتی ہوں۔ یہاں ہزاروں میل دور آکر مجھے احساس ہوا کہ میں نے تم پر بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ تم پر خواہ مخواہ الزامات لگائے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب ہم اپنے محاذ سے ہٹ جاتے ہیں اور دور بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ ہمارے گھر میں دشمن ہی دشمن ہیں اور ہماری ایک عزیز ترین چیز چرا کر لے جائیں گے تو پھر ہمیں بے بسی اور دشمنوں کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے وقت دشمنوں کی خامیوں کے ساتھ خوبیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ یہی حال میرا ہوا۔ یہاں آکر میں نے ٹھنڈے دماغ سے تمہارے متعلق سوچنا شروع کیا تو میرے دل میں الہام کی طرح یہ یقین اترا کہ تم محبت، خلوص اور ایثار کا مجسمہ ہو۔ اس سے زیادہ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گی۔ مبادا تم اسے خوشامد نہ سمجھ لو۔

فرزانہ تم نے مجھے بہت اچھا مشورہ دیا تھا کہ میں بن بیاہی بن کر اپنے گھر سے نہ نکلوں۔ میں نے تمہاری بات نہیں مانی، مجھے امی کا مشورہ محبت سے لبریز اور پر خلوص نظر آیا۔ تم مجھے دشمن دکھائی دیں اور میں یہ غلطی کر بیٹھی۔ اس کا نتیجہ جو مجھے ملا ہے، اسے میں جانتی ہوں اور خدا جانتا ہے۔ میں بار بار توبہ کرتی ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ عورتوں کو کم از کم ایسی کم عقلی سے محفوظ رکھے۔

میں نے جمشید اور اس کے پاپا کو بتا دیا ہے کہ میں جانی کی بیوی اور ایک بچے کی ماں ہوں۔ کئی بار دل میں خیال آیا کہ خط کے ذریعے جانی کو بھی صاف صاف لکھ دوں اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگوں پھر سوچا خط لکھنے میں وہ بات نہیں ہوگی جتنا کہ روبرو جانی کو قائل کر سکوں گی۔ وہ روٹھیں گے تو انہیں منا سکوں گی۔ یہ سوچ کر میں نے ان سے اب تک یہ بات چھپا رکھی ہے۔

جمشید مجھ سے وعدہ کر کے گئے ہیں کہ حالات کو میرے موافق بنائیں گے۔ تم نے مجھ سے بار بار کہا تھا کہ میں تمہارے لیے یہاں ملازمت کا بندوبست کروں تو میں نے یہ کیا ہے جہاں میں فی الحال ملازمت کر رہی ہوں، تم میری جگہ وہی کام کرو گی۔ تمہارے رہنے،

سہنے، کھانے پینے کے انتظامات ہو جائیں گے۔ یہاں جو خاتون اسپتال کی سرپرست ہیں وہ بہت مہربان اور شفیق ہیں۔ تمہاری امی کا سن کر میرے دل پر جو گزری اسے میں بیان نہیں کر سکتی۔ کئی بار قلم اٹھایا کہ رسمی طور پر خط لکھ دوں لیکن لکھا نہ گیا۔ انہوں نے مجھے ماں کا پیار دیا تھا۔ فرزانہ! صرف تم ہی نہیں، میں بھی ایک مثالی ماں کے سائے سے محروم ہو گئی ہوں۔ ان کی محبت اور عظمت ہمیشہ ہمارے دلوں میں نقش رہے گی۔

ان کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے لازمی ہے کہ تم ان کی خواہش کا احترام کرو۔ وہ ضد کرتی تھیں کہ تمہیں شادی کرنا چاہیے لیکن میں ضد نہیں کروں گی۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے مگر اتنا کہوں گی کہ اپنی امی کی خواہش کے حوالے سے تم اس مسئلے پر غور کرو اور کسی نتیجے پر پہنچو۔

فرزانہ میں پردیس میں بڑے حوصلے سے جی رہی ہوں اور یہ حوصلہ جانی کے دم سے ہے۔ اس کے بعد کامی کی محبت سوتے جاگتے مجھے تڑپاتی رہتی ہے میں کس طرح یہاں وقت گزار رہی ہوں۔ یہ میرا خدا جانتا ہے۔ ایک اندیشہ میرے دل میں انگارے کی طرح جلتا رہتا ہے۔ مجھے جلاتا رہتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ جانی سے تمہارا سامنا ہو گیا ہے، وہ تمہیں پریشان بھی کر رہا ہے اور تم اس سے بھاگنے کے لیے سکھر بھی چلی گئی تھیں مگر تم کب تک بھاگتی رہو گی۔ تمہارے پاس ذہانت ہے، اخلاق اور شعور ہے۔ تم کوئی فیصلہ کر سکتی ہو۔ جس سے دور پردیس میں رہنے والی کے دل کا انگارہ سرد ہو جائے۔

فرزانہ! میں مر رہی ہوں۔ خدا کے بعد میری زندگی تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ میری بہن! میں یہاں رات کو گہری نیند سونا چاہتی ہوں۔ تم مجھے سلا دو۔ مجھے بھوک نہیں لگتی۔ مجھے کھلا دو۔ میں روتی ہوں، میرے آنسو پونچھ دو۔ میں ڈر رہی ہوں۔ مجھے اپنے بچے اور مہربان فیصلے کی گود میں چھپا لو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ فرزانہ مجھے بچا لو۔ میری بہن! میرے بچے کا، میرے سہاگ کا واسطہ ہے۔ اتنی دور میں تمہارے خط کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔ ہر آنے والی سانس ایک نئی زندگی دیتی ہے۔ تمہارا آنے والا خط مجھے کیا دے گا؟ میری بہن! میں ہوں تمہاری بہن رخسانہ۔"

تحریر ختم ہو گئی لیکن فرزانہ اس طرح گم صم بیٹھی اس خط کو تکتی رہی۔ اس کاغذ پر رخسانہ کا چہرہ طلوع ہو گیا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ یہ اس کے آنسو پونچھ رہی تھی۔ وہ کھانے

سے انکار کر رہی تھی۔ یہ لقمے بنا کر کھلا رہی تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ یہ تھپک تھپک کر اسے سلا رہی تھی۔

لیکن سب بے سود۔ کھانا کھلانے سے تھپک کر سلانے سے' آنسو پونچھ لینے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ قصہ ختم نہیں ہوتا' کسی کا گھر آباد نہیں ہوتا۔ اس کا تو بس ایک ہی راستہ تھا۔ رخسانہ نے بڑے اچھے انداز میں اسے لکھ دیا تھا اور یہ بات آج فرزانہ کے دماغ میں بھی مستحکم ہو گئی تھی کہ شادی کرنی ہو گی یا پھر یہ ملک چھوڑ کر جانا ہو گا۔ تب ہی رخسانہ کی بات بنے گی۔

وہ سوچتی رہی اور پریشان ہوتی رہی۔ اپنی شادی کا مسئلہ بڑا پریشان کن تھا۔ جس بات کے لیے دل آمادہ نہ ہوتا ہو' اس پر عمل کیسے کیا جائے؟ اسی وقت مریض عورتیں اور بچے ڈسپنسری میں آنے لگے۔ وہ مصروف ہو گئی۔ رات کو بڑی بے چینی سے کروٹیں بدلتے بدلتے نیند آئی۔ دوسری صبح جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ بیداری کے بعد یوں لگا جیسے نیند میں بھی رات بھر جاگتی رہی ہو۔ وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کر کے باہر آئی۔ دروازے پر تالا لگایا پھر کمپاؤنڈر کے مکان میں جا کر اسے ڈسپنسری کی چابی دی "تم ڈسپنسری کے وقت میرا انتظار کرنا۔ مجھے دیر ہو سکتی ہے مگر وقت پر آنے کی کوشش کروں گی۔"

وہ ناظم آباد' فرید احمد کے ہاں آئی۔ وہاں دروازے کے سامنے ہی جمشید کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے دروازے پر پہنچی۔ وہاں جمشید اور رخسانہ کی امی چہک چہک کر باتیں کر رہے تھے۔ فرید احمد ایک طرف سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ فرزانہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ رخسانہ کی امی اور جمشید بھی خاموش ہو کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا "خالہ جان! کل تک آپ اپنے نواسے کی جدائی میں رو رہی تھیں اور اب قہقہے لگا رہی ہیں۔ کیا نواسہ مل گیا ہے؟"

وہ غصے سے بولیں "اے تم کون ہوتی ہو میرے معاملات میں بولنے والی؟ کیوں آئی ہو یہاں؟ چلی جاؤ۔"

"میں جانے کے لیے نہیں آئی ہوں۔ میں اس گھر کو برباد نہیں ہونے دوں گی۔"

"اری تو کیا آباد کرے گی۔ بربادی کی جڑ تو تو ہی ہے مگر اب معلوم ہو گا کیونکہ جمشید

نے جانی کے خلاف کچھ قانونی اقدامات کیے ہیں۔ پولیس اسٹیشن میں رپورٹ لکھوا دی ہے کہ وہ بچے کو لے کر بھاگ گیا ہے۔ جب وہ گرفتار ہو گا تو اس کے بعد مقدمہ چلے گا اور مقدمے میں کم از کم سات سال کے لیے ہم بچے کو جیت لیں گے۔ جانی سے چھین لیں گے۔"

فرید احمد نے اٹھتے ہوئے کہا "بیٹی بیٹھ جاؤ' یہ عورت بکواس کر رہی ہے۔ میں بہت دیر سے ان کی باتیں سن رہا ہوں۔ انہوں نے ابھی پولیس اسٹیشن میں جانی کے خلاف رپورٹ نہیں لکھائی ہے اور نہ ہی میں اپنے داماد کے خلاف کوئی رپورٹ لکھوانے دوں گا۔ مسٹر جمشید! میں شرافت سے کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ اور آئندہ کبھی ہمارے دروازے پر قدم نہ رکھنا۔"

بیگم نے اچھل کر کہا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کون ہوتے ہیں میرے گھر سے جمشید کو نکالنے والے؟"

فرید احمد نے ڈانٹ کر کہا "بکواس مت کرو۔ آج میں صحیح معنوں میں مرد کا روپ دکھاؤں گا۔ اس کے بغیر عورت کو عقل نہیں آتی۔ خاموشی سے بیٹھی رہو۔ مجھے اس بات پر مجبور نہ کرنا کہ میں پہلے گالی دوں اور جب نہ سمجھو تو جوتوں سے پیٹنا شروع کر دوں۔"

بیگم ہکا بکا سی ہو کر فرید احمد کا منہ تکنے لگیں۔ انہوں نے کہا "میں آج تک تمہاری ہر جائز و ناجائز بات کو تسلیم کرتا رہا لیکن اب اس سے پہلے کہ میری بیٹی کو طلاق ملے میں تمہیں طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا۔"

پھر انہوں نے جمشید کو دیکھتے ہوئے غصے سے کہا "یہاں کھڑے ہوئے منہ کیا تک رہے ہو گیٹ آؤٹ۔"

جمشید تیزی سے پلٹ کر دروازے کی طرف گیا پھر وہاں سے گھوم کر بولا "آپ لوگوں نے میری توہین کی ہے۔ آپ یہ بھول گئے ہیں کہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کرنا چاہیے' آپ لوگوں کی بیٹی وہاں لندن میں ہے۔ میں چاہوں تو......"

فرزانہ نے فوراً ہی اس کی طرف پلٹ کر کہا "تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا جو لوگ جھوٹ سے توبہ کر کے سچائی کے ساتھ اپنی بگڑی بنانے کی کوششیں کرتے ہیں' خدا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ تم ہمیں اپنی دھمکیوں سے مرعوب نہ کرو۔ جاؤ یہاں سے۔"

وہ اپنی توہین پر جھنجلاتا ہوا چلا گیا۔ بیگم گم صم کھڑی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ فرید احمد نے کہا "تم کان کھول کر سن لو۔ آئندہ رخسانہ کو جو خط لکھا کرو گی' وہ میری مرضی کے مطابق ہوگا۔ اسے یہ نہیں بتایا جائے گا کہ جانی کو ساری حقیقت معلوم ہوگئی ہے اور وہ بچے کو لے کر چلا گیا ہے۔"

فرزانہ نے کہا "انکل! میں آپ سے یہی کہنے آئی ہوں۔ رخسانہ کا خط میرے پاس آیا ہے۔ وہ جانی اور کامی کے سلسلے میں بڑی پریشان رہتی ہے۔ اس کی پریشانیاں دور کرنا' وہاں اسے سکون اور آرام سے رہنے کا موقع دینا ہمارا فرض ہے۔ اگر ہم نے ذرا بھی کم عقلی کا ثبوت دیا تو وہ بے چاری ہلکان ہوتی رہے گی۔"

بیگم نے کہا "ہمارے خط لکھنے نہ لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ جمشید وہاں جاکر اسے ساری باتیں بتادے گا۔"

فرزانہ نے کہا "ایک جمشید کے بتانے سے رخسانہ کبھی یقین نہیں کرے گی۔ وہ آپ کی بات مانتی ہے۔ آپ پر اعتماد کرتی ہے۔ آپ پر بھروسا کرتی ہے۔ آپ جو لکھیں گی' وہ اس پر یقین کرے گی اور آپ وہی لکھیں گی جو ہم چاہیں گے۔"

فرزانہ کی بات سن کر رخسانہ کی امی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ انہوں نے کہا "اے تم کون چاہنے والی ہوتی ہو؟"

فرید احمد نے ڈانٹ کر کہا "پھر تم نے بکواس کی۔ اگر اب فرزانہ سے جھگڑا کیا یا اسے رلانے کی کوشش کی تو ساری زندگی میں تمہیں رلاتا رہوں گا۔"

فرزانہ نے پوچھا "کیا جانی کا کوئی پتا چلا؟"

"کچھ نہیں بیٹے۔ کل رات ہم بڑی دیر تک اس کے گھر کے چکر لگاتے رہے لیکن وہاں تالا ہی نظر آیا۔"

فرزانہ نے پوچھا "آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ جانی خود رخسانہ کو خط لکھتے تھے یا کسی سے لکھواتے تھے؟"

"وہ اردو پڑھنا جانتا ہے' کچھ لکھ بھی لیتا ہے۔ ہجے صحیح نہیں ہوتے اس لیے وہ اپنے کسی شاعر دوست سے خط لکھواتا تھا۔ اس کا نام شاید جھورا ہے۔"

"انکل ہمیں اس شخص کو تلاش کرنا ہوگا تاکہ ہم جانی کی طرف سے خط لکھوا کر

رخسانہ کو بھیجیں اور اسے تاثر دیتے رہیں کہ یہاں گھر کی فضا بالکل پرسکون اور دوستانہ ہے۔"

"بیٹی! تم نے رخسانہ کو خوش رکھنے اور اسے مطمئن رکھنے کے لیے بہت اچھی تدبیر سوچی ہے۔ ہم ابھی اس پر عمل کریں گے لیکن اس شخص کو کیسے تلاش کیا جائے؟"

"میں وہ گیراج جانتی ہوں جہاں جانی اپنی گاڑی لے جاتے ہیں۔ وہ مستری چاچا کا گیراج ہے۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ چلو۔"

وہ جانے کے لیے دروازے کے قریب پہنچے پھر فرید احمد نے پلٹ کر کہا "بیگم! آج سے تم میری اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاؤ گی اور نہ ہی جمشید کو مکان کے اندر آنے دو گی۔ نہ ہی اس سے باتیں کرو گی' میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ فرزانہ کے ساتھ باہر چلے گئے۔ بیگم تھوڑی دیر تک دروازے کو دیکھتی رہیں پھر غصے سے پاؤں پٹخ کر بڑبڑانے لگیں۔ دروازے کے پاس جاکر انہیں دور جاتے دیکھا۔ اس کے بعد دروازے کو زوردار آواز کے ساتھ بند کردیا۔ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتی رہیں' جی چاہتا تھا کچھ چیزوں کو اٹھا کر پھینکنا شروع کردیں لیکن وہ صوفے پر ایک جگہ آکر دھنس گئیں۔

تھک ہار کر بیٹھتے ہی انہیں بے اختیار رونا آگیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دوپٹے کو سمیٹ کر پھر دوپٹے سے منہ چھپا کر رونے لگیں۔ انہیں شرمندگی نہیں تھی۔ انہیں اس بات کا بھی دکھ نہیں تھا کہ جانی کے بجائے' جمشید جیسا دولت مند لڑکا ان کا داماد نہیں بنے گا۔ وہ فرزانہ سے بھی متاثر نہیں تھیں۔ ان پر فرید احمد کی ڈانٹ ڈپٹ کا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ ان کو بس ایک ہی دکھ تھا۔ وہ نواسے کا دکھ تھا۔ نواسہ کہاں ہے؟ یہ خیال جب بھی آتا تھا' وہ رونا شروع کردیتی تھیں۔ جمشید تھوڑی دیر تک ہنستا رہا تھا۔ وہ بھول گئی تھیں مگر محبت کو ہمیشہ بھلایا نہیں جاسکتا۔ انسان کتنا ہی سنگ دل ہو' ظالم ہو مگر اس کے دل کے کسی گوشے میں کسی نہ کسی کی محبت جڑ پکڑ لیتی ہے اور اسے رونے پر مجبور کرتی ہے۔

○☆○

فرزانہ اور فرید احمد ایک رکشے میں بیٹھ کر گیراج کے پاس آئے۔ وہاں انہوں نے

جانی کے دوستوں سے جھورے پینٹر کا پتا دریافت کیا پھر کریم آباد پہنچے۔ وہاں آس پاس کی دکانوں میں جھورا پینٹر بہت مشہور تھا۔ فوراً ہی اس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنی چھوٹی سی دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ فرید احمد رکشے سے اتر کر اس کے پاس گئے۔

"تم ہی جھورے پینٹر اور شاعر ہو؟"

وہ خوش ہو کر اٹھ گیا پھر بڑی انکساری سے بولا "اجی شاعری کیا کرتا ہوں' بس تک بندی کرتا ہوں۔ آپ فرمائیں کس کے اوپر شعر بولنا ہے۔ فوراً ہی پھڑکتا ہوا شعر تیار کر دوں گا۔"

"مجھے شعر نہیں لکھانا ہے۔ جانی میرا داماد ہے۔ میں اس کے متعلق کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔"

اس نے فوراً ہی اپنے سامنے والی جگہ کو کپڑے سے جھاڑتے ہوئے کہا "آیئے تشریف رکھیے۔"

انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا "جانی ہم سے ناراض ہو گیا ہے۔ اپنے بچے کو ہم سے چھین کر لے گیا ہے۔ ہم کل سے اسے تلاش کر رہے ہیں مگر اس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟"

جھورے نے اپنے کان کو پکڑتے ہوئے کہا "نہیں جناب' میں نے تو نہیں دیکھا' دیکھا ہوتا تو آپ کو بتا دیتا۔"

"دیکھو بیٹے' ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے پاس چھپا ہوا ہو اور تمہیں تاکید کر دی ہو یا دھمکی دی ہو کہ اس کا پتا نہ بتایا جائے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم آپ کے بچے ہیں۔ آپ سے جھوٹ نہیں بولیں گے۔"

"اور ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ جانی تم سے خط لکھوایا کرتا تھا؟"

"جی ہاں' میری رائٹنگ بہت اچھی ہے۔ میں اس کی طرف سے اپنی رخسانہ بھابی کو خط لکھا کرتا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے گھریلو حالات سے بڑی حد تک واقف ہو۔"

فرزانہ نے رکشے سے جھانک کر فرید احمد کو آواز دی۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس

آئے۔ اس نے کہا "انکل! میری ڈسپنسری کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں۔ اس شخص کو شام کے وقت گھر بلا لیں۔ ہم وہاں اسے ساری باتیں سمجھائیں گے اور اس کے ذریعے جانی کی طرف سے خط لکھائیں گے۔"

"اچھی بات ہے تم جاؤ بلکہ مناسب سمجھو تو میں تمہاری خالہ جان کو اور جھورے پینٹر کو لے کر تمہارے کلینک میں آ جاؤں گا۔ شام کے چھ بجے کے بعد تم مصروف رہتی ہو۔ ہم چار بجے آئیں گے اور جھورے سے اپنا کام نکال لیں گے۔"

وہ رکشے میں بیٹھ کر واپس کلینک میں آ گئی۔ وہاں مریض عورتیں اور بچے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان مصروف ہو گئی۔ ایک بجے فرصت ہوئی۔ ارشد نے کہا "باجی! آپ کلینک بھی سنبھالتی ہیں۔ باہر کہیں بھاگ دوڑ میں بھی مصروف رہتی ہیں۔ آپ کو کھانا پکانے کا وقت نہیں ملتا۔ آج میں نے آپ کے گھر کی صفائی کر دی ہے اور آپ کے لیے کھچڑی اور ٹماٹر کی چٹنی تیار کر دی ہے۔"

فرزانہ نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا "ارشد! تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو۔ تم نے اتنی تکلیف کیوں کی۔ میرے گھر کی صفائی تمہیں نہیں کرنا چاہیے۔ تمہارا کام کلینک میں ہے۔"

"نہیں باجی! کلینک کے وقت کلینک میں کام ہے۔ باقی اپنی بہن کے گھر میں ہے۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں آپ کو آرام پہنچاؤں۔ آپ کچھ پریشان رہتی ہیں۔ میرے بس میں ہو تو آپ فرمائیں۔ میں آپ کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ ذرا مسکراتے ہوئے بولی "نہیں بھیا! مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ بس بھاگ دوڑ کے باعث تھکن رہتی ہے۔"

"باجی! ایک بات بولوں۔ آپ غصہ تو نہیں کریں گے۔"

"نہیں تم میرے بھیا ہو بولو۔"

"میں کیا بولوں' امی کہتی ہیں۔ محلے کی عورتیں بھی کھسر پھسر کرتی رہتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتیں؟"

فرزانہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ سر جھکائے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا "محلے میں عورتیں اور کیا کہتی ہیں؟"

"عورتیں بھی ہنستی ہیں، مرد بھی باتیں بناتے ہیں۔ انہوں نے دو تین بار ایک ٹیکسی ڈرائیور کو ادھر آتے دیکھا ہے۔ کل ایک بہت بڑی قیمتی کار میں کوئی دوسرا نوجوان آیا تھا۔ یہ لوگ تو بدنام کرنا جانتے ہیں۔ پوچھتے ہیں کہ ان سے باجی کا کیا رشتہ ہے؟ کیوں آتے ہیں یہ لوگ؟ اگر آتے ہیں تو ان سے آپ کے رشتے کا پتا چلنا چاہیے۔"

وہ چپ چاپ سن رہی تھی۔ ارشد نے ہچکچاتے ہوئے کہا "باجی! سارا جھگڑا اکیلے رہنے کا ہے۔ اگر آپ کی امی زندہ ہوتیں تو اتنی بدنامیاں نہ ہوتیں۔ امی کہہ رہی تھیں کہ آپ کو جلدی سے شادی کر لینا چاہیے۔"

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ایک ہاتھ سے سر کو تھام لیا۔ آہستہ آہستہ اپنی پیشانی کو رگڑنے لگی۔ سر اتنا بھاری ہو رہا تھا جیسے گردن سے الگ ہو کر گر جائے گا پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا "تم جاؤ۔"

وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ یہ بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ سوچتی رہی فیصلے کرتی رہی۔ پریشان ہوتی رہی پھر اس نے کلینک کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ گھر کے اندر آئی۔ ارشد کمپاؤنڈر نے اس کے لیے کھچڑی تیار کی تھی۔ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ دو چار لقمے زہر مار کر کے پانی پیا پھر پلنگ پر آکر لیٹ گئی۔

وہاں کروٹ کروٹ بے چینی تھی۔ کبھی ایک کروٹ میں جمشید کہتا تھا شادی کرلو۔ کبھی دوسرے کروٹ میں رخسانہ التجا کر رہی تھی۔ ارشد کمپاؤنڈر بھی کہہ رہا تھا۔ باجی میں نہیں کہتا۔ امی کہتی ہیں۔ اس کی امی کہہ رہی تھیں۔ بیٹی میں نہیں کہتی۔ تمہاری پڑوسن کہہ رہی تھیں۔ پڑوسن کہہ رہی تھیں۔ بہن، میں نہیں کہتی۔ محلے کی عورتیں کہتی ہیں۔ محلے کی عورتوں سے ہمیں کیا پڑی ہے۔ یہ دنیا والے کہتے ہیں۔

سب کہتے تھے مگر کوئی منہ پر نہیں کہتا تھا لیکن یہ ایک سمجھنے والا سماجی کلیہ تھا کہ ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی تنہا زندگی نہیں گزارتی۔ گزارے گی تو بدنامی اس کے ساتھ چلے گی۔ کسی کا شوہر اس کے پیچھے پیچھے چلے گا۔ محبت روٹی سے بھی کی جاتی ہے لیکن کسی کے منہ سے روٹی چھیننے کو محبت نہیں کہتے۔ یہ ایک غیر انسانی فعل ہے اور وہ اس فعل کی مرتکب ہو رہی تھی۔

شام کو فرید احمد حسب وعدہ اپنی بیگم اور جھورے پینٹر کے ساتھ آئے۔ وہاں

انہوں نے اطمینان سے بیٹھ کر جھورے پینٹر کو ساری باتیں سمجھائیں اور جانی کی طرف سے خط لکھوایا۔ رخسانہ کو یہ تاثر دیا کہ اس کا گھریلو ماحول بہت ہی خوش گوار ہے۔ جانی برابر تینوں وقت گھر میں آکر کھانا کھاتا ہے۔ بچے کا خیال رکھتا ہے اور اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہے۔

بہر حال جھورے پینٹر کی وجہ سے بات بن گئی تھی۔ بیگم نے بھی اپنی طرف سے خط لکھا۔ اس میں خاص طور پر جمشید کا ذکر کیا گیا اور رخسانہ کو بتایا گیا کہ جمشید یہاں آکر چھچھوری حرکتیں کرتا رہا تھا اور گھر کے ماحول کو بگاڑنے اور جانی کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے کی سازش کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی سازش ناکام بنادی گئی ہے اور اسے گھر میں آنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ رخسانہ بھی جمشید کو لفٹ نہ دے۔

یہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ ماحول خوش گوار ہو گیا۔ آخر میں بیگم نے فرزانہ کو اپنے گلے سے لگاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹی! میں بہت بری ہوں۔ جانی ٹھیک کہتا ہے کہ میں چڑیل ہوں۔ ہائے مجھے کیا ہو گیا تھا' میں جمشید کی باتوں میں آکر اپنی بیٹی کا گھر اجاڑ رہی تھی۔ توبہ توبہ 'اللہ مجھے موت دے دے تو اچھا ہے۔"

"خالہ جان! آپ ہماری بزرگ ہیں۔ ٹھیک ہے آپ نے غصے میں ایسا کیا لیکن اب آپ سوچ سمجھ کر ہمارا ساتھ دیتی رہیں گی، ہم رخسانہ کو وہاں زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔"

بیگم اسے بہت ساری دعائیں دیتے ہوئے اپنے میاں کے ساتھ جھورے پینٹر کو لے کر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے لیے تنہائی عذاب بن گئی پھر طرح طرح کے خیالات پریشان کرنے لگے۔ اس کے بعد مریض عورتیں اور بچے آگئے۔ وہ رات کے دس بجے تک مصروف رہی۔ اس کے بعد پھر تنہائی کا دور شروع ہوا۔ رات، خاموشی، تنہائی اور اس پر پریشانیوں کا ہجوم، وہ بڑی بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہلتی رہی۔ فیصلہ کرتی رہی۔ آخر رات کے ایک بجے وہ کاغذ اور قلم لے کر رخسانہ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اس نے لکھنا شروع کیا۔

"بہن! میری پیاری بہن!

مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہارے لیے جو کچھ کیا ہے' اس میں کمی رہ گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ جو نیکی ہم کرتے ہیں اس نیکی کا بھی آدھا چہرہ ہوتا ہے۔ باقی نیکی کے آدھے چہرے پر ہمارے مفاد' ہمارے جذبات اور ہماری خواہشات کا تیزاب پڑ جاتا ہے۔

میں اب تک اس ضد پر قائم رہی کہ میں شادی کیوں کروں؟ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ نیکی کر دی۔ میرا کام ختم ہو گیا لیکن نہیں بات اب سمجھ میں آئی ہے۔ نیکی کا عمل کبھی ختم نہیں ہوتا' نیکی تقاضا کرتی ہے کہ اسے اور پائیدار بنایا جائے اور تمہارے ساتھ جو میں نے کیا ہے اس کی پائیداری اسی وقت ہو گی کہ میں شادی کر لوں۔

اور رخسانہ آج میں فیصلہ کر رہی ہوں۔ سکھر میں میرے چچا کے صاحب زادے ہیں جو برسوں سے میری آس لگائے بیٹھے ہیں۔ بہت جلد شادی کا دعوت نامہ تمہارے پاس آئے گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم شریک نہیں ہو سکو گی لیکن اس کے بعد خوش اور مطمئن رہو گی۔"

ایسا لکھتے لکھتے اس کا قلم رک گیا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دھندلا دھندلا سا نظر آنے لگا پھر اس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر یوں رکھے جیسے ڈوبتے ہوئے دل کو تھام رہی ہو۔

اس کے چاروں طرف رات تھی۔ رت جگا تھا' سکوت تھا' سکتہ تھا "آہ محبت کی طرح اندھی رات' محبت گناہ کہلائے تو گناہ گار کے منہ کی طرح کالی رات۔ میری ضد میری انا کو خاک میں ملانے والی رات' میرے فیصلے پر آخری مہر لگانے والی رات۔ کیا تو آخری رات نہیں ہو سکتی؟"

اس کے منہ سے ایک آہ نکلی۔ دل کے صحرا میں سرد ہوا چل رہی تھی۔

○☆○

ٹرین تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ بچہ زور زور سے رو رہا تھا۔ جانی نے کتنے ہی جتن کئے اسے فیڈر سے دودھ پلایا۔ اسے گود میں لے کر تھپک تھپک کر چپ کرانے کی کوشش کی پھر اسے لے کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ وہ چپ نہیں ہو رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک نے پوچھا "بھائی اس کی ماں

کہاں ہے' اس کے پاس پہنچا دو۔"

دوسرے نے کہا "شاید وہ لیڈیز کمپارٹمنٹ میں ہے۔"

جانی نے کہا "نہیں اس کی ماں نہیں ہے۔"

"نہیں ہے کا کیا مطلب ہے۔ خدانخواستہ مر گئی ہے کیا؟"

وہ چپ سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جانے کیوں اسے رخسانہ کا مر جانا برا لگا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ نہ مرے۔ ساری عمر اس کے لیے نہ سہی۔ بچے کے لیے تو جیتی رہے۔ ایک مسافر نے اس کی گود سے بچے کو لیتے ہوئے کہا "لاؤ مجھے .... دو۔ میں اپنی عورت کو دیتا ہوں۔ ضرور اسے کوئی تکلیف ہے۔"

وہ بچے کو لے کر پچھلی سیٹ کی طرف گیا۔ وہاں چند عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جانی نے ادھر ایک نظر ڈالی۔ اتنا دیکھا کہ ایک عورت نے اسے کانی کو گود میں لیا ہے۔ اس کے بعد وہ منہ پھیر کر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

اس کے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا۔ گاڑی کے شور میں بچے کے رونے کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی پھر وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ بچہ چپ ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا' وہ سو گیا ہے۔ اس نے مسافر سے کہا "بھائی صاحب! آپ کی بڑی مہربانی۔ آپ کی گھر والی نہ ہوتیں تو معلوم نہیں بچے کا کیا ہوتا۔"

"اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو گا۔ آپ یہ بتائیں کہ بچے کی ماں واقعی مر گئی ہے؟"

جانی نے سر جھکا لیا پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں وہ چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

"کیا؟" اس مسافر نے حیرانی سے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔ مسافروں نے پوچھا "کیا بات ہے؟" اس نے بتایا "بیوی بھاگ گئی ہے۔ بچے کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ عورتیں شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر ممتا کو خاک میں ملا کر اپنے یاروں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔"

یار کی بات آئی تو جانی کی نگاہوں کے سامنے جمشید کا چہرہ آ گیا۔ وہ اچھا خوش پوش تھا۔ اسمارٹ تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی سی قیمتی کار تھی اور نہ جانے کتنا دولت مند ہو گا آخر کار رخسانہ ادھر پھسل گئی۔ ساری وفائیں خاک میں مل گئیں۔ عورت پر کیسے بھروسا کیا جائے؟ جب تک پاس ہوتی ہے' گلے کا ہار بن کر اپنی وفاداری اور خدمت

گزاری کا سکہ جاتی ہے۔ دور ہوتی ہے تو منہ پر تھوک دیتی ہے۔

جانی کو بڑی شدت سے اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے کہا "بھائی صاحب، بچے کو یہاں لے آئیں۔ آپ کی گھر والی کو تکلیف ہوگی۔"

"تکلیف کی کوئی بات نہیں ہے۔ میری گھر والی اسے سنبھال لے گی۔ آپ یہاں اطمینان سے بیٹھے رہیں۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا "نہیں، اب تو اس بچے کی پرورش میرا ہی ذمہ ہے۔ مجھے ہی دن رات اس کا خیال رکھنا ہے۔ آج ایک دن آپ کے گھر والے سنبھال لیں گے تو کیا فرق پڑے گا۔ مجھے اس کی عادت ڈالنی چاہیے۔"

وہ مسافر وہاں سے اٹھ گیا اور بچے کو لے آیا۔ جانی نے اپنی سیٹ خالی کر دی۔ وہاں اس کے لیے بستر بچھایا اور آرام سے سلا دیا۔ خود نیچے بیٹھ گیا۔ کمپارٹمنٹ میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ "ایک شخص بہت ہی ننھے بچے کو لے کر کہیں جا رہا ہے۔"

"بچے کی ماں نہیں ہے۔"

"بچے کی ماں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

ہر طرف بچے کی ماں کا تذکرہ تھا مگر بہت ہی دھیمے دھیمے سروں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ گاڑی کے شور کے باوجود دور تک سرگوشیاں گنگنا رہی تھیں۔ لوگ آتے جاتے کبھی جانی کو کبھی بچے کو دیکھ رہے تھے اور جانی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر گزرنے والے کو اور آس پاس گھورنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔

خان پور کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو پولیس والے آ گئے۔ ایک انسپکٹر نے چھڑی دکھاتے ہوئے کہا "اے اٹھو، یہ بچہ کس کا ہے؟"

جانی کمپارٹمنٹ کے فرش پر سے اٹھتے ہوئے بولا "میرا ہے جناب۔"

"اس کی ماں کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں کہاں ہے۔ اگر ہوتی تو میں اس بچے کو لے کر یوں دربدر نہ بھٹکتا۔"

"تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کہاں؟" جانی نے تعجب سے پوچھا۔

"ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ تم کسی کے بچے کو اٹھا کر لے جا رہے ہو۔ تمہیں پولیس

اسٹیشن تک جانا ہوگا۔ یہ تمہارا نہیں ہے۔"

"یہ میرا ہے، میں ثابت کر دوں گا۔ میرے سوٹ کیس میں کچھ ثبوت رکھے ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا "ہماری دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ دوسرے کیسوں کو بھی نمٹانا پڑتا ہے۔ تم ہمارے سپاہیوں کے ساتھ تھانے چلو۔ میں بعد میں آؤں گا۔"

"جناب، اگر گاڑی چھوٹ جائے گی تو کیا ہوگا؟"

"دوسری گاڑی میں چلے جانا۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں یہاں ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ آپ دیکھ لیں، میں آپ کو مطمئن کر دوں گا۔ آپ میری گاڑی کیوں چھڑانا چاہتے ہیں؟"

"مجھ سے بحث نہ کرو۔ سیدھی طرح چلو ورنہ یہ سپاہی پکڑ کر لے جائیں گے۔"

ایک مسافر نے کہا "حوالدار صاحب! ایک مسافر اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ آپ اسے یہاں اتار دیں گے۔ آپ کی تفتیش میں دیر ہو گی تو اس کی گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

انسپکٹر نے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا "تم لوگ قانونی معاملات کو کیا سمجھتے ہو؟ کیوں ہمارے کاموں میں مداخلت کرتے ہو؟ ہم تم سے زیادہ قانون سمجھتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ کس مجرم کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔"

جانی نے کہا "میں مجرم نہیں ہوں۔ یہ میرا بچہ ہے میں اس کا باپ ہوں اور اس کے ثبوت میرے پاس موجود ہیں۔"

"تو پھر ڈرتے کیوں ہو۔ تھانے چلو۔"

جانی نے بے بسی سے قانون کے محافظوں کو دیکھا پھر بچے کو کمبل میں اچھی طرح لپیٹ کر، سنبھال کر اٹھایا، کاندھے سے ایک بیگ لٹکایا۔ جس میں بچے کے کپڑے اور دودھ رکھا ہوا تھا پھر دوسرے ہاتھ سے اپنی اٹیچی اٹھالی۔ ان کے ساتھ جانے لگا۔ اسی وقت پچھلی سیٹ سے ایک عورت کی آواز سنائی دی "ٹھہرو بھیا۔"

وہ رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا۔ وہی عورت تھی جس نے اس کے بچے کو چپ کرایا تھا۔ اس نے قریب آکر ایک چھوٹی سی شیشی جانی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس میں گھٹی ہے۔ بچے کے ساتھ اسے رکھنا چاہیے۔ ابھی بچے کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ اس کی

وجہ سے یہ تڑپ رہا تھا۔ بچے کو سمجھنا پڑتا ہے اور تم نہیں سمجھ سکو گے۔ کسی طرح جلد سے جلد اس بچے کو کسی عورت کی پناہ میں دے دو، کوئی بوڑھی عورت ہوگی تو اسے سنبھال لے گی اور ہاں باہر بہت زیادہ سردی ہے۔ بچے کو سنبھال کر رکھنا۔ سرسوں کے تیل سے اس کی مالش کرتے رہنا۔"

جانی نے اسے بڑی عقیدت سے دیکھتے ہوئے کہا "میں تمہارے اس احسان کو کبھی نہیں بولوں گا۔"

وہ جانے لگا "اس عورت نے کہا "سنو!"

وہ پھر رک گیا۔ وہ بولی "بیوی شوہر کو چھوڑ سکتی ہے۔ ماں بچے کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں نہیں جانتی کہ میاں بیوی میں کیا بات ہوگئی ہے۔ اگر کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا تمہاری بیوی سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو بچے کی خاطر اسے معاف کردو۔ ذرا سوچو، مرد اپنی عورت کی غلطی معاف نہیں کرے گا تو پھر اسے اور کون معاف کرے گا۔"

وہ سرجھکا کر پلٹ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پولیس والوں کے ساتھ گاڑی سے اتر گیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ باہر سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہ بچے کو بار بار کمبل میں اچھی طرح لپیٹ کر سردی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کے برآمدے میں پہنچ گیا۔ ایک سپاہی نے اسے وہاں ایک بینچ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

"سپاہی جی! یہاں اتنی سردی ہے۔ چھوٹا سا بچہ ہے۔ آپ مجھے اندر بیٹھنے کی اجازت دیں۔" اس نے کہا۔

سپاہی نے ہمدردی سے بچے کی طرف دیکھا پھر اسے اجازت دے دی۔ وہ اندر آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور تھانے دار کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی چھوٹنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اسی وقت انسپکٹر وہاں پہنچا۔ اس نے اپنی بید میز پر رکھتے ہوئے کہا "ہاں تو تمہارے پاس ٹکٹ ہے۔"

"جی ہے۔"

وہ جواب دیتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوٹ کیس کو اٹھا کر کرسی پر رکھا پھر اسے کھول کر ٹکٹ نکالا۔ اسے انسپکٹر کی طرف بڑھایا۔ انسپکٹر نے اسے دیکھنے کے بعد پوچھا "کیا ثبوت ہے کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔"

اسی وقت گارڈ نے سیٹی بجائی اور گاڑی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ جانی نے سوٹ کیس سے اپنا نکاح نامہ نکال کر انسپکٹر کی طرف بڑھایا پھر تصویروں کا البم نکالا۔ اس میں رخسانہ اور بچے کے ساتھ اس کی بہت سی تصویریں تھیں۔ بچے کا کلوزاپ بھی تھا۔ وہ انسپکٹر کی طرف البم بڑھانے کے بعد بچے کو بھی قریب لے آیا پھر کہنے لگا "تصویر اور بچے کو دیکھ لیجئے۔ یہ وہی ہے اور ان تصویروں میں جو عورت آدھا چہرہ چھپائے ہوئے ہے۔ وہ میری بیوی اور میرے بچے کی ماں ہے۔"

"تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

"لندن میں۔"

انسپکٹر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ جانی نے کہا "آپ تصویروں کو دیکھیں ہر تصویر میں میری بیوی نے آدھے چہرے کو چھپا رکھا ہے۔ اس کا چہرہ خراب ہے یہ پلاسٹک سرجری کے لیے لندن گئی ہے۔"

"تم بچے کو لے کر کہاں جا رہے ہو؟"

"میری کوئی منزل نہیں ہے۔ میں نے لاہور کا ٹکٹ لے لیا ہے سوچا تھا جہاں دل چاہے گا، گاڑی سے اتر جاؤں گا۔"

"جب تمہاری بیوی لندن گئی ہے تو تم نے کراچی میں اس کی واپسی کا انتظار کیوں نہیں کیا؟"

"وہ مجھے دھوکا دے کر گئی ہے۔ وہ ایک دولت مند نوجوان کے پاس رہنے گئی ہے۔"

"اوہ تو ایسی بات ہے۔ ویسے تمہاری باتیں کتنی سچی ہیں؟"

"میں ثبوت فراہم کرنے کے لیے یہاں آپ کے پاس ٹھہر گیا ہوں۔ گاڑی چلی گئی ہے۔ مزید ثبوت پیش کرنے کے لیے کراچی بھی واپس جا سکتا ہوں لیکن آپ مجھے خواہ مخواہ پریشان کریں گے۔"

"کراچی میں تمہارا اور کون ہے؟"

"وہاں اب میرا کوئی نہیں ہے اور جہاں میں جانے والا ہوں، وہاں بھی میرا کوئی نہیں ہوگا۔"

"کہاں جاؤ گے۔"

"جناب کہاں جاؤں گا۔ آپ نے راستہ روک دیا ہے۔ صبح دیکھوں گا اگر یہ جگہ میرے بچے کے لیے مناسب رہی تو یہیں رہ جاؤں گا۔"

انسپکٹر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "ہوں' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں گاڑی سے اتار کر کچھ زیادہ غلطی نہیں کی ہے۔ تم کہیں بھی اپنی منزل بنا سکتے ہو۔ بہتر یہی ہے کہ میری نظروں کے سامنے رہو۔ کہو تو یہاں تمہارے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا جائے' تمہارے پاس کچھ رقم وغیرہ ہے یا نہیں؟"

"خدا کے فضل سے میں اچھا کھانے کمانے والا ہوں۔ ٹیکسی چلاتا ہوں۔ اس وقت بھی میرے پاس دو ہزار روپے ہیں۔ ضرورت پڑی تو کراچی جا کر لے آؤں گا۔ وہاں میری ٹیکسی چل رہی ہے۔"

انسپکٹر نے آواز دی "سپاہی ممدو۔"

آواز آئی "جی جناب! حاضر ہوا۔" اس کے ساتھ ہی ایک سپاہی کمرے میں آیا۔

انسپکٹر نے کہا "تمہارے مکان میں ایک کمرا خالی ہے۔ تم کسی کو کرائے پر دینا چاہتے ہو یہ آدمی شریف معلوم ہوتا ہے۔ تم اسے اپنے کمرے میں جگہ دے دو۔"

"جو حکم جناب۔"

انسپکٹر نے جانی سے کہا "میں دفتری کام سے کراچی جانے والا ہوں۔ تم وہاں کا پتا مجھے لکھاؤ گے اور ایسے لوگوں کے نام پیش کرو گے جہاں میں تمہارے متعلق مکمل تحقیقات کر سکوں۔ جب تک تحقیقات خاطر خواہ نہ ہوں اس وقت تک تم ہمارے سپاہی ممدو کے گھر میں رہو گے اور اس کی نظروں میں رہو گے۔"

جانی نے کہا "مہربانی ہے جناب!"

انسپکٹر نے کہا "اس میں تمہارا فائدہ بھی ہے۔ ایک تو تمہاری رہائش کا مسئلہ حل ہو جائے گا پھر ممدو کی بیوی بچے ہیں۔ ایک بوڑھی ماں ہے۔ وہ تمہارے بچے کو سنبھال لیں گی۔"

"جناب! ایک عرض ہے' میں اپنے مکان کا اور اپنے سسرال والوں کا پتا آپ کو لکھ دوں گا اور اس گیراج کا پتا بھی دوں گا جس کے مالک کی نگرانی میں میری ایک ٹیکسی چل

رہی ہے لیکن آپ مجھ سے اتنا وعدہ کریں کہ وہاں کسی بھی شخص کو میرا پتا نہیں بتائیں گے۔"

"تم ان لوگوں سے چھپنا کیوں چاہتے ہو؟"

"جناب! میری ساس یہاں آئے گی تو بچے کے لیے جھگڑا کرے گی۔ جب تک اس بچے کی ماں لندن سے واپس نہ آئے' اس وقت تک میں اس کا حق دار ہوں اور میں اسے کسی اور کی نگرانی میں رکھنا نہیں چاہتا۔"

"جب ماں واپس آئے گی تو کیا کرو گے؟"

"میں اسے....."

وہ کہتے کہتے رہ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا "میں اسے طلاق دے دوں گا اور عدالت میں بچے کا حق حاصل کروں گا۔"

لیکن وہ بات پوری نہ کر سکا۔ اسی وقت اس کی نگاہوں کے سامنے فرزانہ آگئی۔ وہ التجا کر رہی تھی "دیکھو جانی! غصے میں اور جوش میں آکر رخسانہ کو طلاق نہ دینا۔ اس کی واپسی کا انتظار کرو۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ ایسی باتیں کرے گی کہ تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔"

پھر اسے رخسانہ نظر آئی۔ وہ کہہ رہی تھی "جانی! خدا کے لیے میری وفاداری اور خدمت گزاری کا حساب کرو اور میرا انتظار کرو۔"

انسپکٹر نے پوچھا "تم کہتے کہتے رک کیوں گئے؟"

وہ چونک کر بولا "میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جب بچے کی ماں واپس آئے گی تو کوئی فیصلہ ہو گا۔ میں اس کے ساتھ زندگی گزاروں گا یا نہیں۔ رہ گیا بچہ تو اس کا فیصلہ عدالت میں ہو گا۔ ابھی تو میں ہی اس کا حق دار ہوں اسی لیے میں التجا کرتا ہوں کہ اس بچے کے نانی' نانا کو میری موجودہ رہائش گاہ کا پتا نہ چلے۔"

انسپکٹر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "قانون کے جو تقاضے ہوں گے' وہ میں پورے کروں گا۔ ہاں اگر حالات تمہارے موافق رہے تو تمہارے سلسلے میں مجھے ان سے کوئی بات چھپانی پڑی تو میں ایسا کر لوں گا۔ تم ممدو کے ساتھ جاؤ۔"

وہ ممدو کے ساتھ اس کے مکان میں آگیا۔ اسے قانون کی عارضی پناہ مل گئی۔ وہ

قانون کے محافظوں کی نگاہوں میں بھی تھا اور اس کی حیثیت ایک کرائے دار کی بھی تھی۔

ممدو کا مکان بہت بڑا تھا۔ اس کے پچھلے حصے میں ایک کمرا ایسا تھا جو کسی کو بھی کرائے پر دیا جا سکتا تھا۔ وہ کمرا جانی کو مل گیا۔

جب وہ کمرے میں پہنچا تو صبح کے چار بجنے والے تھے۔ ممدو کی بوڑھی والدہ اذان سے پہلے اٹھنے کی عادی تھیں۔ جب انہیں پتا چلا کہ ایک شخص ایک ننھے بچے کے ساتھ کرائے دار کی حیثیت سے آیا ہے تو انہوں نے فوراً ہی بچے کو گود میں لے لیا پھر طرح طرح کے سوالات کرنے لگیں۔ جواب دینا ضروری تھا اس لیے جانی جواب دینے لگا۔ اسی سوال و جواب میں دن نکل آیا۔

بوڑھی خاتون نے کہا "مجھے اپنی ماں سمجھو۔ یہ میرا پوتا ہے۔ اس کی طرف سے بالکل بے فکر رہو اور اپنی نیند پوری کرو۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔"

وہ بوڑھی خاتون بچے کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ آرام سے سو گیا۔

پانچویں دن انسپکٹر نے اسے بلا لیا اور کہا "میں کراچی گیا تھا۔ تمہارے بتائے ہوئے پتے پر فرید احمد اور ان کے گھر والوں سے ملاقات کی۔ وہ لوگ بار بار تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ خانپور کی جو گاڑی گزر رہی تھی، اس میں جانی نام کا شخص ایک بچے کو لے کر جا رہا تھا۔ اس نے خود کو بچے کا باپ ثابت کر دیا تھا۔ وہ قانون کی نظروں میں قابل گرفت نہیں تھا۔ اب معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ میں نے جانی سے اس کا ایڈریس لیا تھا۔ اب کراچی آیا ہوں تو یونہی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

جانی نے خوش ہو کر کہا "جناب! آپ نے مجھ پر اور میرے بچے پر بڑا احسان کیا ہے۔ یقین کریں اگر میری ساس آ جاتیں تو بڑا ہنگامہ برپا کر دیتیں۔"

"میں نے تمہاری ساس کو دیکھا ہے کچھ عجیب قسم کی خاتون ہیں۔ ان کے مقابلے میں ان کے شوہر فرید احمد بڑی سمجھ داری کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک اور لیڈی ڈاکٹر فرزانہ تھی۔ وہ بھی تمہاری حمایت میں بول رہی تھی۔ بہرحال مجھے تمہارے گھریلو حالات کا علم ہو گیا ہے۔ تم یہاں آزادی سے رہ سکتے ہو۔"

جانی شکریہ ادا کر کے جانا چاہتا تھا۔ انسپکٹر نے قریب بلا کر کہا "یہاں کرسی پر بیٹھو۔"

جانی بیٹھ گیا۔ انسپکٹر نے کہا "تم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ تمہاری بیوی لیڈی ڈاکٹر

ہے۔"

"لیڈی ڈاکٹر ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ آخر عورت ہی ہے نا؟"

"جانی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تمہاری بیوی نے تم سے جھوٹ کہا۔ تمہیں دھوکا دے کر گئی، یہ بات درست ہے اس کے باوجود وہ تمہارے لیے دیانت دار ہے، سچی ہے، کھری ہے۔"

"آپ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"میرے اپنے بھی کچھ تجربات ہیں۔ بعض عورتیں اپنے شوہروں پر اتنا اعتماد کرتی ہیں کہ تھوڑا بہت جھوٹ بول کر گزر جانے میں کوئی برائی نہیں سمجھتیں۔ کبھی اپنے شوہر سے کوئی بات چھپا کر کچھ ایسے کام کر جاتی ہیں جو گھریلو حالات کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور اس سے شوہر کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔"

"کیا یہ درست ہے کہ اپنے گھر کا کوئی مسئلہ حل کرنے کے لیے یا اپنے آپ کو خوب صورت بنانے کے لیے عورت دوسرے مرد کا سہارا لینے چلی جائے؟"

"یہ انتہائی غلط اور غیر اخلاقی فعل ہے۔ اسے بے غیرتی کہیں گے۔ بعض عورتیں بڑے فخر سے یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کر گزریں گی بعد میں اپنے میاں کو سمجھا منا لیں گی۔ یہ ان کی خوش فہمی ہے اس سے گھر کے حالات کس طرح بگڑتے ہیں۔ گھر برباد کیسے ہوتے ہے۔ بعد میں اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے اور اس کا نتیجہ اب تمہاری بیوی کے سامنے بھی آنے والا ہے۔ اسے ابھی ان باتوں سے بے خبر رکھا گیا ہے۔ جب وہ آئے گی تب اس پر قیامت ٹوٹے گی۔"

"جناب، ایسی عورتیں بے حس اور بے پروا ہوتی ہیں۔ برے نتائج کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ایک گھر اجڑا ہے تو دوسرے دس گھر آباد کر لیں گے۔ انہیں اپنی جوانی اور اپنے حسن پر ناز ہوتا ہے۔ جب تک وہ حسین نہیں تھی، میرے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔ اب اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑیں گے۔ چہرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی لندن کی بہت بڑی اشتہاری کمپنی نے اسے منہ مانگا معاوضہ دے کر اپنے اشتہارات کے لیے بک کر لیا ہے پھر جمشید جیسا دولت مند جوان اس کا دیوانہ ہے ایسی عورت کو نتائج کی کیا پروا ہو سکتی ہے؟"

"اگر وہ دولت ٹھکرا دے۔ جس نوجوان کے ہاں پناہ لینے گئی تھی اس سے منہ موڑ لے' اپنے حسن پر غرور نہ کرے اور پہلے کی طرح تمہارے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے پر بضد رہے تب اس کی وفاداری اور پارسائی کا یقین ہونا چاہیے کیونکہ وہ سب کچھ ٹھکرا کر تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہے گی۔"

جانی نے انکار میں سرہلا کر کہا "نہیں جناب! عورت یہ بھی سوچتی ہے کہ مرد جیسا بھی ہو ٹیکسی ڈرائیور ہو یا اونچے درجے کا احمق ہو۔ جب سوسائٹی میں اس کی ہو گئی ہے تو اپنی ازدواجی زندگی کا بھرم رکھنے کے لیے اور اپنی اولاد کی خاطر اس کے ساتھ زندگی گزارے۔ یعنی وہ اب میرے ساتھ پہلے جیسی محبت اور وفاداری سے نہیں رہے گی بلکہ اپنے بیٹے کی خاطر اور سوسائٹی میں بدنامی سے بچنے کی خاطر' میرا ساتھ گوارا کرلے گی۔ وہ ایک بار مجھے دھوکا دے کر گئی ہے۔ معلوم نہیں آئندہ کتنی بار دھوکا دے گی۔ کیا میں تمام عمر اس کا پہریدار بن کر رہوں گا؟"

انسپکٹر نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لی پھر بے بسی سے سرہلا کر کہا "غلطی اس نے کی ہے۔ اب ایک غلط فہمی سے ہزاروں غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ پہلے جیسا اعتماد قائم نہیں ہوگا۔ ہم تمہیں سمجھاتے سمجھاتے تھک جائیں گے مگر تمہارا دل صاف نہیں ہوگا۔ جہاں اعتماد مرجائے' وہاں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر جانی اٹھ کر جانے لگا۔ انسپکٹر نے کہا "میری ایک بات مانو گے؟"

"میرے اور بچے کے فائدے کی بات ہوگی تو ضرور مانوں گا۔"

"میں بچے کے لیے ہی کہہ رہا ہوں۔ اس کی ماں کو طلاق کبھی نہ دینا ورنہ بچہ جوان ہوگا تو سوسائٹی میں احساس کمتری کا شکار ہوگا۔ جب اس کے ہمجولی اسے کہیں گے کہ اس کی ماں کو طلاق ہوئی تھی تو اس کا سر جھک جائے گا اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے بیٹے کا سر کسی کے سامنے جھکنے نہیں دو گے۔"

وہ سر جھکا کر وہاں سے چلا گیا۔

چار ماہ گزر گئے۔ اخراجات کے لیے مزید رقم کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے سوچا کراچی جا کر اپنی ٹیکسی کی آمدنی کا حساب کرلے اور کچھ رقم لے آئے۔ اس کے لیے بچے

کو ممدو کی ماں کے پاس چھوڑنا پڑا۔ ویسے بھی کاکی اس بوڑھی عورت سے مانوس ہو گیا تھا۔ دن رات انہی کے پاس رہتا تھا۔ جانی کو اس بات کا اطمینان تھا کہ اس کے حسب منشا بچے کی پرورش ہو رہی ہے۔

ٹرین میں سوار ہو کر اس نے حساب لگایا۔ چار ماہ دس دن کے بعد وہ کراچی جا رہا تھا۔ یوں تو اخراجات کے پیش نظر وہاں سے رقم لانے کا ارادہ تھا لیکن سفر شروع ہوا تو دل نے چغلی کھائی کہ وہ صرف اخراجات پورے کرنے کے لیے نہیں کسی کو دیکھنے' کسی کے متعلق کچھ معلوم کرنے جا رہا ہے۔ شام کے چھ بجے اس نے کراچی کینٹ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ اس وقت دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوچہ جاناں کی طرف کھنچا جاتا ہو اور سیدھا وہیں جانا چاہتا ہو۔ وہ اسٹیشن سے باہر آیا پھر بس میں بیٹھ کر جہانگیر روڈ پہنچا۔ دور ہی سے اس نے دیکھا کہ مستری چاچا کا گیراج کھلا ہوا تھا۔ ان کا داماد ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ دوسرے مستری اور مزدور اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ ذرا دیر وقت گزارنے کے لیے ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا اور ایک پیالی چائے آہستہ آہستہ پینے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد گیراج کے مستری چلے گئے۔ وہ ہوٹل سے نکل کر گیراج میں پہنچا۔ مستری چاچا کے داماد نے اسے دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا پھر خوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "تم نے تو اپنے گھر والوں کو پریشان کر دیا۔"

"کس کا گھر؟ میرا کون پریشان ہونے والا ہے؟"

"ایسا نہ کہو' تمہارے سسرال والے بہت پریشان ہیں۔ جس دن تم گئے' اس کے دوسرے دن تمہارے سسر ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ آئے تھے۔"

"نوجوان لڑکی؟ کون تھی وہ؟"

چھوٹو نے آگے بڑھ کر کہا "استاد جی وہی لڑکی تھی جو پہلی بار تمہاری ٹیکسی میں بیٹھ کر کالج گئی تھی۔"

اس کی بات سنتے ہی پھر جانی کا دل محبت سے دھڑکنے لگا۔ اچھا تو وہ مجھے تلاش کر رہی ہے۔ میرے جانے کے بعد محبت جوش مار رہی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے پوچھا "وہ کیوں آئی تھی؟"

"وہ ہم لوگوں سے جھورے پینٹر کا پتا پوچھ رہی تھی۔ ہم نے اسے بتا دیا پھر وہ دونوں اسی وقت چلے گئے تھے۔ معلوم نہیں اس سے ملاقات ہوئی بھی یا نہیں۔"

اس نے مستری چاچا کے داماد سے کہا "جمال بھائی! میرے حساب میں کتنی رقم جمع ہوئی ہے؟"

"جانی! خود ٹیکسی چلانے اور دوسروں کو ٹیکسی دینے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تم ہزاروں روپے کی آمدنی کیا کرتے تھے مگر ان چار مہینوں میں صرف بائیس سو روپے تمہارے حساب میں ہیں۔ باقی گاڑیوں کی مرمت اور دوسرے اخراجات ہیں ان سب کا حساب میرے پاس لکھا ہوا ہے۔"

"مجھے حساب کی ضرورت نہیں ہے پھر کبھی اطمینان سے دیکھ لوں گا۔ ابھی دو ہزار دے دیجئے۔"

"اس وقت تو نہیں ہیں۔ میں کل صبح دے دوں گا۔"

"کل صبح گڑبڑ ہو جائے گی۔ میں کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا یا کسی نے مجھے دیکھ لیا تو خواہ مخواہ جھگڑا ہو گا۔ میں غصے میں کسی کو قتل کر دوں گا۔"

"غصہ حرام ہوتا ہے۔ اطمینان سے بیٹھو اور میرے ساتھ روٹی کھاؤ۔"

نہیں جمال بھائی! میں آپ کے ساتھ زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ کے گھر والوں کو معلوم ہو گا تو وہ میرے سسر کو خبر کر دیں گے۔ آپ مجھے کسی مسئلے میں نہ الجھائیں۔ رقم دے سکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ کل جھورا کسی وقت آئے گا اسے دو ہزار دے دیجئے گا۔"

"اچھا، تم جھورے پینٹر کے پاس رہو گے۔"

"آپ اتنا کرید کرید کر کیوں پوچھ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ابھی جھورے کے پاس جاؤں گا۔ ادھر آپ میرے ساس سسر کو لے کر پہنچ جائیں گے۔ دیکھئے جمال بھائی اگر آپ نے میرے معاملے کو اور زیادہ الجھانے کی کوشش کی تو میں آپ سے بھی تعلق ختم کر لوں گا۔"

"میں تمہارے معاملات کو الجھانا نہیں سلجھانا چاہتا ہوں۔ تم برے پہلو پر غور کرتے رہو گے تو زیادہ کڑھتے رہو گے۔ زیادہ غصہ آتا رہے گا۔ اگر کسی بات کے اچھے پہلو کو کبھی کبھی سوچتے رہو گے تو....."

جانی نے بات کاٹ کر کہا "اس بات کا کون سا اچھا پہلو ہے۔ کیا آپ مجھ سے زیادہ میری بیوی کو جانتے ہیں؟ کیا آپ نے فریب کھایا ہے؟ کیا آپ سے جھوٹ بولا گیا ہے؟ کیا آپ کی شادی ایسے ہوئی ہے جیسے میری ہوئی تھی؟ کیا آپ کی بیوی آپ سے پوچھے بغیر اپنے میکے بھی جاتی ہے جب کہ میری بیوی مجھ سے پوچھنے کے باوجود نہ پوچھنے کے برابر دھوکا دے کر لندن پہنچ گئی ہے۔ دیکھئے خواہ مخواہ میرا دماغ خراب نہ کریں۔"

"میں تمہاری تمام باتوں کو مانتا ہوں مگر کیا کروں۔ میرے گھر کی عورتیں بھی رخسانہ بھابی کی حمایت کر رہی ہیں۔"

"وہ عورتیں ہیں یقیناً حمایت کریں گی۔ آپ مرد ہیں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟"

"اتنا کہتا ہوں کہ رخسانہ بھابی سے غلطی ہوئی ہے انہیں بڑی سے بڑی سزا دو۔ انہیں احساس دلاؤ لیکن اپنا گھر اور بچے کی زندگی برباد نہ کرو۔"

جانی ناگواری سے جانے لگا۔ چند قدم جانے کے بعد رک گیا پھر پلٹ کر بولا "ٹھیک ہے، میں اپنا گھر برباد نہیں کروں گا۔ آباد کروں گا۔ دوسری شادی کر کے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا بس اسٹاپ پر آیا پھر ایک بس میں سوار ہو کر کریم آباد پہنچ گیا۔ جھورے پینٹر کو تلاش کرتا ہوا ایک ہوٹل میں آیا۔ وہ چائے پی رہا تھا۔ جانی کو دیکھتے ہی وہ خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا پھر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "آہا! استاد کتنے دنوں بعد صورت نظر آئی ہے۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"جانی نے پوچھا کیا تم نے چائے پی لی؟"

"پی لی۔ آؤ تمہیں بھی پلاؤں۔"

"یہاں نہیں کہیں اور چلو۔"

وہ جھورے کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا کاؤنٹر کے پاس آیا۔ وہاں چائے کے پیسے ادا کئے پھر اسی طرح کھینچتا ہوا اسے ہوٹل کے باہر لے آیا۔ اس نے پوچھا "استاد! یہ مجھے پکڑ کر کہاں لے جا رہے ہو؟"

"کہیں دور چلیں گے۔"

"میری دکان پر چلو۔"

"نہیں وہ لوگ مجھے پکڑنے آ جائیں گے۔"

"کیا پولیس والے تمہارا اچھا کر رہے ہیں؟"

"سسرال والوں کے آگے پولیس والے کیا ہیں؟"

"اچھا سمجھ گیا۔ وہ فرید صاحب اور فرزانہ بی بی میرے پاس آئے تھے پھر شام کو میں فرزانہ بی بی کے کلینک میں گیا تھا۔ جانتے ہو کیوں؟"

جانی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے جواب دیا "میں تمہاری طرف سے رخسانہ بھابی کو خط لکھنے گیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہاں بھابی کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ یہاں کے حالات کا علم نہ ہو۔ یہ بھی نہ معلوم ہو کہ تم بچے کو لے کر چلے گئے ہو اسی لیے میں اب تک پانچ بار تمہاری طرف سے خط لکھ چکا ہوں۔"

جانی نے لپک کر اس کے گریبان کو پکڑ لیا پھر گریبان سے کھینچ کر ادھر سے ادھر لا کر بولا "تم نے میری اجازت کے بغیر اسے خط کیوں لکھا؟"

"میں کیا کروں۔ وہ مجبور کر رہی تھیں۔"

"کون؟"

"وہ وہ ڈاکٹرنی بی بی' میرا مطلب ہے فرزانہ بی بی۔"

جانی کے ہاتھ سے گریبان چھوٹ گیا مگر غصہ بدستور رہا "وہ کون ہوتی ہے ایسے کام کرانے والی۔"

"تم برا مانو یا جھگڑا کرو یا مجھے مار ڈالو مگر سچ بات یہی ہے کہ تم رخسانہ بھابی پر ظلم کر رہے ہو۔"

"ابے کیا کہتا ہے۔ میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔"

"میں نے کہا نا منہ توڑ دو۔ ہاتھ پاؤں توڑ دو لیکن وہ ہزاروں میل دور پردیس میں ہیں۔ اکیلی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ جمشید بڑی ہیرا پھیری کر رہا ہے۔ بھابی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اگر اتنی دور اس نے بھابی کو کوئی نقصان پہنچایا تو کون اس کی مدد کرنے والا ہے؟"

"مرنے دو اسے جیسے دھوکا دے کر گئی ہے۔ ویسے ہی اس کا یار اس کے ساتھ سلوک کرے گا۔"

"استاد! بھابی کو گالی مت دو۔ میں کئی بار تمہارے سسرال گیا ہوں۔ فرزانہ بی بی کے پاس بیٹھ کر میں نے خط لکھے ہیں۔ مجھے ساری باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ یقیناً بھابی نے غلطی

کی ہے لیکن ایک عقل کی بات مجھ سے سیکھ لو' ان سے جتنا برا سلوک کرنا چاہو' جتنا بھی ان کو پریشان کرنا چاہو تو یہاں آنے کے بعد کرنا۔ وہ پردیس میں ہیں جانی تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟"

"میں کچھ نہیں سمجھنا چاہتا۔"

وہ منہ پھیر کر جانے لگا۔ جھورے نے کہا "میں خوب سمجھتا ہوں۔ تم جس کی آس لگائے بیٹھے ہو اور جس کے لیے تم بھابی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دینا چاہتے ہو تو سن لو۔ وہ چڑیا اڑ چکی ہے۔"

جانی جاتے جاتے رک گیا "کیا کہہ رہے ہو؟ کس چڑیا کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی جو فرزانہ بی بی ہیں نا' ان کی شادی ہو چکی ہے۔"

جانی کے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا پہنچا۔ یوں لگا جیسے اچانک ہی کسی نے بھرپور طمانچہ مارا ہو۔ اس کے اندر یکبارگی آندھیاں سی چلنے لگیں۔ وہ بے چینی سے جھورے کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا پھر اس نے دانت پیس کر دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہا "اگر یہ جھوٹ ہوا تو میں تیرا خون پی جاؤں گا۔"

"آدمی غصے میں اپنا ہی خون پیتا ہے۔ ویسے یہ جھوٹ نہیں ہے۔ ابھی دو دن پہلے فرید صاحب میرے پاس آئے تھے' انہوں نے کہا کہ شام کو میں ان کے گھر پر آجاؤں۔ فرزانہ بی بی اور ان کے دولہا کو کھانے کی دعوت دی گئی تھی۔ مجھے بھی دعوت میں شریک ہونے کے لیے کہا۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ وہاں بیٹھ کر بھابی کو ایک خط اور لکھ دوں۔"

وہ جھورے کی بات سن رہا تھا۔ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر ناک سے زور زور کی سانس لے رہا تھا جیسے درندہ غرا رہا ہو پھر اس نے پوچھا "شادی کب ہوئی؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"میں نہیں مانتا۔ اتنی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"تم اسے جلدی کہہ رہے ہو۔ چار مہینے کے بعد آئے ہو۔ جیسے دیر نہیں ہوئی' ویسے بھی جلدی اور دیری کی کیا بات ہے۔ یہ تو ان کے گھر کا معاملہ ہے۔ شادی خاندان میں ہوئی ہے۔ اپنے چچا کے لڑکے کے ساتھ۔"

جانی کی کھوپڑی گرم ہو رہی تھی۔ اس وقت یہی چاہتا تھا کہ فرزانہ سامنے ہو اور وہ اس کا گلا گھونٹ ڈالے پھر اسے اپنی ساس کا خیال آیا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ کر کہا ”میں سمجھ گیا۔ میری ساس نے اس کی شادی کرائی ہے۔“

”نہیں استاد! فرید صاحب کو اور ان کی بیگم صاحبہ کو تو شادی کی خبر ہی نہیں تھی۔ فرزانہ بی بی بہت پہلے سکھر چلی گئی تھیں۔ وہیں ان کے چچا نے اپنے لڑکے سے نکاح پڑھایا۔“

وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ محاورتاً جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اگر نہ بیٹھتا تو چکرا کر گر پڑتا پھر اس نے ڈوبتے ہوئے پوچھا ”کیا تم نے اس کو دیکھا ہے؟“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“

وہ جھنجلا کر بولا ”ابے اس دشمن کی بات پوچھ رہا ہوں جس نے اس سے شادی کی ہے۔“

”استاد! ایسے معاملات میں دشمن نہیں رقیب کہتے ہیں۔“

اس نے گھور کر دیکھا۔ جھورے نے کہا ”پہلے پوری بات سن لو۔ یہ عاشقی کا معاملہ ہے۔ جو شریف آدمی ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو رقیب نہیں سمجھتے۔ محبت سے دعائیں دیتے ہیں کہ اپنی محبوبہ جس کے ساتھ بھی رہے خوش رہے۔ شاد و آباد رہے۔ تم بھی ایک شریف آدمی ہو کیا تم فرزانہ بی بی کو دعائیں نہیں دو گے؟“

وہ سر اٹھا کر دور خلاؤں میں تکنے لگا۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی روح کھینچ لی گئی ہو۔ جسم فٹ پاتھ پر بیٹھا رہ گیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ یوں چلنے لگا۔ جیسے نیند میں چل رہا ہو۔ جیسے اب بھی خواب دیکھ رہا ہو' اور خواب نہ آ رہے ہوں تو پرانے خوابوں کو تازہ کر رہا ہو۔

بند آنکھوں کے پیچھے خواب صرف ایک ہی بار پھول کی طرح کھلتے ہیں۔ ایک پھول دوبارہ نہیں کھلتا۔ ایک ہی خواب شاید کسی نے دوبارہ دیکھا ہو۔ فرزانہ بھی ایسا خواب بن گئی تھی۔ جسے وہ دوبارہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ دیر تک چلتا رہا۔ دیر تک سڑکوں اور گلیوں میں بھٹکتا رہا۔ اسے ہوش نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ زندگی کے چلتے رہنے کی میعاد کیا ہے؟ بس وہ چل رہا

تھا۔ جیسے چلتے چلتے مر جائے گا۔

جھورے پینٹر کی تھکی ہوئی سی آواز سنائی دی ”استاد کب تک چلتے رہو گے۔ میں تو بالکل تھک گیا ہوں۔ کہیں تو بیٹھ جاؤ۔“

اس نے پلٹ کر جھورے کو دیکھا پھر اپنے آس پاس یوں دیکھنے لگا جیسے نیند سے جاگا ہو اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ کہاں سویا تھا اور کہاں آنکھ کھلی ہے۔ جھورے نے کہا ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے ہمدردی کروں یا کوئی نصیحت کروں؟“

”کچھ نہ کرو۔ چلے جاؤ۔“

”کیسے چلا جاؤں؟ میں روتا رہوں تو کیا تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔“

”کیا تم قدم سے قدم ملا کر میرے دکھ میں شریک ہو رہے ہو؟“

جھورے نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا ”اگر تم رخسانہ بھابی کے لیے سوچو ان کی فکر کرو۔ کوئی تدبیر سوچو تو اسی طرح قدم ملا کر چلتا رہوں گا تمہارے ہر معاملے میں کام آؤں گا۔ بلکہ دنیا بھی تمہارا ساتھ دے گی اور اگر تم فرزانہ بی بی کے بارے میں سوچو گے تو میں ہی کیا دنیا بھی اسے حماقت کہے گی بلکہ تمہیں برا کہے گی۔ ایک شریف زادی جس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے متعلق سوچنا اب گناہ ہے۔“

”میں نہیں سوچوں گا۔“ اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے پوچھا ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ دماغ سوچنے کے قابل ہی نہ رہے۔“

”اس دماغ کو سوچتے رہنا چاہیے۔ اپنی شریک حیات کے متعلق اور اپنے بچے کے بارے میں۔ ارے ہاں میں تو پوچھنا ہی بھول گیا کہ کامی کہاں ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔ ابھی میں کوئی بات نہیں کروں گا۔“

”بیشک باتیں نہ کرو مگر ایک آخری بات بول رہا ہوں۔ جب کامی جوان ہو گا تو تم سے ضرور پوچھے گا۔ ابو! میری امی ہزاروں میل دور تھیں۔ اکیلی تھیں۔ بے یار و مددگار تھیں آپ نے انہیں اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے کا موقع دیے بغیر ان کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا؟ تب جانی تم کبھی اپنے بیٹے کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکو گے۔“

وہ منہ پھیر کر جانے لگا ”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”جہاں پہلے گیا تھا۔“

"آج نہ جاؤ۔ میرے ساتھ روٹی کھاؤ۔ میرے ساتھ رات گزارو۔ میں کسی کو تمہارے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ جب تمہارے ساتھ رہوں گا تو بھلا کس کو بتا سکوں گا۔"

"تم میرے سسرال والوں کا ساتھ دے رہے ہو۔"

"ہرگز نہیں میں حق کا ساتھ دے رہا ہوں۔ میں آخری سانس تک تمہیں سمجھاتا رہوں گا۔ تم جب تک نظر آؤ گے۔ تمہارے ساتھ چلتا رہوں گا۔"

وہ ایک بس میں سوار ہو گیا۔ جھورے بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ کینٹ اسٹیشن پہنچے۔ جھورے نے پوچھا "تم کہاں جاؤ گے اس وقت کون سی گاڑی ہے جو تمہیں کسی منزل تک پہنچائے گی؟"

"جس کی کوئی منزل نہ ہو وہ کسی بھی وقت، کسی بھی گاڑی میں اور کسی بھی راستے پر جا سکتا ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔ اب جاؤ۔"

"میں کیسے تمہیں چھوڑ دوں۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔"

"نہیں واپس جاؤ اور میرے سسرال والوں کے پیچھے بنے رہو۔"

"میں آئندہ بھابی کا نام نہیں لوں گا۔ صرف تمہاری باتیں کروں گا۔ تم کوئی غلط بات بولو گے تو میں ہاں میں ہاں ملاؤں گا۔"

"جھورے! میں جانتا ہوں۔ تم میرے گھر کی تباہی نہیں دیکھ سکتے۔ کسی نہ کسی بہانے جاننا چاہتے ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کہاں رہتا ہوں لیکن تم کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ مجھے چپ چاپ جانے دو۔ اگر نہیں جانے دو گے تو میں تمہاری پٹائی شروع کر دوں گا۔"

جھورے نے اس کے چہرے کو تھوڑی دیر تک دیکھا پھر سر جھکا کر وہاں سے گھوم گیا۔ آہستہ آہستہ جانے لگا۔ جانی اسٹیشن کی عمارت کے باہر زینے پر کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دور بس اسٹاپ پر جا کر ایک منی میں سوار ہو گیا ادھر یہ منی میں بیٹھ کر دور کھڑے ہوئے جانی کو دیکھ رہا تھا۔ رات کے وقت اسے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ جھورے گاڑی کے اندر بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ چھپنے کے انداز میں عمارت کے ایک طرف سے چلتا ہوا ٹیکسیوں کے پیچھے سے گزرتا ہوا اسی بس اسٹاپ کی طرف جانے لگا۔ اس

وقت منی اسٹارٹ ہو رہی تھی۔ جھورے فوراً ہی اتر کر سامنے والے ہوٹل میں چلا گیا پھر دور ایک میز پر جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

جانی بس اسٹاپ پر آ کر دور جاتی ہوئی منی کو دیکھ رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ جھورے اس میں بیٹھ کر جا چکا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک دوسری منی آئی۔ وہ اس میں سوار ہو گیا۔ جھورے نے منی کا نمبر پڑھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ اورنگی جا رہا ہے اور یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ آج وہ اسی شہر میں رہے گا۔

وہ کلینک کے سامنے پہنچ گیا لیکن دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ رات کے گیارہ سوا گیارہ ہو رہے تھے۔ آس پاس سناٹا چھا رہا تھا۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں اس نے ایک قریبی دکان دار سے پوچھا "یہ لیڈی ڈاکٹر کہاں گئی ہیں؟"

دکان دار نے جواب دیا "ان کا کلینک دو ہفتے سے بند ہے شاید اور دو ہفتے بند رہے گا۔ انہوں نے شادی کی ہے۔ دولہا دلہن کو ایک مہینے کی چھٹی تو ملنی ہی چاہیے۔"

جانی کو یوں لگا جیسے دکان دار اسے پتھر مار رہا ہو۔ وہ وہاں سے سر جھکائے چلا آیا۔ دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ وہ کہاں ہو گی؟ اپنے شوہر کے ساتھ ہو گی شاید کہیں سینما دیکھنے یا تفریح کرنے گئی ہو گی۔ اس کے ساتھ ہنس رہی ہو گی اس کا ہاتھ اس کے شوہر کے ہاتھ میں ہو گا۔ وہ سوچتا رہا اور نگی سے ناگن چورنگی تک چلتا رہا۔ جب گھر پہنچا تو پاؤں نہیں دکھ رہے تھے۔ جسم تھکن سے خالی تھا لیکن دماغ بری طرح تھکا ہوا تھا۔ اتنا بھاری لگ رہا تھا جیسے کاندھے پر سر کی جگہ پہاڑ رکھا ہو۔ اس نے تالے کو کھولا پھر چار ماہ کے گرد آلود بستر پر آ کر گر پڑا۔ تھوڑی دیر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے بعد کیسے آنکھ لگ گئی۔ کچھ پتا نہ چلا۔

دوسری صبح دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا۔ رات کو وہ دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے پر کوئی اجنبی کھڑا ہوا دستک دے رہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا پھر وہاں سے چلتا ہوا اس کے قریب آ کر بولا "فرمایئے آپ کون ہیں؟"

اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میرا نام رجب علی ہے۔"

جانی نے اس سے مصافحہ کیا۔ رجب علی نے کہا "کبھی کبھی آدمی اپنے نام سے اور

اپنے مقام سے پہچانا نہیں جاتا۔ اپنی پہچان کے لیے دوسروں کا حوالہ دینا پڑتا ہے۔ آپ مجھے فرزانہ کے حوالے سے شاید پہچان جائیں۔ وہ میری شریک حیات ہے۔"

جانی بڑی مضبوطی سے رجب علی کے ہاتھ کو گرفت میں لے کر مصافحہ کر رہا تھا۔ اس کی آخری بات سنتے ہی مصافحے کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ رجب علی نے کہا "میں اپنی بیگم کے ساتھ آیا ہوں۔ وہ باہر رکشے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ انہوں نے ہی مجھے اس گھر کا پتا بتایا ہے۔"

جانی نے فوراً ہی برآمدے میں آ کر دیکھا۔ دور احاطے کے گیٹ کے پاس رکشہ کھڑا ہوا تھا اور اس میں سے سرخ جوڑا جھلک رہا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "آپ اپنی بیگم کو یہاں لے آئیں۔"

اس نے بات کاٹ کر کہا "آپ تکلف نہ کریں ہم آپ کے ہاں ضرور آئیں گے۔ فرید صاحب نے بھی ہماری دعوت کی تھی۔ جب آپ کی بیگم لندن سے واپس آجائیں گی۔ آپ کا ایک گھر ہوگا تو اس وقت دعوت کا مزہ بھی آئے گا اور دعوت عین رسم و رواج کے مطابق ہوگی۔"

جانی نے پوچھا "اگر میری یہ بات رسم و رواج کے خلاف ہے تو پھر آپ اپنی بیگم کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"میں نے کہا نا کہ میری بیگم مجھے آپ کے گھر تک پہنچانے آئی ہیں۔ اگر میں پتا جانتا تو تنہا آتا۔"

"یہاں آنے کی کوئی وجہ ہوگی۔"

"آپ مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گے؟"

جانی نے ایک بار پھر رکشے کی طرف دیکھا پھر کہا "یہ مناسب نہیں ہے ایک عورت باہر رکشے میں بیٹھی رہے اور آپ میرے گھر میں بیٹھیں یا تو آپ بیگم کے ساتھ آکر بیٹھیں یا جو کہنا ہو مختصر طور پر کہہ کر چلے جائیں۔ اگر میں کبھی اس قابل ہوا کہ آپ میاں بیوی کو اپنے گھر بلا سکوں تو ضرور یہ شرف حاصل کروں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں مختصر طور پر اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں فرزانہ کے چچا کا لڑکا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔ دوسری بات کہیے۔"

"میں آپ کے، رخسانہ بھابی کے اور فرزانہ کے حالات سے پوری طرح واقف ہوں۔ آپ کی شادی سے لے کر اب تک کیا قصہ چلتا رہا۔ یہ میرے علم میں ہے۔ فرزانہ بہت ہی صاف گو ہے۔ اس نے مجھے ایک ایک بات بتا دی ہے۔ آپ نے بات مختصر کرنے کے لیے کہا ہے اس لیے صرف ایک سوال کر رہا ہوں۔ کیا میری بیوی عزت و آبرو سے میرے ساتھ پر سکون ازدواجی زندگی گزار سکے گی؟"

"آپ اس کے شوہر ہیں اس کی عزت و آبرو، اس کے سکون یا اس کے سکھ چین کے ذمے دار ہیں۔ یہ بات مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ مجھ سے خوش ہے مگر آپ سے سہمی ہوئی ہے۔ اس نے جو غلطی کی اس کی سزا اب بھی پا رہی ہے۔ آپ کی طرف سے آئندہ بھی ہونے والی بدنامیاں اسے دھمکیاں دے رہی ہیں۔ اس طرح میں شوہر ہو کر بھی اسے کیسے پر سکون رکھ سکوں گا؟"

جانی نے سر گھما کر پھر رکشے کی جانب دیکھا۔ پہلے فرزانہ سیٹ کے دوسری حصے پر دوسری طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ اب قریبی حصے پر ادھر چلی آئی تھی۔ سر جھکائے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جانی کو صاف طور پر نظر آ رہی تھی۔ اس نے کتنے ہی زیورات پہن رکھے تھے سرخ جوڑا تھا۔ ایسی دلہن کی طرح کھل رہی تھی کہ اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن اب وہ پرائی تھی۔ اسے دیکھتے رہنے کا حق کسی اور کو حاصل ہو گیا تھا۔ اس نے منہ پھیر کر کہا "میں وعدہ کرتا ہوں۔ آئندہ آپ کی شریک حیات کا نام کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا لیکن میں ایک سوال کر رہا ہوں کیا آپ اپنی شریک حیات کے ساتھ پورے اعتماد سے زندگی گزار سکیں گے؟"

"ہاں کیوں نہیں؟ یہ سوال آپ کے ذہن میں کیوں پیدا ہوا؟"

"اس لیے کہ وہ میرے نام سے بدنام ہوتی رہی ہیں اور ایک بدنام عورت ہمیشہ اپنے شوہر کی نظروں میں کھٹکتی رہتی ہے۔ ویسے میں قسم کھاتا ہوں کہ وہ....."

رجب علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ قسم نہ کھائیں۔ مجھے اپنی شریک حیات پر مکمل اعتماد ہے جانتے ہیں کیوں؟ میں نے کبھی کسی پرائی عورت سے عشق نہیں کیا جو لوگ دوسری کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ وہی اپنی بیویوں پر شبہ کرتے ہیں۔"

جانی ایک دم سے تلملا گیا۔ تڑپ کر بولا "آپ مجھے طعنے دے رہے ہیں۔"

"نہیں' آپ کی بات کا جواب دے رہا ہوں۔ فرزانہ نے مجھے ایک ایک بات بتائی ہے۔ ایک رات وہ آپ کے اس کمرے میں آئی تھی۔ تمام رات رہ کر دوسری صبح یہاں سے گئی تھی۔ اگر وہ حیا کو بالائے طاق رکھ کر گئی تھی تو مجھے اس پر شبہ کرنا چاہیے اور اسے سزا دینا چاہیے۔ اگر اس نے اپنی شرم و حیا کو برقرار رکھا تھا تو پھر آپ کو رخسانہ بھابی پر نہ تو شبہ کرنا چاہیے اور نہ ہی سزا دینا چاہیے۔ کیونکہ وہ بھی ٹھیک اسی طرح وہاں لندن میں کسی کے ساتھ ایک رات گزار چکی ہے۔"

اپنی بیوی کسی کے ساتھ رہ کر آئے تو اپنی مردانگی کو ٹھیس پہنچتی ہے اور کوئی دوسری اپنے ساتھ رہ کر جائے تو بھرپور رومانس کی انگڑائیاں سی آنے لگتی ہیں۔ یہ کم بخت بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ اس پر کبھی اعتماد نہیں ہوتا۔ اس نے رجب علی سے کہا "میں اپنی بیوی کو معاف کروں یا سزائیں دوں یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ آپ میاں بیوی کے درمیان آئندہ مداخلت نہیں کروں گا اور نہ ہی میری طرف سے کوئی بدنامی کی بات ہوگی لہٰذا آپ کو مطمئن ہو کر چلے جانا چاہیے۔"

اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ رجب علی مصافحہ کرنے کے بعد وہاں سے جانے لگا۔ جانی کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ بلکہ رکشے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ نظر آرہی تھی۔ رجب علی رکشے کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ فرزانہ کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ پھر واپس آیا۔ اس نے جانی سے کہا "میری شریک حیات پوچھتی ہیں کہ کامی کہاں ہے؟"

"میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ آپ انہیں سمجھائیں۔ ماضی کو بھولنے اور بدنامیوں سے بچنے کے یہ طور طریقے نہیں ہوتے اگر وہ میرے معاملات میں دلچسپی لیں گی تو مجھے بھی شہ ملے گی۔"

رجب علی نے تائید میں سر ہلایا پھر وہاں جا کر رکشے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک رکشہ کھڑا رہا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان بحث ہو رہی تھی پھر رکشا آگے بڑھ گیا۔ جانی اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا' دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ دل برداشتہ ہو کر آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں آیا۔ دن کی روشنی میں کمرے کی ہر چیز گرد آلود نظر آرہی تھی۔ وہ پچھلی رات اسی طرح گرد سے بھرے ہوئے بستر پر سو گیا

تھا۔ رخسانہ بڑی نفاست پسند تھی۔ اگر وہ کمرے کی یہ حالت دیکھ لیتی تو چیخیں مار کر جھاڑ پونچھ میں فوراً ہی مصروف ہو جاتی۔

اسے احساس ہوا کہ رخسانہ کی یاد آئی ہے۔ اس نے فوراً ہی سر کو جھٹک دیا جیسے دماغ سے اسے نکال رہا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا الماری کے پاس آیا پھر اسے کھول کر یونہی کپڑے اور دوسری چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ شاید لباس بدلنا چاہتا تھا۔ شاید یاد آنے والی کو بھولنے کے لیے مصروف رہنا چاہتا تھا۔ اس نے دراز کھولی اوپر ہی وہ ڈائری نظر آئی۔ ڈائری کو دیکھتے ہی فرزانہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا "جانی! آج میں تمہیں بتاتی ہوں' جس رات تم بہت نشے میں تھے۔ اس رات میں نے تمہاری الماری کھول کر رخسانہ کی ڈائری پڑھی تھی۔ رخسانہ نے آخری صفحے پر لکھا ہے۔ تم جا کر پڑھ سکتے ہو۔ وہ تمہیں پھر ایک بار دھوکے میں رکھ کر یا جھوٹ بول کر پچھتا رہی ہے۔ اگر کبھی اس کا جھوٹ تم پر کھل جائے تو تمہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ آکر اپنی صفائی پیش کرے گی۔"

وہ ڈائری کو دیکھ رہا تھا اور فرزانہ کی باتیں یاد کر رہا تھا پھر اس نے ڈائری کو اٹھا لیا۔ اسے کھولا۔ یونہی بے دلی سے اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ چار ستمبر کے صفحے پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ وہاں رخسانہ نے لکھا تھا۔

"میرے جانی! میں تمہیں جان سے بڑھ کر چاہتی ہوں جو عورت جان سے زیادہ چاہے۔ وہ تھوڑا جھوٹ بولنے کا بھی حق رکھتی ہے کیونکہ اسے اپنے مرد پر بڑا مان ہوتا ہے۔ وہ مارے گا۔ ظلم کرے گا پھر اپنی ملکیت سمجھ کر معاف کر دے گا۔

جانی! میں پرسوں بہت دور چلی جاؤں گی۔ اگر کبھی تمہیں یہ بات معلوم ہو کہ میں نے تم سے کوئی بات چھپائی ہے تو میری رازداری کو فریب نہ سمجھنا۔ میرا انتظار کرنا۔ واپس آکر تمہیں سمجھاؤں گی۔ بعض حالات میں مصلحت اندیشی لازمی ہو جاتی ہے۔ میں ایسے فریب کو وقتی طور پر جائز سمجھتی ہوں۔ جس سے شوہر کو' بچوں کو اور گھر کو نقصان نہ پہنچے۔ میں قسم کھا کر جا رہی ہوں کہ کبھی کسی مرحلے پر بھی تمہاری خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچنے دوں گی۔ میرا ہاتھ صرف تمہارے ہاتھوں میں رہنے کے لیے ہے۔ یہ کسی اور ہاتھ میں کبھی نہیں جائے گا۔ جائے گا تو میں مر جاؤں گی۔"

اس نے جھنجلا کر ڈائری کو دور پھینک دیا۔ وہ اڑتی ہوئی۔۔۔۔ پھڑپھڑاتی ہوئی گئی۔ جانی نے حیرانی سے دیکھا۔ ایک لمحے میں اسے یوں لگا جیسے رخسانہ تڑپتی ہوئی اور پھڑپھڑاتی ہوئی آکر اس کے قدموں سے لپٹ گئی ہو۔ دوسرے لمحے اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ وہ ڈائری دور جا کر اس کے جوتوں سے لپٹ گئی تھی۔

○☆○
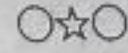
رخسانہ اپنے حسن و جمال کو حیران ہو کر یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے ابھی تک خواب ہی دیکھ رہی ہو اور اپنے ادھورے چہرے کی تکمیل کی دعائیں نیند میں مانگ رہی ہو۔

وہ اپنے سامنے بڑے سے اسکرین پر جو کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ اس کے آس پاس اشتہاری کمپنی کی مسز ہاک، مسٹر ڈیوڈ ہاک اور مسٹر رچرڈ ڈیوڈ بیٹھے اس کے حسن کو اور اپنے کاسمیٹکس کے آئیٹمز کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور آہستہ آہستہ ان پر تبصرہ کر رہے تھے۔

سامنے اسکرین پر، مناظر بدل رہے تھے۔ رخسانہ مختلف پوز میں، مختلف انداز میں، کبھی کلوز اپ میں، کبھی لانگ شاٹ میں نظر آ رہی تھی۔ ہر زاویے سے وہ ہوشربا تھی، ہر شاٹ میں ایک نیا جادو جگا رہی تھی۔ کبھی شیمپو کے حوالے سے اس کی ریشمی زلفیں یوں لہراتی تھیں جیسے ریشمی سکھیاں ساون میں جھولے جھول رہی ہوں۔ کبھی اس کے ہونٹوں کی کلیاں کھلتی تھیں اور لپ اسٹک کے مختلف شیڈز نظر آتے تھے۔ کبھی گالوں کے گلاب کھلتے تھے اور ان کے ذریعے وینشنگ کریم، کولڈ کریم اور ٹالکم پاؤڈر کو داد ملتی تھی۔ اس کی آنکھیں پہلے ہی خوب صورت تھیں۔ اب ان میں کاجل بھری راتیں جاگ رہی تھیں اور آئی شیڈز کی رنگینیاں جھلملا رہی تھیں۔ وہ کیا تھی۔ کیا بن گئی تھی۔ ذرہ تھی، آفتاب بن گئی تھی۔ آفتاب بن کر بھی آسمان پر نہیں اڑ رہی تھی۔ بلکہ زمین پر بیٹھی جانی کو یاد کر رہی تھی۔ اپنے حسن کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ جس کے لیے وہ مکمل ہوئی ہے۔ وہ دیکھے گا تو کیسے اس کا دیوانہ بن جائے گا۔

پھر اسکرین سادہ ہو گیا۔ تاریکی چھٹ گئی۔ پروجیکشن ہال روشن ہو گیا۔ اس روشنی میں آس پاس کے مرد اور عورتیں اٹھ کر اسے دیکھنے لگے۔ اس کی تعریفیں کرنے لگے اور اسے مبارک باد دینے لگے۔ رخسانہ دور کھڑے ہوئے ڈاکٹر لوئیس مارکو کو دیکھ رہی تھی

اشتہاری رش پرنٹ دیکھنے کے لیے ڈاکٹر کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ مسز ہاک نے کہا "ڈاکٹر! آپ ایک لاجواب فنکار ہیں۔ آپ نے مسز رخسانہ کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔"

ڈاکٹر لوئیس مارکو نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "میں بے جا تعریف پسند نہیں کرتا۔ آپ یقین کریں مسز رخسانہ میرے پاس آنے سے پہلے ہی قدرتی طور پر حسین تھیں۔ ان کا آدھا چہرہ حادثاتی طور پر بگڑ گیا تھا۔ باقی جو آدھا خوب صورت چہرہ رہ گیا تھا۔ میں نے اسی کے مطابق ان کے چہرے کو مکمل کیا ہے یعنی قدرت نے جو حسن انہیں دیا تھا۔ میں نے اس کی آدھی نقالی کی ہے۔ یہ میرا فن ضرور ہے لیکن میرا وہ کارنامہ نہیں ہے جو قدرت کا ہو سکتا ہے۔"

رخسانہ نے آگے بڑھ کر فرطِ عقیدت سے ڈاکٹر کے ہاتھ کو تھام لیا پھر اسے چوم کر کہا "آپ کی تعریفیں جتنی بھی کی جائیں کم ہیں لیکن اس کی بنیادی تعریف یہ ہے کہ آپ کا فن انسان کو بگڑی بنانا سکھاتا ہے آپ کا فن یہ اشارہ دیتا ہے کہ انسان ہمیشہ آدھا نہیں رہے گا۔ اپنے اندر کی بگڑی بناتے بناتے ایک دن وہ ضرور مکمل ہو گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے پروجیکشن ہال سے باہر آئے۔ مسز ہاک نے کہا "رخسانہ! تمہیں خوش خبری سنا دوں کہ صرف ایک ہفتے کا کام رہ گیا ہے۔ کچھ پوسٹرز اور کاسمیٹکس البم کے لیے تمہارے مختلف فوٹو گرافس کی ضرورت ہے آج سے دسویں دن تم واپس پاکستان جا سکو گی۔ تمہارے لیے پاکستانی طیارے میں ایک سیٹ ریزرو کرا دی گئی ہے۔"

رخسانہ کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ طویل سزا کاٹنے کے بعد دسویں دن جیل سے رہا ہونے والی ہو۔ گیارہویں دن اس کے تمام عزیز اسے خوش آمدید کہیں گے وہ اپنوں میں ہو گی اور جو سب سے زیادہ اپنا ہے اس کے پاس ہو گی۔

اس کے پاس ہونے کے تصور سے وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ مسز ہاک اس کی خوشیوں کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے دباتے ہوئے پوچھا "کیا وہ یاد آ رہا ہے؟"

رخسانہ شرما گئی۔ مسز ہاک نے کہا "میں پاکستانی اور ہندوستانی لڑکیوں کو اکثر دیکھتی رہتی ہوں۔ تم لڑکیوں کے مسکرانے میں ایک عجیب دلکشی ہوتی ہے۔ ایسی مسکراہٹوں کا فوٹو گراف لینے کو دل چاہتا ہے۔"

وہ اسٹوڈیو کے ایک کینٹین میں آکر بیٹھ گئے پھر کافی کا دور چلنے لگا۔ رخسانہ نے کافی پینے کے دوران باتیں کرتے ہوئے ایک طرف دیکھا تو دور جمشید نظر آیا۔ وہ دفتر معلومات کی طرف سے آرہا تھا پھر کینٹین کی طرف رک کر وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو خصوصاً عورتوں کو دیکھنے لگا جیسے رخسانہ کو تلاش کر رہا ہو۔ وہ انجان بن کر مسز ہاک سے باتیں کرنے لگی۔

جمشید کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں۔ وہ یقین سے اور کبھی بے یقینی سے رخسانہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کالج کے زمانے میں اسے دیکھا تھا۔ وہ اسی رخسانہ سے مشابہت رکھتی تھی لیکن اس میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ قدرت نے اسے جس حد تک حسین بنایا تھا۔ اس میں ڈاکٹر لوکیس مارکو کی صناعی اور مشاقی بھی شامل ہو گئی تھی۔ قدرت نے اسے حقیقت بنایا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے تصوراتی بنا دیا تھا۔

جمشید ہچکچاتے ہوئے ان کی میز کے قریب آیا پھر جھجکتے ہوئے بولا "رخسانہ! کیا یہ تم ہو؟"

رخسانہ نے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں، میں ہی ہوں بیٹھ جاؤ۔"

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ رخسانہ نے کہا "جب میں پلاسٹک سرجری کے پہلے مرحلے سے گزرنے کے بعد اسپتال کے بیڈ پر پڑی ہوئی تھی تو تم ملنے آئے تھے۔ تم نے کہا تھا، پاکستان جا رہے ہو۔ میں نے تم سے بہت ساری التجائیں کی تھیں۔ سوچا تھا، تم میرے مسائل دیانت داری سے حل کرو گے اور فرزانہ کو یہاں ملازمت کرنے کے لیے آنے پر راضی کر لو گے۔"

"ہاں، میں وعدہ کر کے گیا تھا" وہ سحرزدہ سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"اور اب آٹھ ماہ کے بعد واپس آئے ہو۔"

"رخسانہ! میری بھی تو سنو کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔"

"میرے پاس فرزانہ کا خط آیا ہے وہ برابر مجھے خط لکھا کرتی ہے۔ اس نے اپنے پہلے خط میں ہی تمہارا کچا چٹھا بیان کر دیا تھا۔ تم وہاں جا کر میری ازدواجی زندگی کو مزید تلخ بنانے اور جانی کے ہاتھوں مجھے طلاق دلوانے کے لیے سازشیں کر رہے تھے۔"

"تم بغیر سوچے سمجھے صرف فرزانہ کی باتوں میں آکر مجھے الزام دے رہی ہو۔ مجھے

تنہائی میں کچھ باتیں کرنے کا موقع دو۔"

"تاکہ تم مجھے جانی اور فرزانہ کے خلاف بھڑکا سکو۔"

"بھڑکانے کی بات نہیں ہے۔ میں جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ جانی تم پر بے حد ظلم کر رہا ہے۔ وہ تمہاری ماں سے تمہارے بچے کو چھین کر کہیں چلا گیا ہے۔ بالکل لاپتا ہو گیا ہے۔"

رخسانہ نے بڑے اطمینان اور یقین سے پوچھا "یہ تم کب کی باتیں کر رہے ہو؟"

"جب میں پاکستان پہنچا تھا۔ اس کے دوسرے ہی دن میں نے تمہارے والدین سے ملاقات کی۔ ابھی میں ان سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ جانی آندھی طوفان کی طرح آن پہنچا اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ تم اسے دھوکا دے کر یہاں آئی ہو۔"

رخسانہ نے جھینپ کر مسز ہاک وغیرہ کو دیکھا۔ اگرچہ وہ اور جمشید اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ تاہم رخسانہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے شوہر کو فریب دے کر آنے والی بات سب ہی کی سمجھ میں آرہی ہو اور سب اسے لعنت ملامت کرنے والے ہوں۔ وہ جلدی سے بولی "میں ایسی باتیں نہ تو کرنا چاہتی ہوں نہ سننا چاہتی ہوں۔ تم اول درجے کے جھوٹے ہو۔ جانی میرے خاندان میں موجود ہے اور میرے بچے کے ساتھ ہے۔"

"رخسانہ یقین کرو۔ تمہیں دھوکے میں رکھا جا رہا ہے۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے پاس جانی کے جو خطوط آتے ہیں۔ وہ جانی نہیں لکھتے کوئی اور لکھتا ہے؟"

جمشید نے حیران ہو کر پوچھا "کیا تمہارے پاس جانی کے بھی خطوط آتے ہیں؟"

"جانی کے بھی، امی کے بھی اور فرزانہ کے بھی۔ کیا یہ سب جھوٹے ہیں اور تم سچے ہو؟"

جمشید نے پریشان ہو کر چند لمحوں تک سوچا پھر کہا "میں کیسے یقین دلاؤں وہ میری آنکھوں کے سامنے بچے کو چھین کر لے گیا ہے۔" پھر وہ چٹکی بجا کر بولا "ہاں، ایک طرح سے میری باتوں کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ تم فون پر جانی سے گفتگو کرو اور اپنی امی وغیرہ سے کہو کہ وہ تمہیں اپنے بچے کی آواز سنائیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ تم اپنے بچے اور

اپنے شوہر کی آواز فون پر نہیں سن سکو گی۔"

"میں ان آٹھ مہینوں میں بہت زیادہ مصروف رہی ہوں۔ صرف دو بار مجھے ٹیلی فون کرنے کا موقع ملا۔ ایک بار جانی گھر میں نہیں تھے۔ ٹیکسی لے کر گئے ہوئے تھے دوسری بار انہوں نے بہت زیادہ پی لی تھی۔ اتنے مدہوش تھے کہ مجھ سے باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ہاں، دونوں بار میں نے اپنے بچے کی آوازیں سنی ہیں۔"

جمشید اپنی کھوپڑی سہلانے لگا پھر حیرانی سے بولا "مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فرزانہ پڑوس کے کسی بچے کو گود میں لے کر آگئی ہو اور اس کی آواز تمہیں سنا دی ہو۔ تم کیا سمجھوگی کہ وہ تمہارا بچہ تھا یا کسی اور کا؟"

"جمشید زیادہ نہ بولو۔ میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتی بہتر ہے کہ تم چلے جاؤ۔"

مسز ہاک اور مسٹر رچرڈ وغیرہ ان کی باتیں نہیں سمجھ رہے تھے۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ رخسانہ اسے جانے کے لیے کہہ رہی ہے اسی وقت مسز ہاک نے کافی کی ایک پیالی جمشید کی طرف بڑھا دی۔ جمشید کو وہاں رکنے کا بہانا مل گیا۔ اس نے کافی کی ایک چسکی لیتے ہوئے کہا "پاپا نے مجھے چھ ماہ کے لیے پاکستان بھیجا تھا۔ میں نے حالات تمہاری مخالفت میں دیکھے تو فوراً واپس آنے کا پروگرام بنایا لیکن پاپا نے سختی سے انکار کر دیا۔ کچھ کاروباری معاملات میں ایسا الجھایا کہ میں چھ ماہ سے پہلے نکل نہ سکا وہاں سے روانہ ہوتے وقت پھر پاپا کا پیغام ملا کہ پہلے مجھے فرینکفرٹ جانا ہوگا۔ وہاں سے پیرس جاؤں گا اور پھر لندن آؤں گا۔ یہ کاروباری دورے طویل ہو گئے۔ میں ہزار کوششوں کے باوجود تمہارے پاس نہ آسکا۔"

"تم مجھے خط کے ذریعے اطلاع دے سکتے تھے۔"

"میں تمہیں تین خط لکھ چکا ہوں اور تینوں خط سلمٰی قادر کے پتے پر لکھے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ تمہاری رہائش وہیں ہے لیکن مجھے ایک کا بھی جواب نہیں ملا۔"

"اور مجھے تمہارا ایک خط بھی نہیں ملا۔ تم بکواس کر رہے ہو۔"

ایسا کہتے وقت اسے باقر علی نظر آئے۔ وہ بھی دفتر معلومات کی طرف سے آرہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی رخسانہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر پاپا کہتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے

لگی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آکر رک گئے۔ باقر علی نے اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹی رخسانہ! یہ تم ہو۔ مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین نہیں آرہا ہے۔"

رخسانہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ باقر علی نے محبت سے اسے تھام لیا پھر کہا "نالائق بیٹے کو تلاش کرتا ہوا آیا ہوں۔"

اسی وقت جمشید نے قریب آکر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیتے ہوئے پوچھا "تم لندن کب پہنچے؟"

"ابھی دو گھنٹے پہلے۔"

"تم نے مجھ سے ملاقات کیوں نہیں کی؟"

"بس پاپا یونہی میں نے حساب لگایا تھا کہ رخسانہ کا چہرہ مکمل ہو چکا ہوگا۔ مجھے دیکھنے کی بے چینی تھی۔ میں نے اپنا تمام سامان لاکرز میں رکھا پھر سیدھا سلمٰی قادر کے پاس پہنچا۔ رخسانہ کے متعلق دریافت کیا مگر انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ اشتہاری فلم کی شوٹنگ میں مصروف ہوں گی۔ اسی طرح بھٹکتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔"

باقر علی نے کہا "میں بھی تمہارے پیچھے بھٹک رہا ہوں۔ جیسے ہی سلمٰی قادر نے فون پر بتایا کہ تم آگئے ہو۔ تو میں یہاں چلا آیا۔"

رخسانہ نے کہا "آپ کو مسز سلمٰی قادر نے بتایا ہوگا کہ میں اس اسٹوڈیو میں ہوں۔"

"ہاں میں نے سلمٰی قادر سے کہا تھا کہ اس نالائق کو تمہارا پتا نہ بتایا جائے۔ جمشید! تم میرے ساتھ چلتے ہو یا میں تنہا واپس جاؤں۔"

"پاپا! میں رخسانہ سے کچھ باتیں....."

رخسانہ نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا "نہیں پاپا! میں ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ آپ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔"

باقر علی نے کہا "سن لیا تم نے۔ چلو۔"

اس نے رخسانہ پر حسرت بھری نگاہ ڈالی پھر مجبوراً اپنے پاپا کے ساتھ چلتا ہوا ان کی کار کے پاس آیا۔ انہوں نے پوچھا "تم یہاں ٹیکسی سے آئے تھے؟"

"ایک دوست سے لفٹ لی تھی۔"

"چلو بیٹھ جاؤ۔"

وہ دونوں کار کی اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ باقر علی نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھاتے ہوئے اسٹوڈیو کے احاطے سے نکل کر اپنے فلیٹ کا رخ کیا۔ راستے میں انہوں نے کہا "میں نے جان بوجھ کر تمہیں چھ ماہ کے لیے پاکستان بھیجا تھا کہ چھ ماہ میں پلاسٹک سرجری مکمل ہو جائے گی پھر معلوم ہوا کہ کچھ اور وقت لگے گا۔ کیونکہ رخسانہ شوٹنگ میں مصروف رہنے والی تھی۔ تب میں نے تمہیں فرینکفرٹ اور پیرس میں الجھا دیا۔ تمہیں یہاں آنے کا موقع نہیں دیا۔"

"پاپا آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسز سلمیٰ قادر، رخسانہ کے متعلق جانتی تھیں کہ وہ اس وقت اسٹوڈیو میں ہے لیکن انہوں نے مجھے نہیں بتایا اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو تین خط رخسانہ کو لکھے، انہوں نے انہیں غائب کر دیا تھا۔"

باقر علی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "وہ تینوں خط تمہارے کردار کا آئینہ ہیں۔ وہ میرے پاس ہیں۔"

"پاپا! آپ نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ کیا آپ اسے اپنی بہو نہیں بنا سکتے؟ آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ کتنی حسین لڑکی ہے۔"

"وہ دنیا کا پہلا اور آخری حسن نہیں ہے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

"لیکن پاپا....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تمہیں ایک شادی شدہ عورت کے متعلق ایسا سوچتے ہوئے، اس کا گھر برباد کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ مجھے تو یہ سوچ کر شرم آ رہی ہے کہ تم میرے بیٹے ہو۔ میں آج آخری بار سمجھا رہا ہوں جب تک رخسانہ یہاں سے چلی نہ جائے تم اس کا سامنا نہیں کرو گے۔ جس دن مجھے یہ خبر مل گئی کہ تم نے اس سے ایک منٹ کی بھی ملاقات کی ہے تو میں تمہیں عاق کر دوں گا۔"

"آپ ایسا نہیں کریں گے، پاپا۔"

"کروں گا بیٹے، تمہیں یہاں سے وہاں تک جتنی بھی پروازیں ملتی گئیں۔ وہ سب میری دولت کی وجہ سے تھیں۔ میں تمہیں دولت سے محروم کر دوں گا تو تم دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو جاؤ گے۔ ابھی اس لڑکی کا چہرہ مکمل نہیں ہوا ہے۔ ہم سب مل کر اسے

مکمل کریں گے۔ لہٰذا مجھے مجبور نہ کرو کہ میں تمہارے پر کاٹ دوں۔ سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو۔"

جمشید نے شکست خوردہ انداز میں اپنے سر کو جھکا لیا۔

○☆○
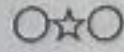
"رخسانہ بھابی آ رہی ہیں۔"

جھورے کی زبان سے یہ سنتے ہی جانی کا دل کچھ عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ نگاہوں کے سامنے آدھا چہرہ آ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی "جانی! تم لاکھ کوششیں کرو۔ مجھ سے نفرت نہیں کر سکو گے۔ تمہارے دماغ کے چور گوشے میں یہ بات ہے کہ میں بے وفا اور دولت کی لالچی عورت ہوں۔ اگر ہوتی تو لندن سے تمہارے لیے واپس نہ آتی۔ میں آ رہی ہوں۔ صرف تمہارے لیے آ رہی ہوں اور یہ بات تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔"

جھورے نے جانی کو سوچ میں ڈوبتے ہوئے دیکھ کر ایک بڑی سی تصویر اس کی طرف بڑھا دی "ذرا اسے دیکھو اور پہچانو یہ محترمہ کون ہیں؟"

جانی نے تصویر کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ اسے رخسانہ کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ رخسانہ جس کا آدھا چہرہ دیکھا تھا مگر تصویر میں وہ چہرہ مکمل تھا۔ رنگین تھا۔ محبت کی طرح سنگین تھا۔ بچوں کی طرح کھیل نہیں تھا کہ کھیلا اور اٹھا کر پھینک دیا۔ اس چہرے نے اس کے لیے نیا جنم لیا تھا۔ اس کا حسن اور اس کی دلکشی اس کی رعنائی اور اس چہرے کا غرور سب کچھ اپنے مرد کے لیے رکھا اور وہ چہرہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا "جانی یہ تمہارے لیے صرف تمہارے لیے مکمل ہوا ہے۔ دوسرے اسے دیکھتے رہیں گے، تمنا کرتے رہیں گے اور تم سے جلتے رہیں گے۔"

وہ گھبرا گیا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ رخسانہ کے نئے نئے، تازہ تازہ حسن نے اسے سحر زدہ کر دیا ہو۔ بے شک وہ سحر زدہ کرنے والا حسن تھا لیکن وہ تصویر کو دیکھ کر جانے کتنے رنگین اور سنگین لمحات میں گم ہو گیا تھا۔ جو رخسانہ کے ساتھ گزرے تھے۔ وہ آدھے چہرے والی ایسی اداؤں بھری تھی کہ نفرت کے باوجود اب بھی یادوں کے فتنے جانتی تھی۔ اب اس کے مکمل حسن کے ساتھ اس کی اداؤں کا کیا عالم ہوگا؟ وہ تو دیکھے گا اور دیکھتا ہی رہ جائے گا۔ اسے گھر سے دھکے دے کر نکال سکے گا مگر دماغ سے نوچ کر نہیں پھینک سکے

گا۔

"کیا دیکھتے ہی رہو گے؟" جھورے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ہنستے ہوئے بول رہا تھا "میں جانتا تھا استاد! تم ڈوب جاؤ گے۔ ابھی تو یہ تصویر ہے۔ جب وہ سامنے ہوں گی تو کیا ہو گا؟"

جانی نے اونہہ کہہ کر حقارت کا اظہار کرتے ہوئے تصویر کو ایک طرف پھینک دیا۔ جھورے نے دوڑ کر اسے اٹھالیا "اب تو غصہ تھوک دو۔ بھابی کل صبح کی فلائٹ سے آرہی ہیں۔"

وہ غصے سے بولا "کیا تم جورو کے بھائی ہو۔ تمہیں ساری باتوں کا علم ہوتا ہے۔ اس کے گھر والوں نے تمہیں اس کی تصویریں بھی رکھنے کے لیے دی ہیں۔"

"کوئی کسی کی گھر والی کی تصویر اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ تم تین ماہ پہلے یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملاقات کی تھی۔ آئندہ بھی ملاقات ہو سکتی تھی۔ اسی لیے یہ تصویر گھر سے لے آیا۔ یہ میرے پاس رہے تو تم اعتراض کر سکتے ہو۔ اس پر صرف تمہارا حق ہے۔"

"میرا کوئی حق نہیں ہے۔ اسے میرے سامنے نہ لاؤ۔ نہیں تو ٹکڑے کر دوں گا۔"

"تم بھابی سے نہیں ملو گے؟"

"نہیں ملوں گا۔"

"تم ان سے یہ نہیں پوچھو گے کہ وہ تم سے جھوٹ بول کر کیوں گئی تھیں؟"

"مجھے کچھ نہیں پوچھنا ہے۔"

"کیا تم ڈرتے ہو؟"

جانی نے چونک کر اسے دیکھا پھر گھونسا دکھاتے ہوئے بولا "ابے کیا مار کھائے گا۔"

"کھالوں گا تمہارے انکار سے اور تمہارے دور بھاگنے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بھابی کا اتنا قصور نہیں ہے۔ وہ بڑی محبت اور اعتماد سے تمہارے لیے چلی آرہی ہیں۔ تمہارا قصور ہو یا نہ ہو مگر اپنے اندر کی اس کمزوری سے ڈرتے ہو جو تمہیں بھابی کی طرف کھینچ رہی ہے تم ان سے نفرت نہیں کر رہے ہو۔ تم انہیں سزا بھی نہیں دے سکتے تم

انہیں معاف بھی نہیں کر سکتے۔ تم انہیں بھلا بھی نہیں سکتے۔ تم یہ بھی نہیں کر سکتے۔ تم وہ بھی نہیں کر سکتے۔ تم ایک بیمار ذہن کے آدمی بنتے جا رہے ہو۔ خود تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ جب کہ سیدھی سی بات ہے اپنے بچے کے مستقبل کے لیے اپنے گھر کو شاد و آباد رکھنے کے لیے تمہیں بھابی کا ہاتھ تھام لینا چاہیے۔"

وہ پیچھے ہٹ کر اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں۔ وہ مجھ سے ڈرے گی۔ میرے آگے گڑگڑائے گی۔ التجائیں کرے گی، روئے گی، معافی مانگے گی لیکن میں اسے تڑپاؤں گا، سزائیں دوں گا۔ میں اسے ایسی سزا دوں گا کہ تم سب دیکھو گے۔"

وہ منہ پھیر کر جانے لگا۔ جھورے نے آواز دی "رک جاؤ۔ کہاں جا رہے ہو۔ اپنا پتا ٹھکانا تو بتا دو۔"

"مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے وہ آئے گی تو میں بھی آؤں گا اور۔ اور۔۔۔۔"

وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ مٹھیاں بھینچ کر ذرا سا تلملایا پھر پلٹ کر تیزی سے چلا گیا۔ جھورا اسے دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا۔ اس کا پیچھا کرے یا نہ کرے۔ پچھلی بار جب وہ آیا تھا تو اس نے تعاقب کیا تھا۔ فرزانہ کو اطلاع دے دی تھی پھر فرزانہ دوسری صبح اپنے میاں کے ساتھ اس کے گھر گئی تھی۔ اس کے بعد بھی جھورے نے کوشش کی تھی کہ جانی کا تعاقب کرتا ہوا اس کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ جائے لیکن ناکامی ہوئی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اسی وقت فرید احمد آگئے۔ انہیں دیکھتے ہی جھورے نے کہا "جناب! ابھی جانی آیا تھا۔ ابھی ابھی ادھر گیا ہے۔"

انہوں نے فوراً ہی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا "کدھر گیا ہے؟"

"وہاں بس اسٹاپ کی طرف۔ آیئے۔"

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے ادھر جانے لگے۔ فرید احمد نے کہا "تم نے اسے کیوں نہیں روکا؟ کم از کم اس کا پیچھا ہی کرتے۔"

"وہ بہت ہی الٹے دماغ کا آدمی ہے۔ اسے خبر ہو جائے کہ میں اس کا پیچھا کرتا ہوں تو وہ لڑنا جھگڑنا شروع کر دے گا۔ میری اس بری طرح پٹائی کرے گا کہ بس کچھ نہ پوچھو۔"

وہ بس اسٹاپ پر پہنچ کر اسے تلاش کرنے لگے۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ جھورے نے

کہا "میرا خیال ہے وہ اسٹیشن گیا ہے۔ ٹرین میں بیٹھ کر کہیں جاتا ہے۔ پچھلی بار بھی یہی ہوا تھا۔"

فرید احمد اس کے ساتھ اسٹیشن پہنچے۔ وہاں بھی اسے تلاش کیا لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ دوپہر کو وہ جانی کے مکان کے دروازے پر پہنچے وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ شام کو بھی اس مکان کی طرف چکر لگایا مگر وہ جوں کا توں ویران پڑا ہوا تھا۔ دروازہ اسی طرح مقفل تھا۔

فرید احمد نے کہا "اگر وہ شہر میں کہیں چھپا رہتا ہے تو رات کو یقیناً اپنے مکان میں آکر سوتا ہوگا۔ ہم آدھی رات کے بعد آکر دیکھیں گے۔"

وہ آدھی رات کے بعد تقریباً ڈیڑھ بجے اس مکان کے دروازے پر پہنچے وہاں تالے کو دیکھ کر فرید احمد تھکے ہوئے انداز میں زینے پر بیٹھ گئے۔ سر تھام کر بولے "میں کیا کروں۔ کل میری بچی، بڑی امیدیں لے کر آرہی ہے۔ ہم نے اسے بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اب وہ آئے گی تو اپنا سینہ پیٹے گی۔ میں اپنی بچی کے لیے کیا کروں۔"

جھورے نے بے بسی سے سرہلا کر کہا "افسوس، کل کا دن کیا ہوگا۔ کل وہ آرہی ہیں ہمارے لیے خوشیاں لے کر اور ہم انہیں آنسو دیں گے۔ کل عید بھی ہے اور کل ماتم بھی ہوگا۔"

○☆○
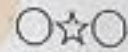
عید کی صبح طلوع ہوگئی، وہ سب خوش رنگ لباس پہنے ائرپورٹ کی عمارت میں پہنچے۔ وہ بظاہر خوش تھے مگر دل میں ماتمی اندیشے گھر کر رہے تھے۔

فرزانہ، فرید احمد اور ان کی بیگم کو سمجھا رہی تھی "آپ اپنے چہروں پر خوشی کے تاثرات رکھیں ذرا بھی اداسی یا مایوسی کو جگہ نہ دیں ورنہ رخسانہ یہیں رونا شروع کردے گی۔ اسے سمجھا منا کر گھر تک لے جانا ہے۔ وہیں ساری باتیں اسے بتائی جائیں گی۔"

فرید احمد نے کہا "تم اپنی خالہ جان کے ساتھ یہاں ٹھہرو میں ذرا دیکھ لوں۔ شاید جانی آیا ہو اور کہیں چھپا ہوا ہو۔ اسے دیکھ کر ہمیں تسلی تو ہو جائے گی کہ وہ موجود ہے۔"

فرزانہ نے کہا "آپ ابھی نہ جائیں۔ وہ دیکھیے طیارہ رن وے پر اتر رہا ہے۔ جھورے تم اسے تلاش کرو۔"

وہ تلاش کرنے کے لیے چل پڑا۔ ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ ایک ایک کو دیکھتا رہا مگر وہ نظر

نہیں آیا۔ نظر بھی کیسے آسکتا تھا کیونکہ جھورا اس کی نظر میں تھا۔ جدھر وہ تلاش کرنے جاتا تھا۔ ادھر سے جانی ہٹ جاتا تھا اور دوسری جگہ بھیڑ میں گم ہو جاتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر واپس فرید احمد کے پاس چلا گیا۔

اس وقت طیارہ رن وے پر ٹھہر چکا تھا۔ سیڑھی لگائی جارہی تھی۔ دروازہ کھل رہا تھا۔ مسافر ایک ایک کرکے زینے سے اتر رہے تھے۔ جانی بہت توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ کیوں دیکھ رہا تھا؟ جب کہ اسے نفرت تھی۔ وہ دشمن بنا ہوا تھا۔ اسے سزا دینا چاہتا تھا اس کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا پھر کیوں دیکھ رہا تھا؟

وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے دھوکا دے کر وہ کتنی خوش ہے؟ کتنی دولت کما کر لائی ہے؟ اکیلی آئی ہے یا جمشید بھی ساتھ ہے؟ کتنے دنوں کے لیے آئی ہے؟ اس کے لیے آئی ہے یا اپنے بچے کے لیے آئی ہے؟

پھر وہ نظر آگئی۔ طیارے کے دروازے پر آکر چند لمحوں کے لیے ٹھہر گئی۔ وہ بہت دور تھی مگر ایک دم سے دل میں آکر دھڑک رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بہت سارے جانے پہچانے لمحے جانی کے دل و دماغ پر دھاوا بولنے لگے۔ وہ ایک ایک زینہ اتر رہی تھی گہرے رنگ کے لباس میں گورے رنگ کا بدن کرن کرن جگمگا رہا تھا پھر وہ زینے سے نیچے آگئی۔ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اس کی چال میں تبدیلی آگئی تھی۔ شاید اس لیے کہ اب وہ پورے چہرے کے ساتھ اور پورے اعتماد کے ساتھ چل رہی تھی۔

وہ چلتے چلتے عمارت کی طرف آئی۔ تھوڑی دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ دوسری طرف، نظر آئے گی۔ وہ لگیج ہال کے پاس ذرا دور جاکر کھڑا ہوگیا۔

اس کے اندازے کے مطابق وہ لگیج ہال کے دروازے پر نظر آئی۔ اس کی نظریں ہجوم میں بھٹک رہی تھیں۔ یقیناً وہ اسے تلاش کر رہی تھی۔ اس کی امی آگے بڑھ کر لپٹ گئیں۔ وہ ماں سے لپٹ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کی بانہیں ماں کے لیے تھیں، نظریں کسی اور کے لیے تھیں۔ فرید احمد اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر شاید دعائیں دے رہے تھے پھر اس کی نظریں فرزانہ پر گئیں اسی وقت جانی نے بھی فرزانہ کو دیکھا پتا نہیں اس وقت تک وہ بھیڑ میں کہاں چھپی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہ زیورات سے لدی ہوئی تھی۔ رجب علی اس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ رخسانہ نے اسے دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھ کر

سیلی کے گلے لگ گئی فرزانہ نے اپنے شوہر رجب علی کی طرف اشارہ کیا۔ رخسانہ رجب علی کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی کچھ کہہ رہی تھی ان کا آپس میں تعارف ہو رہا تھا۔ شاید کچھ ہنسی مذاق بھی ہوا کیونکہ وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ ہنستے ہنستے پھر چپ ہو گئی پھر اسے جانی کا خیال آ گیا تھا۔

رجب علی سامان کی رسید لے کر لگیج ہال کی طرف چلا گیا۔ سامان کچھ زیادہ تھا۔ کسٹم والوں سے پاس کرانے میں دیر لگی۔ اتنی دیر میں رخسانہ ایک ایک سے پوچھ رہی تھی اور ہر ایک اسے کچھ نہ کچھ تسلیاں دے رہا تھا۔ وہ کبھی مطمئن ہو جاتی تھی کبھی اس کی نظریں ڈھونڈنے لگتی تھیں۔ آخر سامان آ گیا پھر وہ لوگ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جانے لگے۔

ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیگم اور فرزانہ، رخسانہ کے آس پاس بیٹھ گئیں۔ رجب علی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فرید احمد جھورے کے ساتھ سامان کو لے جانے کے لیے دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگے جب ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو رخسانہ نے پریشان ہو کر کہا "مجھے لگتا ہے جیسے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔ آخر جانی کیوں نہیں آئے؟"

بیگم نے کہا "میں تمہیں کہہ چکی ہوں بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جانی نے کہا کہ ہم تمہیں لینے آ جائیں۔ وہ بچے کے پاس رہے گا۔ ابھی گھر چل کر ملاقات ہو جائے گی۔"

فرزانہ نے اسے باتوں میں بہلانے کے لیے کہا "تم اپنی ہی باتیں کیے جا رہی ہو۔ یہ بتاؤ میری ملازمت کا کیا ہوا۔ میں نے پاسپورٹ وغیرہ تیار کر لیا ہے۔ جانے کے لیے تیار بیٹھی ہوں۔ اپنا وہ کلینک والا مکان بیچ ڈالا ہے۔"

رخسانہ نے کہا "میں تمہارے لیے تمام ضروری کاغذات لے آئی ہوں۔ وہاں مسز سلمٰی قادر تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تم جب چاہو یہاں سے روانہ ہو سکتی ہو۔ کیا ہمارے دولہا بھائی بھی تمہارے ساتھ جائیں گے؟"

رجب علی نے کہا "بھابی، آپ میری فکر نہ کریں۔ میں لندن جیسے ماحول میں رہ نہیں سکتا۔ پہلے ہی فرزانہ سے کہہ دیا ہے۔ اگر یہ اپنی ضد پوری کرنے کے لیے لندن جانا چاہتی ہیں، ملازمت کرنا چاہتی ہیں، کچھ تجربات حاصل کرنا چاہتی ہیں تو شوق سے جائیں۔

میں یہیں اچھا ہوں۔"

رخسانہ نے پوچھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بیوی وہاں رہے اور شوہر یہاں؟"

"اب یہی دیکھنا ہے کہ جس میں کشش زیادہ ہوگی وہ ادھر کھنچا چلا جائے گا یا تو میں ان کے پاس چلا جاؤں گا یا یہ میرے پاس آ جائیں گی۔"

رخسانہ نے مسکراتے ہوئے کہا "میرا دعویٰ ہے کہ میری سہیلی میں زیادہ کشش ہے۔ آپ ہی ادھر کھنچے چلے جائیں گے۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ اسی طرح ہنستے بولتے راستہ کٹ گیا۔ وہ ناظم آباد والے مکان کے سامنے پہنچ گئے ٹیکسی سے اتر کر جب بیگم اپنے دروازے کا تالا کھولنے لگیں تو رخسانہ نے ٹھٹک کر پوچھا "یہ کیا، آپ تو کہہ رہی تھیں کہ جانی یہاں بچے کے ساتھ ہیں۔"

فرزانہ نے رخسانہ کا ہاتھ تھام کر کہا "جانی یہاں نہیں ہیں۔ وہ بچے کو لے گئے ہیں۔"

رخسانہ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فرزانہ کو تکنے لگی۔ جیسے دیکھ نہ رہی ہو بلکہ کہیں دور سوچنے لگی ہو۔ ایک طرف فرزانہ نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ دوسری طرف بیگم نے اس کے بازو کو تھام کر کہا "بیٹی اندر چلو۔"

وہ ایک جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھ چھڑا کر بولی "میں نہیں جاؤں گی۔ تم لوگوں نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔ مجھے دھوکا دیتے رہے ہو۔ میں اپنے گھر جاؤں گی۔"

"بیٹی! ادھر تالا پڑا رہتا ہے۔ ہم پچھلی رات بھی وہاں چکر لگاتے رہے لیکن وہ نہیں تھا۔ معلوم نہیں کہاں بچے کے ساتھ چھپ گیا ہے۔ ہم سے ملتا بھی نہیں ہے۔"

یک بیک رخسانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے پوچھا "وہ کیوں چلے گئے؟ کامی کو کیوں لے گئے؟ کیا جمشید نے مجھ سے درست کہا تھا؟"

فرزانہ نے کہا "پتا نہیں جمشید نے کیا لگائی بجھائی کی ہے تم اندر چلو۔ اس طرح ضدی بن کر کھڑی رہو گی تو محلے والے تماشا دیکھیں گے۔ سہولت سے کچھ سوچنا ہو گا۔ کچھ کرنا ہو گا۔ ہم سب مل کر جانی کو تلاش کریں گے۔"

وہ اسے سمجھا منا کر کمرے میں لے آئی۔ جون کا مہینہ تھا سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ صبح

دس بجے سے ہی یوں لگ رہا تھا جیسے انگارے برس رہے ہوں بیگم نے سیلنگ فین کو آن کیا۔ رخسانہ دوپٹے سے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولی "آپ لوگوں نے مجھ سے یہ باتیں کیوں چھپائیں؟"

"بیٹی! وہاں تمہیں یہ باتیں معلوم ہوتیں تو سکون سے اتنے دن نہ گزار سکتیں۔"

"آپ نے کامی کو کیوں لے جانے دیا؟"

"میں کیا کرتی؟ اسے روکتی تو وہ محلے میں ہنگامہ شروع کر دیتا۔ سارے محلے والوں کو معلوم ہو جاتا کہ تم جھوٹ بول کر دھوکا دے کر لندن گئی ہو۔ ہم سب کا مذاق اڑایا جاتا۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ ہم مجبوراً خاموش رہے اور وہ بچے کو لے کر چلا گیا۔"

رخسانہ سامنے دیوار کو تک رہی تھی اور سن رہی تھی پھر اس نے کہا "اب میرے پاس کیا رہ گیا ہے؟ وہ میرے پاس کیا لینے آئیں گے؟ میں اپنی ساری اہمیت کھو بیٹھی ہوں۔ جو کچھ میرے پاس تھا۔ اسے جھوٹ و فریب نے کھالیا۔ ایک بچے کی آس تھی۔ وہی ایک بیچ کی کڑی تھا۔ اسے بھی وہ لے گئے۔ میں کیا کروں میں کہاں جاؤں کہاں تلاش کروں؟"

وہ سب سر جھکائے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ رخسانہ نے کہا "تم سب خاموش کیوں ہو؟ فرزانہ کچھ بولو۔ مجھے گالیاں دو۔ مجھ پر لعنت بھیجو۔ میں نے اپنے شوہر کو ایک نہیں دو بار دھوکا دیا۔ مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے اور یہ کتنی بڑی سزا ہے۔ میں شوہر کے ساتھ ساتھ بچے سے بھی محروم ہو گئی ہوں۔"

پھر وہ اپنی امی کی طرف پلٹ کر بولی "اور امی، میرا گھر برباد کرنے والی آپ ہیں آپ نے داماد کی مخالفت میں یہ نہیں سوچا کہ ان کے خلاف مجھے بھڑکائیں گی اور کوئی ایسا مشورہ دیں گی جو ان کے مزاج کے خلاف ہوا تو میرا گھر برباد ہو گا۔ میں آپ کی باتوں میں آ گئی میں آپ کو کیا بولوں۔ کیا الزام دوں۔ قصور تو میرا ہی ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو تھام رکھا تھا چہرہ اور ہاتھ آنسوؤں سے تر بہ تر ہو رہے تھے پھر اس نے آنسو پونچھنے کے لیے اپنے دوپٹے کو سنبھالنا چاہا۔ سر اٹھایا تو ایک دم سے رونا بند ہو گیا۔ آنکھوں کو یقین نہیں آیا کہ وہ جانی کو

دیکھ رہی ہے وہ سامنے ہی دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ ایک قدم بڑھا کر اندر آ گیا۔

سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سب کی نظریں اس پر مرکوز تھیں جانی کا حلیہ عجیب تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے مہینوں سے برسوں سے پریشان حال رہا ہو۔ سر کے بال بڑھے ہوئے اور بکھرے ہوئے تھے۔ داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں کسی قدر اندر کو دھنس گئی تھیں۔ بیمار بھی نظر آتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رخسانہ تڑپ گئی۔

وہ جانی کہہ کر آگے بڑھی مگر وہ آگے نہیں بڑھا۔ وہ اور آگے بڑھی۔ وہ پتھر بنا رہا پھر وہ قریب پہنچ گئی۔ دل میں ڈر رہی تھی یک بیک وہ بھڑک نہ جائے۔ اس کے غصے کو خوب سمجھتی تھی پھر اس نے سہمے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اس کے بازو کو تھام لیا۔ وہ ایک دم پتھر کا مجسمہ لگ رہا تھا۔ کچھ نہیں بول رہا تھا۔ صرف اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

اس کے تیور دیکھ کر دور ایک گوشے میں کھڑی ہوئی فرزانہ اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔ وہ بھی جانی کے مزاج کو اور غصے کو خوب سمجھتی تھی۔ اس درندے کے ہاتھوں مار کھا چکی تھی۔ جب بھی اس مار کی یاد آتی تھی تو بدن دکھنے لگتا تھا۔

رخسانہ نے آہستگی سے پوچھا "جانی! مجھے مارو گے؟ مجھے جان سے مار ڈالو مگر ایک بات کا یقین کر لو۔ جب تم یقین کر لو گے تو میں خوشی سے تمہارے ہاتھوں مر جاؤں گی۔ جانی! میں تمہاری اور صرف تمہاری رہی جہاں بھی گئی کسی نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں اپنے بچے کی قسم کھاتی ہوں۔ خدا اور رسولؐ کو گواہ بناتی ہوں۔ تم ایک بار اپنی زبان سے یہ کہہ دو کہ رخسانہ تم جھوٹی ہو۔ فریبی ہو۔ مکار ہو۔ ناقابل اعتبار ہو۔ مگر باحیا ہو۔ عورت کی شرم رکھنا جانتی ہو۔ تو بس اتنا سن کر خوشی سے مر جاؤں گی۔"

وہ گم صم کھڑا رہا جیسے گونگا ہو گفتار بھول گیا ہو۔ جیسے بہرا ہو، سماعت سے محروم ہو گیا ہو۔ رخسانہ نے اسے محبت سے جھنجوڑتے ہوئے کہا "میری بات کا جواب نہیں دو گے؟ دیکھو، میں وہی ہوں جس کے سامنے پہنچتے ہی تم پتھر سے موم بن جایا کرتے تھے۔ چلو اتنا ہی بتاؤ کہ میرا کامی کیسا ہے؟"

پہلی بار جانی کے بدن میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ اس کی لب ہلے پھر وہ بڑے ہی مستحکم لہجے میں بولا "کامی تمہیں نہیں ملے گا۔ تم اس کے لیے عدالت کے دروازے کھٹکھٹا سکتی

ہو۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی "نہیں جانی! نہیں میں کاسی کے لیے بھی اصرار نہیں کروں گی۔ تم مجھے چھوڑ دو گے' پھر بھی میں تمہاری شریک حیات بن کر ساری عمر گزار دوں گی میں تمہاری زبان سے صرف یہ سننا چاہتی ہوں کہ تم مجھے بے حیا نہیں سمجھتے ہو۔"

"میں سمجھ کر بھی تمہارا کیا بگاڑ لوں گا۔ میں جہاں جاتا ہوں سب تمہاری حمایت کرتے ہیں۔ جس سے پوچھتا ہوں۔ وہ تمہیں معاف کرنے کے لیے کہتا ہے میں نے عالم دین سے فتویٰ حاصل کیا۔ وہ کہتے ہیں' میری مرضی پر ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں چھوڑ دوں اور چاہوں تو تمہیں اپنے گھر میں بسالوں لیکن تمہیں نہ چھوڑنے' تم سے صلح کرنے اور تمہیں رکھ لینے میں نیکی ہے۔ مجھے اس کا اجر ملے گا مگر کیا مل رہا ہے۔ ایک بار نہیں بار بار دھوکے مل رہے ہیں۔ میں کتنی بار عالم دین سے فتویٰ حاصل کروں؟"

"اب ایسا نہیں ہو گا جانی' چاہے مجھ سے کیسی قسم لے لو۔ مجھے سب سے بڑی سزا دے دو۔ مجھے ہر طرح سے آزمالو۔ میں منہ سے اُف نہیں کروں گی۔ تمہارے ہاتھوں سے سزا پاؤں گی۔ تم خود سوچو۔ اگر میں بے حیا ہوتی۔ لالچی ہوتی تو تمہارے ہاتھوں سزا پانے کے لیے کبھی واپس نہ آتی۔"

جانی نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا "تمہارا فیصلہ یہاں نہیں' ہمارے گھر میں ہو گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی "میں ابھی چلتی ہوں۔ چلو۔"

"ایسے نہیں۔ اپنے یہ سینڈل اتار دو۔"

رخسانہ نے تعجب سے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے سختی سے کہا "تم نے سنا نہیں۔ اپنے سینڈل اتار دو۔"

وہ پیچھے ہٹ کر سینٹر ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ اپنے دونوں سینڈل اتار دیے۔ ننگے پاؤں کھڑی ہو گئی۔ تب جانی نے کہا "میں اپنی ٹیکسی میں بیٹھ کر جا رہا ہوں۔ تم ٹیکسی کے پیچھے پیچھے پیدل آؤ گی۔ ننگے پاؤں چلو گی اور میرے گھر تک پہنچو گی۔ اگر تم میں یہ حوصلہ ہے اور تم یہ سزا برداشت کر سکتی ہو تو چلی آؤ۔"

"میں وہی کروں گی جو تم چاہو گے۔"

بیگم جلدی سے آگے بڑھ کر بولیں "ہوش میں تو ہو؟ ایسی جہنم کی گرمی پڑ رہی ہے باہر لو چل رہی ہے۔ سڑکوں پر سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے' انگارے بچھا دیے گئے ہوں۔ اس پر تم ننگے پاؤں چل کر ناگن چورنگی تک جاؤ گی۔ کیا تم زندہ رہ سکو گی؟"

"امی! خبردار ہمارے درمیان اب کبھی نہ آنا۔ آپ ہی کی باتوں میں آ کر میری قسمت پھوٹ گئی ہے۔ میں زندہ رہوں یا مر جاؤں مگر میں ان کے حکم کی تعمیل کروں گی۔ جو سزا ملے گی۔ اسے قبول کروں گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔ رجب علی نے کہا "مسٹر جانی! ہم آپ کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتے لیکن ازراہ انسانیت آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی شریک حیات کو ایسی سزا نہ دیں۔ یہ سزا نہیں ظلم ہے۔"

"میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ سبھی لوگ معاف کرنے کے لیے کہتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں۔ اگر خطاکار کو اسی طرح معاف کر دیا جائے اور اس کو سزا نہ ملے تو ایسی خطائیں عام ہوتی رہیں گی۔"

وہ پلٹ کر دروازے کی طرف گیا پھر وہاں رک کر اس نے ایک نظر فرزانہ پر ڈالی۔ اس کے بعد رجب علی کو دیکھ کر کہا۔ اپنا اپنا انداز جدا ہوتا ہے۔ آپ کا انداز شاعرانہ ہے۔ میرا جارحانہ ہے۔"

وہ باہر آ گیا۔ تیزی سے چلتا ہوا رخسانہ کے قریب سے گزرتا ہوا ٹیکسی کی اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کر دیا پھر کھڑکی کے پار رخسانہ کو دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی گاڑی کی طرف آ رہی تھی۔ گھر کے دروازے پر بیگم' فرزانہ اور رجب علی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ جانی پھر ٹیکسی سے نکلا۔ تیزی سے قریب آ کر دھمکی دینے کے انداز میں بولا "صرف رخسانہ میری گاڑی کے پیچھے پیچھے چلتی رہے گی۔ اگر کوئی اس کے ساتھ آئے گا یا ہمارا پیچھا کرے گا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

وہ پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا اس وقت تک رخسانہ گاڑی کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سر پر آنچل رکھ لیا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے

گی۔ وہ پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

اگرچہ یہ بہت ہی برا لگ رہا تھا۔ ایک مضحکہ خیز تماشا تھا۔ تاہم عبرت کا مقام تھا۔ اسی گھر سے وہ رخسانہ کو دلہن بنا کر لے گیا تھا۔ اسی ٹیکسی میں بٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ دلہن عزت بن کر رہنے کے لیے آئی تھی۔ آج اس دلہن نے اپنا مان کھو دیا تھا۔ اس لیے بابل کے گھر سے ننگے پاؤں اپنے سسرال جا رہی تھی۔

گیارہ بج کر تیس منٹ ہوئے تھے۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ دھوپ اتنی تیز' اتنی شدید تھی کہ کولتار کی سڑک جگہ جگہ سے پگھلتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور زمین ایسے جل رہی تھی جیسے پاؤں تلے انگارے بچھا دیے گئے ہوں۔

اور وہ چلتی جا رہی تھی۔ جانی گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھا کر دور جاتا اور رک جاتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قریب آتی تھی۔ وہ گاڑی کو آگے بڑھا دیتا تھا۔ عقب نما آئینے میں اسے دیکھتا رہتا تھا۔ اس کے پاؤں کی طرف بھی نظر جاتی تھی۔ وہ کیسے چل رہی تھی۔ یہ چلنے والی جانتی تھی۔ جب وہ قریب آئی تو جانی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس سنگ دل کی بے نیازی جیسے کہہ رہی تھی۔

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

ناظم آباد کے پل تک پہنچتے پہنچتے آدھا گھنٹا گزر گیا۔ حالانکہ فاصلہ مختصر تھا۔ اگر ایک رفتار سے چلا جاتا تو صرف دس منٹ میں وہاں پہنچ سکتے تھے لیکن وہ کس طرح چل رہی تھی یہ اس کے پاؤں کے چھالے بتا رہے تھے۔ اس کے صرف پاؤں ہی نہیں بلکہ پورا جسم سرخ ہو رہا تھا۔ گرمی سے تپ رہا تھا اسے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اپنے وجود کے اندر سے دھواں ہی دھواں نکل رہا ہو۔

نارتھ ناظم آباد کے علاقے میں پہنچ کر وہ ڈگمگانے لگی۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ پاؤں نہیں اٹھ رہے تھے۔ پاؤں اٹھا کر آگے رکھتے وقت لرز جاتی تھی کہ پھر وہی انگارے ملیں گے پھر نئے چھالے بنیں گے۔ اپنے گھر کی جنت تک پہنچنے کے لیے ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑبڑانے کے انداز میں بڑے ہی کرب سے بولی۔

"میرے اللہ میرے مالک' مجھے حوصلہ دے میں بچپن سے سنتی آئی ہوں کہ پل صراط

ایک آزمائشی راستہ ہے جو اس راستہ سے گزر جائے گا وہ سیدھا جنت کے دروازے پر پہنچے گا۔ جو گنہگار ہو گا جس کے قدم لڑکھڑائیں گے۔ جو گر جائے گا۔ وہ جہنم کی آگ میں پہنچے گا۔ میں گرنا نہیں چاہتی میرے مالک' مجھے حوصلہ دے۔"

حیدری کے پاس کچھ لوگوں نے ذرا توجہ دی۔ تعجب سے دیکھا کہ ایک بے حد حسین لڑکی ننگے پاؤں تپتی ہوئی سڑک پر سے گزر رہی ہے جب کہ اس کے آگے آگے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک خالی ٹیکسی چلی جا رہی ہے۔ یہ نصیب کی بات تھی کہ کراچی جیسے مصروف شہر میں کچھ لوگوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ تیز رفتار گاڑیوں سے گزرنے والوں نے بھی یقیناً دیکھا ہو گا اور نظر انداز کر دیا ہو گا۔ ایک بوڑھے شخص نے اپنی چھتری کو سنبھالتے ہوئے قریب آ کر پوچھا "بیٹی! تم کون ہو؟ اس طرح کیوں جا رہی ہو؟ کیا تمہارے پاس چپل نہیں ہیں۔ کیا تمہارے پاس بس کا کرایہ بھی نہیں ہے؟"

وہ چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔ اس کی نگاہیں سامنے سیدھی ٹیکسی پر جمی ہوئی تھیں چہرہ پسینے سے تربتر تھا اور وہ چہرہ ایسا سرخ تھا جیسے آگ دہک رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ اگر بولنا بھی چاہتی تو شاید ہونٹوں کو جنبش نہ دے سکتی۔

بڑے میاں نے اس کے سر پر چھتری کا سایہ کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولنے لگے "تم بولتی کیوں نہیں ہو؟ میرے ساتھ چلو میں بس میں تمہارے گھر تک پہنچا دوں گا۔ کہاں رہتی ہو؟"

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی گھنے درخت کی چھاؤں میں آ گئی ہو۔ وہ چھتری رحمت کی ٹھنڈی چھاؤں بن گئی تھی۔ اگرچہ پاؤں اسی طرح جل رہے تھے۔ کولتار کی سڑک گرم گرم سلاخوں کی طرح تلوؤں کو داغ رہی تھی۔ چھالے صرف تلوؤں میں نہیں تھے۔ وہ تلوؤں سے اوپر جگہ جگہ پھول کی طرح کھل رہے تھے۔ شگوفوں کی طرح پھوٹ رہے تھے۔ جب ان میں سے پانی بہتا تو کسی قدر ہلکی سی ٹھنڈک ہوتی پھر وہی جلن شروع ہو جاتی تھی۔

وہ چھتری کے سائے میں چند قدم تک چل سکی پھر چونک گئی۔ جانی بار بار ٹیکسی کا ہارن بجا رہا تھا۔ جیسے ڈانٹ رہا ہو۔ جھڑکیاں دے رہا ہو۔ وہ اس کے رشتے داروں کو دھمکیاں دے چکا تھا کہ کوئی ان کے پیچھے نہ آئے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ صرف

اپنے سہارے چلتی رہے گی۔ کسی کی مدد حاصل نہیں کرے گی۔ یہ بات سمجھ میں آتے ہی اس نے اپنے لرزتے ہوئے ایک ہاتھ کو اٹھا کر چھتری کو ایک طرف ہٹا دیا۔

بڑے میاں نے حیرانی سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ بڑے میاں نے پھر ساتھ چلتے ہوئے سایہ کرتے ہوئے پوچھا "تم کیا کر رہی ہو؟ تم سائے میں چلنا کیوں نہیں چاہتیں؟"

اس نے پھر ایک ہاتھ سے چھتری کو ہٹا دیا۔ بڑی مشکل سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی "باباجی۔ آپ جائیں۔ میں ایسے ہی جاؤں گی۔"

"مگر ایسے ہی کیوں جاؤ گی؟"

"جو عورت.... عورت سائے میں رہ کر.... رہ کر دھوپ کو.... کو بھول جاتی ہے۔ اس کو دھوپ میں..... دھوپ میں چلنا چاہیے۔ سزا.... سزا پانا چاہیے...."

وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی جیسے اپنے سینے کا تمام زور لگا کر الفاظ ادا کر رہی ہو پھر وہ لڑکھڑا گئی۔ باباجی نے اسے سنبھالنا چاہا۔ اس سے پہلے ہی اس نے خود سنبھل کر ان کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ غصہ دکھاتے ہوئے' دانت پیستے ہوئے یوں بڑے میاں کو دیکھا کہ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس وقت تک کچھ اور لوگ پیچھے چلے آرہے تھے۔ بڑے میاں نے کہا "یہ عجیب پاگل لڑکی ہے۔ میں سائے میں لے جانا چاہتا ہوں سایہ قبول نہیں کرتی۔ میں بس میں بٹھا کر لے جانا چاہتا ہوں' یہ انکار کرتی ہے۔ اس کے پیروں کی حالت دیکھو۔ دیکھا نہیں جاتا۔ چھالوں سے رستا ہوا پانی میری آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔ میری آنکھیں دھندلا رہی ہیں۔ یا خدایا! یہ کیا منظر ہے؟"

محبت کے جلتے ہوئے صحرا میں وہ آبلہ پا چلی جا رہی تھی۔ ایک عورت تیزی سے چلتے ہوئے اس کے برابر آئی "بہن! تم کون ہو؟ صورت شکل سے کسی شریف گھرانے کی لگتی ہو۔ لباس بھی اچھا اور مہنگا پہنا ہے۔ ایسا کپڑا ہمارے ہاں نہیں ملتا۔ تم کہاں جا رہی ہو۔ مجھے بہن سمجھ کر بولو۔"

وہ سامنے ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے چلتی رہی۔ اس عورت نے ذرا سختی سے کہا "توبہ ہے کیا پاگل ہو؟ میری باتیں سنائی نہیں دیتیں؟ کیا بہری ہو؟ دیکھو جواب نہیں دوگی تو ہم تمہیں پکڑ کر پاگل خانے پہنچا دیں گے۔"

تب بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ چلتی رہی۔ اس عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اپنی طرف کھینچنا ہی چاہتی تھی کہ رخسانہ نے ایک زور کی چیخ ماری۔ جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا پھر اس عورت کے گریبان کو پکڑ لیا۔ وہ عورت اک دم سے گھبرا گئی۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر ایک جھٹکے سے اپنے گریبان کو چھڑایا پھر پلٹ کر بھاگتے ہوئے کہنے لگی "ارے! یہ تو پاگل ہے۔"

پیچھے سے کچھ لوگوں کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ کسی نے کہا "پاگل تو ہم ہیں۔ بس اسٹاپ کو پیچھے چھوڑ کر اس کے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔"

کسی بوڑھے نے کہا "کیوں نہیں جاؤ گے۔ جوان لڑکی جو ہے۔"

آوازیں دور ہونے لگیں۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔ پیچھے والے پیچھے ہی رہ گئے تھے۔ کسی پاگل لڑکی کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ اگر معلوم ہوتا کہ وہ سزا کاٹ رہی تھی تب بھی کوئی اس کے ساتھ نہ آتا کیونکہ اس دنیا میں کوئی کسی کی سزا نہیں کاٹتا۔ اپنا دکھ آپ جھیلنا پڑتا ہے۔

وہ اب تھرتھرا رہی تھی۔ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ کوئی ظلم کی انتہا تھی۔ سورج سوا نیزے پر ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سر اس قدر گرم ہو گیا تھا کہ چکرا رہا تھا۔ آس پاس کا ماحول آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔ آہستہ آہستہ نشہ چھا رہا تھا۔ جیسے شرابی ڈگمگاتے ہوئے چلتے ہیں۔ وہ اسی طرح چل رہی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ اس کے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ بس اتنا معلوم تھا کہ ہر قدم اس کی منزل کو قریب لا رہا ہے۔

اب وہ نخی حسن کے نسبتاً ویران راستے سے گزر رہی تھی۔ ناگن چورنگی زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ اسی وقت ایک ٹیکسی قریب آکر رکی اس میں سے فرید احمد' ان کی بیگم فرزانہ اور رجب علی باہر نکلے اور تیزی سے چلتے ہوئے رخسانہ کے آس پاس پہنچ گئے۔ اسے آواز دی لیکن جواب نہیں ملا۔ وہ نشے کی حالت میں' جنون کی حالت میں آگے اور آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ بول رہی تھی۔ ہونٹ ہل رہے تھے۔ آواز نہیں نکل رہی تھی۔

فرزانہ اس کی حالت دیکھ کر تڑپ گئی۔ تیزی سے ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "یہ ظلم کی انتہا ہے۔ جانی تم درندے ہو۔"

رجب علی بھی جانی کے قریب پہنچا پھر اس نے کہا "جانی! انسان بنو اور فوراً بھابی کو ٹیکسی میں بٹھا کر لے جاؤ۔"

جانی نے ایک جھٹکے سے ٹیکسی کو آگے بڑھایا۔ رجب علی پیچھے رہ گیا۔ ٹیکسی کی رفتار اور بڑھ گئی۔ وہ دور چلا جا رہا تھا۔ رجب علی دانت پیس کر مٹھیاں بھینچ کر ادھر دیکھتا رہا فرزانہ نے کہا "وہ کسی کی بات نہیں سنیں گے۔ میں انہیں خوب جانتی ہوں۔"

پھر وہ دونوں پلٹ کر رخسانہ کے پاس آئے۔ وہاں اس کی امی اور ابو سمجھا رہے تھے "بیٹی! آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ۔"

فرزانہ نے بھی التجا کی۔ رجب علی نے بھی سمجھایا۔ تب وہ اپنی تھرتھرائی ہوئی قوتوں کو کام میں لاتے ہوئے بڑی مشکل سے بولی "مجھ کو بولنے پر مجبور نہ کرو۔ بولوں گی تو گر پڑوں گی۔ مجھ کو اپنے اعتماد پر چلنے دو۔ چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔"

اس کی آواز میں ایسی لرزش، لہجے میں ایسی التجا اور التجا میں ایسا درد و کرب تھا کہ سب اس سے ذرا دور ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ سر جھکا کر چلنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے رخسانہ کو سہارا دیا یا اسے ٹیکسی میں زبردستی بٹھا کر پہنچایا تو جانی کبھی اسے معاف نہیں کرے گا۔ رجب علی سے یہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ فوراً ہی مڑ کر دور کھڑی ہوئی ٹیکسی کے پاس گیا پھر اس میں بیٹھ کر کہا "ناگن چورنگی کی طرف چلو۔"

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ جانی کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ ٹیکسی کو احاطے کے باہر روکا۔ جانی باہر ہی کھڑا تھا۔ رجب علی نے ٹیکسی سے باہر آ کر دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کیا پھر غصے سے سنسناتے ہوئے پاس آ کر بولا "یہ کیسی درندگی ہے؟ کیا تمہیں ذرا بھی اپنی شریک حیات پر ترس نہیں آتا؟ کیا تم انسان نہیں ہو؟"

"میں آدھا انسان ہوں، آدھا شوہر ہوں، وہ آدھی عورت ہے، آدھی بیوی ہے۔ اس نے پلاسٹک سرجری سے ایک عورت کا چہرہ مکمل کر لیا۔ بیوی کا چہرہ میں مکمل کر رہا ہوں۔ جو یہ سزا پا کر ہی مکمل ہو گا۔"

وہ جھنجلا کر بولا "کوئی ضروری نہیں ہے کہ بیوی کو سزا دینے کے لیے غیر انسانی سلوک کیا جائے۔"

وہ بڑے تحمل سے بولا "مجھے غیر انسانی سلوک پر مجبور کیا گیا ہے۔ جنہوں نے مجبور کیا

آپ ان سے کیوں نہیں پوچھتے؟"

رجب علی ذرا ٹھنڈا پڑ گیا۔ ذرا نرم لہجے میں بولا "میں جانتا ہوں۔ آپ کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے مگر اب بہت ہو چکا۔ خدا کے لیے بھابی کو معاف کر دو۔ انہیں گاڑی میں بٹھا کر لے آؤ۔"

جانی نے دور دیکھتے ہوئے کہا "اس کی ضرورت نہیں ہے وہ دیکھو وہ چلی آ رہی ہے۔"

رجب علی نے ادھر دیکھا۔ وہ بڑی مستقل مزاجی سے بڑے حوصلے سے ڈگمگاتے ہوئے ڈولتے ہوئے، لڑکھڑاتے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلائے، کبھی اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے، کبھی گردن کو سہلاتے ہوئے کبھی اپنے سر کے بالوں کو نوچتے ہوئے چلی آ رہی تھی۔ رجب علی نے تڑپ کر کہا "جانی! خدا کے لیے اسے معاف کر دو۔ دیکھو، جب مجرم سزا کے اختتام کے قریب پہنچتا ہے تو اس کی باقی ماندہ سزا معاف کر دی جاتی ہے۔ تم بھی معاف کر سکتے ہو۔"

جانی نے کہا "ریس میں اول آنے والا گھوڑا جہاں سے اپنی دوڑ شروع کرتا ہے وہیں آ کر اپنی دوڑ ختم نہ کرے تو انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔"

رجب علی دانت پیستے ہوئے رخسانہ کے پاس تیزی سے جانے لگا۔ اس کے پیچھے فرید احمد، بیگم اور فرزانہ چلے آ رہے تھے۔ جانی وہاں سے پلٹ کر اپنے مکان میں آ گیا۔ کمرے میں ممدو سپاہی کی بوڑھی والدہ بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا "ماں جی! میری بیوی آ رہی ہے۔"

یہ سنتے ہی بوڑھی خاتون بچے کو لے کر اٹھ گئیں "کہاں ہے؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ میں اپنی بہو کا استقبال کروں گی۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے جانی کے ساتھ برآمدے میں آئیں۔ جانی نے دور آنے والی رخسانہ کی طرف اشارہ کیا۔ بوڑھی خاتون نے اپنی آنکھوں کے اوپر ایک ہتھیلی کا چھجہ بناتے ہوئے غور سے دیکھا پھر پوچھا "جانی! کیا تم نے وہی کیا ہے جو مجھ سے کہا تھا؟"

"جی ہاں، ماں جی!"

"کیا یہ اپنے گھر سے اتنی دھوپ میں ننگے پاؤں چلتی آ رہی ہے؟"

"جی ہاں' ماں جی!"

"بس کر و رندے! جا اسے اٹھا کر لے آ۔"

"نہیں ماں جی! اسے خود ہی اپنے پیروں پر چل کر آنے دیں۔"

"میں کہتی ہوں جانی! اسے اٹھا کر لے آ۔ نہیں تو وہ مر جائے گی۔"

"نہیں مرے گی۔" جانی نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر سینہ تان لیا' پھر گردن اکڑا کر بولا "وہ جانی کی عورت ہے جان دے کر بھی دروازے تک پہنچے گی۔"

رخسانہ چلتے چلتے لمحوں کے لیے رک گئی۔ اس نے سر اٹھا کر سامنے اپنے مکان کی طرف دیکھا۔ وہ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ مکان کے برآمدے میں کھڑا ہوا جانی بھی دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رخسانہ کی دم توڑتی ہوئی قوتوں کو جیسے ایک نئی زندگی ملی۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔ لڑکھڑائی' سنبھل گئی' پھر آگے بڑھنے لگی۔ پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ وہ چل رہی تھی۔ کیسے چل رہی تھی' یہ اس کا خدا جانتا تھا۔

وہ احاطے میں داخل ہو گئی۔ اب وہ کسی کمزور بوڑھی عورت کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پورا بدن لرز رہا تھا۔ چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور آگ کی طرح سرخ تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پانی میں آگ لگاتے ہوئے آئی ہو۔ وہ کسی طرح برآمدے کے زینے تک پہنچ گئی۔ ممدو کی بوڑھی والدہ نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹی! مجھے افسوس ہے تجھے یہ سزا ملی۔ لے اپنے بچے کو سنبھال۔"

رخسانہ کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ جھوم رہی تھی' جیسے نشے میں ہو۔ عالم جنون میں ہو' جیسے اپنے آپ کو بھول گئی ہو۔ بس ایک ہی بات جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے۔ وہ کہاں ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ سامنے نظر آیا۔

اس نے بچے کو گود میں نہیں لیا۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ ایک تنکا بھی اٹھا سکتی۔ وہ جانی کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے تھرتھراتے ہوئے دونوں بازوؤں کو اس کی طرف آہستہ آہستہ اٹھا کر پھیلایا۔ وہ بازو ایک لمحے میں فریادی تھے۔ دوسرے لمحے وہ چکرا گئی پھر اس پر آ گری۔ جانی نے فوراً اسے سنبھال لیا۔

وہ اسی کے بازوؤں میں سنبھلنے لگی تھی لیکن بے ہوش ہو گئی تھی۔ جس سہارے کے لیے آئی تھی اسے پہچان نہیں سکتی تھی پھر اس کا وقت عالم سکوت میں گزرنے لگا۔ اس

کے چاروں طرف خاموشی تھی۔ وجود کے اندر سناٹا تھا۔ دماغ چپ اور بے حس تھا۔ ساری کائنات ایسی ویران ایسی چپ چاپ تھی کہ ایک ذرا سی بھی آواز کہیں سے نہیں آتی تھی۔

اس نے دیکھا' وہ بادلوں کے سفید بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ بہت سی پریاں اس کے زخمی تلوؤں کو بادلوں کے پھاہوں سے سہلا رہی ہیں' مرہم رکھ رہی ہیں۔ اس کی تیمارداری کر رہی ہیں۔ غلام ہاتھ باندھے اس کے آس پاس سفید لباس میں سر جھکائے کھڑے ہیں پھر ایک فرشتہ اپنے پر پھیلائے ہوئے نمودار ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "رخسانہ بیگم! تمہارے لیے خوش خبری ہے۔ تم نے پل صراط کو پار کر لیا اور تم جنت کے دروازے سے داخل ہو کر یہاں پہنچ گئی ہو۔ اب یہ جنت تمہارے لیے ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی "نہیں نہیں۔ مجھے ایسی جنت نہیں چاہیے جہاں میرا پیار نہ ہو' میرا شوہر نہ ہو۔ میرا بچہ نہ ہو۔ میں ایسی جنت میں نہیں رہوں گی۔ جانی! جانی!"

اسے جانی کی آواز سنائی دی "ہاں! رخسانہ میں تمہارے پاس ہوں۔ دیکھو' آنکھیں کھولو۔ میں تمہارے پاس ہوں۔"

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ جانی اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ بستر کے ایک طرف اس کے ابو کھڑے تھے۔ اس کی امی نے اپنے نواسے کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ اس نے بس ایک نظر ادھر ڈالی پھر جانی کو دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی۔ کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟

اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے تصدیق کے لیے اپنے ایک ہاتھ کو جنبش دی۔ اسے کمزوری کا احساس ہوا' لیکن وہ ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھتا ہوا جانی کے پاس پہنچا پھر اس نے چھو کر دیکھا یقین ہو گیا کہ جانی اس کے پاس ہے تو وہ مارے خوشی کے کانپنے لگی۔ اس کا چہرہ کھل گیا۔ آنکھوں میں ڈھیر ساری روشنیاں جگمگانے لگیں پھر وہ جگمگاتی ہوئی روشنیاں بھیگنے لگیں۔ آنکھوں کی دہلیز سے بہنے لگیں۔ چہرے کے گلاب پر شبنم شبنم ہو کر مسکرانے لگیں۔

○☆○

وہ بستر پر اوندھے منہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ نرم تکیے میں دھنسا ہوا تھا۔

گہری نیند میں رخسانہ کی رس بھری آواز سنائی دی "جانی! اٹھ بھی جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔"

وہ اسی طرح سوتا رہا پھر اسے کانوں کے قریب ہی مترنم سرگوشی سنائی دی "جانی! میرے اچھے جانی!"

جانی نے کچھ گدگدی سی محسوس کی۔ چہرے پر سرسراہٹ ہوئی۔ اس کی ریشمی زلفیں اسے جگا رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ نگاہوں کے سامنے چہرے کی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے پیچھے ساری دنیا چھپ گئی تھی۔ اس کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ آہستگی سے بولی "دیر ہو رہی ہے۔ جلدی اٹھ جاؤ ورنہ ہم صحیح وقت پر ائرپورٹ نہیں پہنچ سکیں گے۔"

تب جانی جیسے نیند سے بیدار ہوا۔ تب اسے یاد آیا کہ آج فرزانہ اپنا ملک چھوڑ کر جارہی ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ادھر فرزانہ تصور میں آئی۔ ادھر رخسانہ نگاہوں کے سامنے مجسم تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر آئینے کے پاس گئی اور اپنے بالوں کو درست کرنے لگی۔ اس نے اتنا عمدہ لباس پہنا ہوا تھا کہ نگاہیں اس پر سے ہٹنا نہیں چاہتی تھیں' اور وہ بھی فرزانہ کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جارہی تھی۔ بہت اچھا کر رہی تھی۔ ویسے بھی رخسانہ ایسی مکمل ہوگئی تھی کہ اس کے سامنے وہ ساری دنیا کو بھلا سکتا تھا۔

اس نے سوچنے کے دوران رخسانہ کے پاؤں کی طرف دیکھا وہاں چھالے ختم ہو چکے تھے۔ زخم بھر گئے تھے کہیں کہیں زخموں کے نشان تھے وہ بھی مٹ رہے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھی سینڈل پہن رہی تھی۔ اس نے کہا "رخسانہ! میری بات مان لو۔ میں ائرپورٹ نہیں جاؤں گا۔"

"یہ بری بات ہے۔ میں نے فرزانہ اور اس کے میاں کو یہاں کھانے کی دعوت دینی چاہی' تم نے انکار کردیا۔ تم کتراتے کیوں ہو؟ اس سے اچانک ہی کیوں نفرت کرنے لگے ہو؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اسے اپنے گھر میں نہ بلاؤں' کھانے کی دعوت نہ دوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ نفرت کر رہا ہوں۔ میں الوداع کہنے کے لیے ائرپورٹ جاؤں تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہوگا کہ اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ تم مجھ

سے زیادہ سمجھ دار ہو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے اس سے دور رہنا چاہیے۔ میں خود یہ سمجھتا ہوں کہ میرا اس کے سامنے جانا' اس سے ملنا' اس سے باتیں کرنا بالکل بے معنی اور غیر ضروری ہے۔"

رخسانہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "چلو' میں تمہاری بات مانتی ہوں مگر مجھے ائرپورٹ تک پہنچانے تو جاؤ گے۔"

"میں تمہاری امی کے گھر پہنچا دیتا ہوں۔ تم ان کے ساتھ چلی جانا۔"

وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ لباس تبدیل کرکے رخسانہ اور بچے کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوا۔ رخسانہ نے پوچھا "رات کو جلدی آؤ گے نا؟"

"ہاں' دو چار سواریاں اٹھاؤں گا۔ اس کے بعد گھر آجاؤں گا۔"

"تم ٹھیک سوچتے ہو کہ فرزانہ کے سامنے نہیں جانا چاہیے لیکن آج وہ جارہی ہے۔ اس بات کو محسوس کرے گی۔"

"کیا اس نے ایسی کوئی بات کہی ہے؟ کیا وہ میرے متعلق کچھ کہتی ہے؟"

"اس نے کچھ کہا تو نہیں ہے لیکن میں سمجھ سکتی ہوں۔"

"ابھی وہ یہاں سے روانہ ہوجائے گی پھر تمہارے سمجھنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہے گا۔ اس بات کو ختم کرو۔"

اس نے رخسانہ اور بچے کو اس کے میکے پہنچا دیا پھر وہاں سے ٹیکسی لے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے دماغ میں یہ بات گونج رہی تھی کہ وہ چلی جائے گی۔ اپنا ملک چھوڑ دے گی۔ اپنوں کو چھوڑ دے گی۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر ایسے جارہی ہے جیسے دنیا چھوڑ کر جارہی ہو۔

دماغ میں بہت ساری باتیں گونج رہی تھیں۔ اس کا شوہر ایک زمیں دار تھا۔ اس کے چچا بھی زمیں دار تھے۔ اس کے سسرال میں بڑی خوش حالی تھی۔ سنا تھا کہ بہت دولت مند لوگ ہیں۔ فرزانہ کے لیے کراچی میں ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کرسکتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ہزاروں میل دور ملازمت کرنے جارہی تھی آخر کیوں؟

دو گھنٹے بعد وہ ائرپورٹ روڈ سے گزرتا ہوا اسٹار گیٹ کے پاس پہنچا۔ وہاں سے ائرپورٹ کا فاصلہ صرف ایک منٹ کا تھا لیکن وہ آگے بڑھ گیا۔ آگے چھوٹے گیٹ کے پاس اس نے ٹیکسی کھڑی کردی۔ اسے لاک کرکے ایک بس میں بیٹھ کر ائرپورٹ پہنچا۔ دور ہی

سے فرزانہ نظر آئی۔ وہ رخسانہ سے باتیں کر رہی تھی' اس کے آس پاس رجب علی' بیگم اور فرید احمد کھڑے تھے۔ جانی ٹیکسی اسٹینڈ کے پاس تھا۔ مختلف ٹیکسیوں کے پیچھے سے چھپتا ہوا وہاں سے ایسی جگہ جانا چاہتا تھا۔ جہاں سے وہ سب کو دیکھ سکے اور کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔

لیکن فرزانہ نے اسے دیکھ لیا۔ وہ رخسانہ سے باتیں کرتے ہوئے اپنی جگہ سے گھوم کر ائرپورٹ کی عمارت میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ اسی وقت وہ نظر آ گیا۔ ایک ٹیکسی کے پیچھے سے گزرتا ہوا دوسری طرف سے جا رہا تھا پھر لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا تھا۔

وہ سب ایک کاؤنٹر کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ بیگم فرزانہ کو دعائیں دے رہی تھیں "بیٹی! جو کچھ بھی ہوا' اسے بھول کر یہاں سے جاؤ۔ زیادہ عرصے تک باہر نہ رہو۔ تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیے۔"

فرید احمد بھی یہی سمجھا رہے تھے۔ رخسانہ بھی یہی پوچھ رہی تھی کہ آخر وہ کب تک مسز سلمیٰ قادر کے ہاں ملازمت کرتی رہے گی؟

فرزانہ نے کہا "میری رجب سے شرط لگی ہے۔ یہ کہتے ہیں میں ان کے پاس واپس آ جاؤں گی اور میں کہتی ہوں کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر میرے پاس چلے آئیں گے۔ دیکھیں' کس کی جیت ہوتی ہے۔"

رجب علی ٹکٹ اور سامان کی رسیدیں لے آیا۔ رخسانہ نے کہا "جہاز کی پرواز کے لیے بیس منٹ رہ گئے ہیں۔ پانچ دس منٹ اپنے میاں سے بھی تو باتیں کر لو۔ آیئے امی! ہم چلیں۔"

وہ سب فرزانہ کو گلے لگا کر' دعائیں دے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ وہ رجب علی کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ اس کے ساتھ چلتی ہوئی ایگزٹ کوریڈور کے پاس آئی۔ اس نے آہستگی سے کہا "جانی مجھے دیکھ رہے ہیں۔"

رجب علی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا "کہاں؟"

"ادھر ادھر نہ دیکھو۔ انجان بنے رہو۔ میں اپنا ہاتھ بڑھا رہی ہوں' تم میرا ہاتھ تھام لو۔"

اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ رجب علی نے اسے تھام لیا "فرزانہ! تم نے جو کچھ کیا اور

اب جو کچھ کرنے جا رہی ہو۔ اس کی مثال کم از کم میرے سامنے نہیں ہے۔"

"اور تم نے میرے ساتھ جو کیا اسے میں کبھی نہیں بھلاؤں گی۔"

"تم صرف جانی کو نہیں بھلا سکو گی۔"

اس کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رجب علی نے کہا "وہ کہیں چھپا ہوا دیکھ رہا ہو گا۔ یہی سمجھے گا کہ اپنے میاں سے رخصت ہوتے وقت رو رہی ہو۔ تمہارا ڈراما بہت ہی کامیابی سے جا رہا ہے۔ آنسو سچے ہیں اس کے لیے' جھوٹے ہیں میرے لیے۔"

جانی ایک طرف گم صم کھڑا ہوا تھا۔ اس نے رخسانہ اور اس کے والدین کو واپس جاتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے دیکھے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ رخصت ہونے والی رو رہی تھی' اپنے میاں کے ساتھ کوریڈور سے گزرتے ہوئے جا رہی تھی پھر اس کوریڈور کے آخری سرے پر پہنچ کر دروازے کے قریب رک گئی۔ اس نے اپنے دوپٹے کے آنچل سے آنسوؤں کو پونچھا رجب علی کو دیکھا' پھر گھوم کر' دروازہ کھول کر' اس کے دوسری طرف نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

بڑی مشکل ہے۔ آنسوؤں کی زبان نہیں ہوتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دل کا لہو کس کے لیے آنکھوں سے بہہ گیا۔

○☆○

ختم شُد